جلاوطن

(وطن عزیز میں جاری جبر واجبر پر مکمل کتاب)

سہیل احمد لون

جلاوطن

سہیل احمد لون

sohailloun@gmail.com

سہیل احمد لون کے کالموں کے انتخاب کا نام ''جلاوطن'' ہے مگر وہ ہموطنی کے دکھ کو بھی سمجھتا ہے۔اس نے ہموطنی میں جلاوطنی دیکھی ہے اور جلاوطنی میں ہموطنی کی جستجو کی ہے۔وہ جہد مسلسل کا آدمی ہے۔محنت کرنا ایک کام ہے لیکن کام کو کارنامہ محنت میں تسلسل پیدا کر کے بنایا جا سکتا ہے۔چنانچہ سہیل نے اپنی زندگی کو ایک اور زندگی بنانے میں کس قدر کامیابی حاصل کر لی ہے۔اُس نے لاتعداد ممالک میں قیام کیا ہے۔وہ جانتا ہے کہ جب وقت قیام آئے تو سجدے میں نہیں گرنا چاہیے۔وہ اپنے دل میں آرزو کی طرح چمکتے ہوئے نظام اور اپنی زمین پر نظام کے نام پر بدنظمی کو زندہ نظاموں والی دنیا کے سامنے لاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔وہ تبدیلی میں یقین محکم رکھتا ہے کہ تبدیلی آ کر رہتی ہے بلکہ آتی رہتی ہے۔بس اسے محسوس کرنے کی ضرورت ہے۔سہیل نے چاہا تھا کہ وہ لکھے اور بولے۔وہ لفظ وخیال کا ہمسفر بن کر سوچتا ہے کہ تبدیلی ضرور آئے گی۔اُس کے کالموں کی یہ کتاب اپنے اندر تبدیل ہونے کی خواہش کی طرح ہے کہ باہر تبدیلی کی کوشش اسی کیفیت سے پھوٹتی ہے۔اُسے جملہ بنانا آتا ہے، جسے یہ ہنر آتا ہے تو وہ کوئی بھی خواہش کرنے میں حق بجانب ہے۔

ڈاکٹر محمد اجمل نیازی

روزنامہ نوائے وقت

27مارچ2012ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جلا وطن

(کالموں کا مجموعہ)

سہیل احمد لون

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب	---------------	جلاوطن
مصنف	---------------	سہیل احمد لون
کمپوزنگ	---------------	محمد حامد بھٹی تحریر کمپوزنگ سنٹر۔لاہور (0321-4653160)
مطبع	---------------	
قیمت	---------------	
ناشر	---------------	

انتساب

میری ماں

کے اُن مقدس ہاتھوں کے نام جنھوں نے

مجھے پہلا لفظ لکھنا سکھایا

ترتیب

ابتدائیہ

- اکیلا یا "اک" "یلا" 3
- سبز پرچم کو سرخ جھنڈی 8
- غیر انسانی سلوک کے خاتمے کے لیے پہلا قدم اٹھانا ہوگا 14
- قومی یکجہتی کا ایک دن 20
- اہل علم ہی دنیا پر حکمرانی کرتے ہیں 26
- جیت جاتے تو کیا ہو جاتا؟ 32
- تارکین وطن کی مجبوریاں 38
- کیا ہم جھوٹ بول کر ترقی کر سکتے ہیں؟؟؟ 44
- خس کم جہاں پاک 50
- مہاجروں سے انصاروں کا حسن سلوک 56
- مزاح کے چمن میں خزاں کی آمد 62
- ایک پاکستانی جس پر ہم سب فخر کر سکتے ہیں 68
- اسامہ بن لادن کا ساتواں جنم 74
- بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ......! 79

- جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے۔۔۔جنگ کیا مسئلوں کا حل دے گی 85
- ہم خودی کو بلند کرتے رہے! 92
- سیاہ ابواب کا گمنام قبرستان 98
- سہیل لون بنام سہیل وڑائچ 104
- قانون شکن محافظوں سے کیا سلوک کیا جائے......؟ 111
- وی وی آئی پیز بگڑے 191
- رمضان المبارک 125
- امریکی امداد کے بھنور میں پھنسی پاکستانی ناؤ!!! 134
- پاکستان کے مایہ ناز شاعر پروفیسر انور مسعود کا خصوصی انٹرویو 147
- لوڈشیڈنگ کا جن کون قابو کرے گا؟ 158
- پرانے ماں باپ اور نئے اولڈ ہاؤس 164
- پاکستان کب تک موروثی سیاست کے گرداب میں پھنسا رہے گا؟ 171
- صبر اور برداشت کا دوغلا معیار 182
- جناب قائد ہم شرمندہ ہیں 188
- بصارت اور بصیرت سے محروم سیاستدان 194
- ذوالفقار مرزا۔۔۔مک مکاؤ۔۔۔مٹی پاؤ 199
- پی پی پی۔۔۔پبلک۔۔۔پولیٹیشن۔۔۔پریس 205
- ڈینگی وائرس: سرچ اور ریسرچ میں مسلسل ناکامی 211
- علیم ڈار۔۔۔پاکستان کا حقیقی فخر 217
- جدید عہد کے ایک جن کی کہانی 223
- اتفاق یا سازش؟ 230
- ہم کب تک انتہاپسندوں کے ہاتھوں ہائی جیک رہیں گے؟ 241
- پاکستان ریلوے کی تاریخ اور ریل کا سفر 248
- سیلابی دھرنے اور سیاسی ریلیاں 260
- سستی اخبار مہنگی خبر 267
- جہالت کی ''دہشت گردی'' 273
- برطانوی پولیس کا رویہ ایشیائی باشندوں کے حوالے سے انتہائی ہتک آمیز ہے 280
- سیاسی پنڈت اور ان کے اوتار 293
- نظام تعلیم انقلاب اور معلم کا مقام 300
- قومی سلامتی ''سلامت'' کیسے رہ سکتی ہے؟ 306
- موجودہ حالات کا ذمہ دار کون۔۔۔؟ 313
- فوج میں سوچ نہیں۔۔۔سیاست میں منافقت نہیں 320
- پاکستان امریکہ سے خلاصی کرائے بغیر ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکتا 337
- انتخابی مہم کا نیا انداز اور پرانے باپ 339
- سیاسی ''مرشدوں'' کا سلسلہ بیعت 346
- آج کا بچہ کل کا باپ 353

وائٹ واش نے گورے منہ کالے کر دیئے	357
ہم حیوانوں سے کیوں نہیں سیکھتے؟	363
آئی ایس آئی۔۔۔ایمان، اتحاد، تنظیم کالاثانی ادارہ	369
پی آئی اے کو ایشیاء کی پہلی ایئر لائن ہونے کا اعزاز حاصل تھا	376
اچھے کام کی نقل میں کوئی برائی نہیں۔۔۔۔۔!	389
بقائے نسلِ انسانی اور ضروریات زندگی	396
قوم کا مزاج	403

کالم نگاری: عصری شعور کا جمالیاتی اظہار

سہیل احمد لون سے دوستی میری زندگی کا ایک عجیب وغریب تجربہ ہے۔ آپ کو یہ پڑھ کر حیرت ہوگی کہ سہیل سے میری دوستی پہلے ہوئی اور بالشافہ ملاقات بعد میں۔ دن میڈیا گروپ کے ایک عزیز دوست نوید صدیقی نے انتہائی رازدارانہ انداز میں کہا کہ میں کسی سے آپ کی ملاقات کروانا چاہتا ہوں۔ میں نے ملاقاتی کے بارے میں استفسار اور ملاقات کی بابت پوچھا تو اس نے مسکرا کر کہا: "کیا آپ اجنبی لوگوں سے نہیں ملتے؟" میں نے بھی مسکراتے ہوئے عدم کا شعر

اے عدم ہوشیار لوگوں سے
لوگ منکر نکیر ہوتے ہیں

سنا کر اس کی طرف دیکھا تو اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا: "خواجہ صاحب ایسی کوئی بات نہیں" اور پھر اگلے دن خلیل نامی شخص سے میری ملاقات آفس میں ہوگئی۔ خلیل صاحب کے دوست سہیل لون لندن میں مقیم تھے اور اپنا شعری مجموعہ جس میں نثر پارے بھی موجود تھے مجھے دکھانا چاہتے تھے۔ میں نے مصروفیت کا رونا رویا لیکن آخر کار اس شرط پر کہ "آپ مجھے تنگ نہیں کریں گے" میں نے کتاب کی مکمل ذمہ داری لے لی۔ چند دنوں بعد سہیل سے فون پر بات ہوئی تو اس نے بتایا کہ "اس سے پہلے میرا ایک دیوان بمعہ طے شدہ فنشیانے کے ایک شاعر لے کر روپوش ہو چکے ہیں" میں نے باآواز بلند قہقہہ لگاتے ہوئے کہا: "سہیل صاحب ابھی دنیا سے ایماندار لوگ مکمل ناپید نہیں ہوئے" اور اس کے بعد دن گزرتے رہے اور ہماری دوستی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی۔ شاعری کے حوالے سے اُن کی کتاب کا کام میں نے ملک کے مایہ ناز شاعر جاوید قاسم کے سپرد کیا جو انہوں نے میری محبت میں بغیر کسی حیل وحجت کے قبول ومنظور کرلیا۔

سہیل کی نثر پڑھنے کے بعد مجھے یہ احساس شدت سے ہوا کہ یہ خوبصورت کشمیری النسل نوجوان لفظ کو اس کے مکمل جمالیاتی حسن سمیت جملوں میں کھپانے کا فن خوب جانتا ہے۔ روزانہ کی ٹیلی فونک گفتگو کے بعد مجھے سہیل کے عصری شعور نے بھی متاثر کیا۔ وہ انتہائی تعلیم یافتہ، ہمدرد، محبِ وطن اور رشتوں کے احترام سے مکمل واقف ہے۔ میں نے اس کی انہی خوبیوں کی بنیاد پر اسے کالم نگاری کی طرف راغب کیا۔ پہلے تو اس نے پس و پیش سے کام لیا لیکن میرے پُر زور اصرار پر آخر کار اسے ہار ماننا پڑی۔ ہمارے معاشرے کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ماں باپ اپنی ادھوری خواہشات کی تکمیل اپنے بچوں سے کروانا چاہتے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ بچہ فطرت کی ایک علیحدہ تخلیق ہے جو ایک انفرادیت کے ساتھ زمین پر بھیجا گیا ہے۔ خلیل جبران نے کہا تھا کہ "کسی بچے کو کچھ بننے پر مجبور مت کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ایک انجینئر کو موچی اور موچی کو انجینئر بنا دو"۔ کیا آج بھی ہمارے سماج کا المیہ نہیں کہ ہم بچے کو وہ بنانا چاہتے ہیں جو ہماری اپنی خواہش ہوتی ہے اور بچے سے اس کی وہ صلاحیتیں چھین لیتے ہیں جو اسے فطرت نے عطا کی ہوتی ہیں۔ سہیل بھی اسی سماج کا ایک فرد ہے جس کا تعلیمی کیریئر تو سائنسی تعلیم سے "اَٹا" پڑا ہے لیکن حقیقت میں وہ فنونِ لطیفہ کے لیے تخلیق کیا گیا تھا۔ یہ بات سہیل نے مجھے بعد میں بتائی کہ وہ صحافی یا استاد بننا چاہتا تھا لیکن انجینئر بن گیا اور پھر اس کے بعد زندگی کے کئی ماہ و سال اسے وہ مشقت کرنا پڑی جس میں اس کی کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن اللہ کے اپنے فیصلے ہیں، اچھے لوگوں کے ساتھ کبھی برا نہیں ہوتا۔ اس نے دنیا کے کئی ممالک کی خاک چھانی اور آخر کار اسی دیس میں جا پہنچا جس کے حکمرانوں نے اس کا خطہ زمین 75 لاکھ نانک شاہی کے عوض بمعہ انسانوں کے 16 مارچ 1846ء کو گلاب سنگھ ڈوگرا کے ہاتھوں فروخت کر دیا تھا۔ معاہدہ امرتسر انسانی تاریخ کا بدترین اور سیاہ ترین معاہدہ ہے کہ جس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے کہ یہ گھناؤنا فعل افریقہ کے کسی غیر مہذب قبیلے نے نہیں بلکہ دنیا میں سب سے زیادہ مہذب ہونے کے دعویداروں "تاجدارِ برطانیہ" نے سرانجام دیا ہے۔
کالم نگاری کے بارے میں صحافت کے معزز اساتذہ کی تعریفیں انتہائی قابلِ

احترام ہیں لیکن میرے نزدیک "کالم نگاری عصری شعور کا نثر کے ذریعے جمالیاتی اظہار ہے"۔ جس میں بہت سے علوم بارے آشنائی کے ساتھ ساتھ زبان سے نا صرف مکمل واقفیت بلکہ نئے الفاظ کی تخلیق کا ہنر بھی کالم نویسی کا اہم وصف ہے۔ کالم نویس سماج کے کڑوے اور کسیلے مسائل کو نا صرف حکومت اور عوام تک پہنچاتا ہے بلکہ اپنی تجزیاتی قابلیت کو بروئے کار لاتے ہوئے ان مسائل کا حل بھی پیش کرتا ہے۔ سہیل نے زندگی میں انتھک محنت کی اور "جلا وطنی" کے دکھ جھیلے۔ جلا وطن ہونے کے لیے لازمی نہیں کہ کوئی جبر کی بنیاد پر آپ کو جان سے عزیز وطن چھوڑنے پر مجبور کر دے۔ بری معیشت بھی جلا وطنی کی ایک بڑی قسم ہے۔ کون بدبخت اس مادرِ وطن کو چھوڑنا چاہے گا جو اسے ہر طرح کا انصاف فراہم کرے۔ لاکھوں پاکستانی بری معیشت کی وجہ سے ہی جلا وطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ میرے خیال کے مطابق سہیل لون نے "جلا وطن" کا لوگو اسی تناظر میں استعمال کیا ہے۔
دیس دیس کی آوارہ گردی نے اسے دنیا کے مختلف نظام حکومت اور قوموں کے رسم و رواج نزدیک سے دیکھنے کا موقع فراہم کیا ہے اور جب انسان کو اللہ نے بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت کی آنکھ اور جمالیاتی اظہار کا سلیقہ بھی عطا کیا ہو تو کیسے ممکن ہے کہ انسان لفظ اور تصور سے اپنے رشتے کا اظہار نہ کرے۔ سہیل لون کی تحریریں پرائے دیسوں کے واقعات کو اپنے وطن کے حالات سے جوڑنے اور اُن کا تجزیہ اور تقابل کرنے کی ایک کامیاب سعی ہے۔ اس کے پہلے کالم سے لے کر ابھی تک آنے والے آخری کالم تک ہر تحریر میری نظر سے گزری ہے اور میرے لیے یہ بات باعث مسرت و اطمینان ہے کہ ارتقاء کے اس عمل میں وہ براق کی رفتار سے اپنی منزلیں طے کر رہا ہے۔ یہ کتاب سہیل کے اُن کالمز اور فیچرز پر مشتمل ہے جنہوں نے بہت کم عرصہ میں بہت پرانے لکھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ میرے نزدیک تحقیق کبھی مکمل نہیں ہوتی اور تخلیق کبھی ادھوری نہیں۔ یہ تحریریں تخلیق بھی ہیں اور تحقیق بھی لیکن انسان ماں کی گود سے قبر کی گود تک سیکھنے کے عمل میں رہتا ہے اور جس شخص کی زندگی سے سیکھنے کا عمل ختم ہو جائے، اسے خود اپنی موت کا اعلان کر دینا چاہیے۔ سہیل بھی سیکھنے کے عمل میں ہے بالکل میری طرح اور میرے بہت سے سینئرز کی طرح۔

مجھے اس نوجوان سے مستقبل میں بہت سی امیدیں ہیں۔

یہ کتاب نئے لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ پرانے پڑھنے والوں کے لیے بھی عطیہ خداوندی سے کم نہیں کہ اس میں سیکھنے اور سکھانے کے لیے بہت کچھ موجود ہے۔ میں سہیل سے اس سے زیادہ کی توقع رکھتا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ وہ مجھے مایوس نہیں کرے گا کیونکہ باہمت لوگ اس سے زیادہ کر گزرتے ہیں جس کی توقع لوگ ان سے رکھتے ہیں۔ میں دُعا گو ہوں کہ سہیل زندگی بھر اپنا رشتہ قلم اور کالم سے مضبوط سے مضبوط تر کرتا رہے کہ یہی عصر حاضر کی ضرورت اور اس کا سب سے بڑا قومی فریضہ ہے۔

خواجہ جمشید امام
(کالم نگار، شاعر، ادیب، دانشور)
29-03-2012

قلم سے کالم تک

میرا حال چڑیا کے اس بچے کی طرح ہے جو ایک بار گھونسلے سے گر جائے پھر اس کا آشیانہ ہمیشہ کے لیے بدل جاتا ہے۔ میں نے صرف 15 سال کی عمر میں گھر سے سفری بیگ اٹھا کر گھر کی دہلیز سے باہر پاؤں رکھا کہ پھر جب بھی گھر آیا تو ایک مہمان کی طرح جو چند دن بعد صرف یادیں چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ میٹرک کے بعد ابھی کالج میں جانا شروع ہی کیا تھا کہ پاکستان ایرفورس میں جی ڈی پائلٹ بننے کیلئے دربدر رہا لیکن قسمت نے پائلٹ تو نہیں البتہ انجینئر ضرور بنا دیا۔ اس دور میں پاکستان میں والدین اپنے بچے کو ڈاکٹر یا انجینئر کے روپ میں دیکھ کر اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت تصور کرتے تھے۔ میں نے جب حادثاتی طور پر ایئر فورس جوائن کی تو چند دن میں ہی مجھے اس بات کا احساس ہو گیا کہ میں نے جس پیشے کا انتخاب کیا ہے وہ میرے مزاج اور فطرت سے متصادم ہے۔ زندگی بھر مجھے اپنی ذات کے لیے ایک بار ہی سفارش کا سہارا لینا پڑا جب میں نے اپنے آپ کو فوجی ہتھکڑی سے آزاد کروایا۔ میرے خیال میں ملک وقوم کی خدمت کرنے کے لیے ایسے کام کی ضرورت زیادہ ہے کہ جس کے بعد ہم کو فوج کی ضرورت کم سے کم رہے۔ میں بندوق سے نہیں قلم سے اپنے ملک وقوم کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ میری خواہش صحافی یا ٹیچر بننا تھی۔ میں بھی پاکستان کے لاکھوں طالب علموں میں سے ایک تھا جو اپنی خواہش اور اہلیت کے مطابق اپنے تعلیمی سفر پر گامزن نہ ہو سکا۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے جرنلزم، ایجوکیشن اور فارسی میں گریجوایشن بھی کی مگر صحافی یا معلم بننے کا جنون پورا کرنے کے لیے ایک عدد نوکری درکار تھی جو نہ مل سکی۔ ٹیکنیکل تعلیمی پس منظر ہونے کی وجہ سے منسٹری آف ڈیفنس پاکستان کی ڈیسٹو لیبارٹریز میں مجبوراً ملازمت اختیار کر لی مگر دل اور دماغ کی 3 سالہ سرد جنگ میں دماغ جیت گیا اور دوسری بہت سی بازیوں کی طرح دل یہ بازی بھی

ہار گیا اور میں ڈیسٹو لیبارٹریز کو بھی خیر باد کہہ کر گھر آ گیا۔ کافی قسمت آزمائی کی مگر کہیں بھی تکمیل جنون کا موقع میسر نہ آ سکا۔ اسی دوران پاکستان ریلوے میں بھی ٹیلی کمیونیکیشن انجینئر کے لیے بھی میری سلیکشن ہو گئی۔ پاکستان ریلوے کا پہیہ گھمانے میں میرے والد محترم بھی حصہ ڈالتے تھے یوں "موروثی ملازمت" کرنے پر بھی ذہن راضی نہ ہوا۔ پاک آرمی کے ایک پروجیکٹ کے لیے مجھ سمیت 32 انجینئرز کا انتخاب ہوا اور ہم کو "شاہی خرچے" پر مزید علم حاصل کرنے کیلئے چین روانہ کر دیا گیا۔ اور میری ٹیکنیکل ڈگری کو ایک اور تڑکہ لگ گیا۔ چین سے ٹریننگ کورس مکمل کرنے کے بعد ہم نے آرمی کے پراجیکٹ پر کام کرنا شروع کر دیا جہاں ہمارے ساتھ درجنوں چینی انجینئرز بھی ہوتے تھے۔ 4 سال سے زائد عرصہ تا گلے پڑا یہ ڈھول بجاتا رہا۔ اس دوران میں نے اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے ایم اے انگلش میں بھی ایڈمشن لے لیا لیکن ایم اے انگلش مکمل کرنے سے پہلے ہی میرا دانہ پانی مجھ کو دیارِ غیر (جرمنی) لے گیا۔ جہاں پر ٹیکنیکل تعلیمی پس منظر ہونے کی وجہ سے ملٹیکل انجینئرنگ میں ایڈمشن مل گیا۔ یوں اپنے جنون کو ذریعہ معاش بنانے کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ تقریباً 12 سال جرمنی میں مقیم رہا اور اس دوران اچھے اداروں میں اعلیٰ عہدوں پر کام کرنے کا موقع بھی ملا۔ شاعری اور نثر لکھنے کا شوق جرمنی میں بھی جاری رہا۔ اپنا یہ شوق میں نے اردو، پنجابی اور انگلش کے علاوہ جرمن زبان میں بھی پورا کیا۔ 4 سال قبل میں پردیس میں پھر پردیسی ہو گیا جب میں نے جرمنی سے برطانیہ نقل مکانی کر لی۔ یہاں آ کر سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مجھے 23 سال بعد اپنے ماں باپ کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ یہاں پہنچ کر میرا جنون جس پر ماہ سال کی گرد پڑ چکی تھی پھر جواں ہو گیا۔ میرے والدین عمرے کے لیے جا رہے تھے تو انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تمھارے لیے خانہ خدا میں کونسی دعا کی جائے؟ میں نے کہا کہ دعا کریں کہ میرا جنون ہی میرا ذریعہ معاش بن جائے۔ میری والدہ محترمہ نے مجھے کہا کہ بیٹا ہمت نہیں ہارتے اور کوشش جاری رکھتے ہیں اگر تم چار دہائیاں گزرنے کے بعد بھی اپنی منزل پر پہلا قدم نہیں رکھ سکے تو کیا ہوا۔ جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات بنائی ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے چالیس سال بعد نبوت عطا کی اس میں ہمارے لیے ایک پیغام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ خاص فضل ہے کہ اس دن کے بعد میری قلم ایک توانا گھوڑے کی مانند دوڑنا شروع ہو گئی۔ گزشتہ برس اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور والدین کی دعاؤں کے علاوہ چند مہربان دوستوں کے تعاون سے میرا پہلا شعری مجموعہ "خواب آنکھوں میں ٹوٹ جاتے ہیں" شائع ہوا۔ جس میں اردو، پنجابی کی شاعری کے علاوہ نثر کے چند نمونے بھی شامل تھے۔ میری اس کتاب کو منظر عام پر لانے میں میرے بہنوئی اور دوست میر تنویر جو خود بھی اچھے قلم کار ہیں اور لندن میں ہی مقیم ہیں اور پاکستان کے معروف دانشور، شاعر، کالم نویس اور صحافی جناب خواجہ جمشید امام کا بہت تعاون تھا۔ خواجہ جمشید امام بھی میری طرح کشمیری النسل ہیں۔ کتاب کے حوالے سے ان کے ساتھ چند بار فون پر بات ہوئی تو تعلق دوستی میں بدل گیا۔ انہوں نے میری نثر کی تعریف کی اور مجھے نثر لکھتے رہنے کو کہا۔ گزشتہ برس فروری میں پہلی بار عمران خان پر ایک آرٹیکل "اکیلا یا اک یلا" کے عنوان سے لکھ کر خواجہ جمشید امام صاحب کو بھیجا تو تین دن بعد مجھے ای میل موصول ہوئی جس میں میرے آرٹیکل کو روزنامہ "دن" لاہور کے ادارتی صفحہ پر شائع کیا گیا تھا۔ جس کا "لوگو" اپنی زندگی گھر اور ملک سے باہر گزارنے کی وجہ سے "جلا وطن" رکھا۔ اپنا پہلا کالم دیکھ کر میرے دل کے تار بج اٹھے ایسا لگا جیسے نغموں کی برسات ہو رہی ہو۔ خواجہ جمشید امام صاحب ان کالم نویسوں میں سے ایک ہیں جن کا قاری زیادہ تر نوجوان طبقہ ہیں۔ جب اتنے سینئر صحافی اور کالم نویس نے میرے کالم پر اپنی اچھی رائے دی تو مجھے اپنی منزل کا تعین ہوتا دکھائی دینے لگا۔ میری والدہ خود پنجابی ادب کے حوالے سے کمال ذوق کی مالکہ ہیں۔ میری خوش قسمتی یہ ہے کہ لکھ کر سب سے پہلے ماں جی کو ہی پڑھنے کے لیے دیتا ہوں جو اصلاح کرنے کے ساتھ دعا بھی کرتی ہیں اور حوصلہ بھی بڑھاتی ہیں۔ ان کی تربیت میں سچ بولنا، سچ پر قائم رہنا اور حق سچ کا ساتھ دینا بنیادی جزو ہے۔ لہٰذا اپنی بہترین عقل سے آج تک جو بھی لکھا کوشش کی کہ وہی لکھوں جس کو میں سچ سمجھتا ہوں۔ اور جیسا کہ خواجہ جمشید امام نے اپنے ایک کالم میں سچ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "سچ ہمیشہ نتائج کے حوالے سے ہوتا ہے۔ جس عمل کے نتیجہ میں خیر اور بھلائی برآمد ہو وہ سچ ہے اور جس عمل کے نتیجہ شر

اورخون ریزی ہوجائے وہ جھوٹ ہے"۔ میں سچ کی اس تعریف سے سو فیصد متفق ہوں۔ سیف و قلم میں سے میں نے قلم کو اس لیے اپنے پیشے کیلئے ہمیشہ افضل سمجھا کیونکہ قلم کے جہاد سے ہم اپنے آپ کو اتنا مضبوط کر سکتے ہیں کہ ہم کو شمشیر زنی کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ قلم کی اہمیت کا اندازہ تو اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دنیا کی سب سے معتبر اور بار بار پڑھی جانے والی کتاب قرآن پاک میں بھی اللہ تعالیٰ نے "قلم" کی قسم کھائی ہے۔ اس کا سماجی تبدیلی سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ کالم نویسی سے میں اپنا صرف شوق ہی پورا نہیں کرتا بلکہ اپنے 27 سالہ تجربے اور دربدری کو بنیاد بنا کر جس میں بہت سے ممالک میں جانے کا اتفاق بھی ہوا اپنا نقطہ نظر عوام الناس کے سامنے رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ایک سال میں میرے جتنے کالم، ایڈیشن یا بلاگ شائع ہوئے وہ ایک کتاب کی شکل میں آپ کے سامنے ہیں۔ میری تحریر کے متعلق رائے دینے کے لیے آپ میری ویب سائٹ www.sohailloun.com وزٹ کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے تنقید ہی وہ راستہ ہے جس سے قلم زور پکڑتی ہے۔ میں نے کالم لکھنا اس لیے شروع کیا کیونکہ میں اسے سماجی تبدیلی کا بہترین ذریعہ خیال کرتا ہوں۔ مجھے نثر لکھنے میں زیادہ راحت محسوس ہوتی ہے۔ کالم نویسی کو میں نثر کی اعلیٰ ترین قسم سمجھتا ہوں جس میں ہم زبان و بیان کی مکمل شناسائی کے ساتھ قاری تک اپنے خیالات پہنچا دیتے ہیں۔ موجودہ دور میں کالم نگاری قلمی جہاد کا اہم ترین ذریعہ ہے۔ حق کی اس جنگ میں اپنا کردار احسن طریق سے نبھانے کے لیے کالم نویسی کے شعبہ کو اپنایا ہے اور انشاءاللہ زندگی بھر یہ قلمی جہاد جاری رہے گا۔ میری ماں نے مجھے قلم پکڑنا سکھایا اور زمانے نے مجھے کالم لکھنا سکھا دیا میں دونوں کے سامنے ہمیشہ دوزانو رہوں گا کہ امید ہے اللہ تعالیٰ میرے زور قلم میں برکت ڈالے گا اور میرے کالموں کا دوسرا ایڈیشن جلد ہی آپ کے ہاتھ میں ہو۔ (آمین)

سہیل احمد لون

سربٹن۔ سرے

2 فروری 2012ء

محب الوطن سچا و کھرا قلم کار

سہیل احمد لون نے جرمنی سے لندن آتے ہی اپنی شاعری کا جس طرح لوہا منوایا اور اپنے پہلے شعری مجموعہ کی نہایت اعلیٰ پیمانے پر رسم اجرا کر کے لندن کے شعرا و شاعرات کے دلوں میں اپنی محبتوں کی جڑیں پیوست کیں وہ بہت کم لوگوں کے حصے میں آیا۔ پھر موصوف لندن کے اخبارات میں بطور کالم نگار اور سیاسی تجزیہ نگار کے نمودار ہوئے اور اپنی بے پناہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر یہ ثابت کیا کہ وہ محض ہجر و وصال اور گل و گلزار کی شاعری ہی نہیں کرتے انہیں عالمی سیاست کے ساتھ ساتھ اپنے وطن کے اتار چڑھاؤ اور سیاست کے آئے دن بدلتے رنگوں کی بھی خوب پہچان ہے اور وہ بڑی سچائی اور کھرے پن سے ان موضوعات کو اپنے قلم کی نوک پر رکھتے ہیں۔ انکے کالم نگاری کی پہچان ہی اپنے وطن سے سچی اور خالص محبت ہے کہ وہ کسی سیاسی جماعت یا کسی دھڑے بازی کا شکار نہ ہو اور یہ خوبی میں نے سہیل لون کے کالموں میں محسوس کی ہے۔ وہ اپنے قلبی اور ذہنی جذبات کا اظہار بڑے سلیقے اور فنی مہارت سے کرتے ہیں اپنے قلم کی حرمت کا پاس رکھتے ہوئے اپنے وطن کی محبت دل میں بسائے، کسی کی دل آزاری کے بغیر بڑی بے باکی اور بے خوفی سے تجزیہ کرتے ہیں۔ ان کے کالم لندن کے ممتاز اخبارات کی زینت بننے کے علاوہ پاکستان کے معروف اخبارات میں بھی شائع ہوتے ہیں۔ وہ اپنی نجی زندگی میں مصروف شخص ہونے کے ساتھ اپنے وطن کی محبت میں سرشار ٹی وی، اخبارات کا مطالعہ کرنے کے بعد کیسے اتنا وقت نکالتے ہیں، یہ بات بھی حیران کر دینے والی ہے۔ ان کے مختلف موضوعات پر طویل کالم پڑھ کر میں حیران ہوتا ہوں۔ مگر وہ اپنا یہ اہم اور مقدس فریضہ بڑی ذمہ داری کے ساتھ نبھائے جا رہے ہیں۔ مجھے دلی خوشی ہوئی جب انہوں نے بتایا کی وہ اپنے مطبوعہ کالموں کو

یکجا کر کے انہیں کتابی شکل دے رہے ہیں۔ان کے اس عمل سے مجھے مسرت ہوئی کہ وہ لوگ جو اخبارات میں ان کی کالم نگاری سے محروم رہے اب کتابی شکل میں ان کے کالموں سے مستفید ہو سکیں گے۔

مجھے یقین ہے کہ ان کے کالموں کا یہ مجموعہ قارئین کے لئے نہایت مفید، معلوماتی اور مشعل راہ ہوگا۔اور دعا ہے کہ اللہ ان کے قلم میں مزید برکت دے تا کہ وہ اسی طرح ملکی سیاست اور معاشرے میں پائے جانے والے نقائص کو عوام کے سامنے پیش کرتے رہیں کہ یہی ایک اچھے کلام نگار کا فرض ہے۔اللہ کرے ہو زورِ قلم اور زیادہ۔۔۔۔

امجد مرزا امجد
شاعر۔افسانہ نگار۔ادیب۔مدیر
لندن۔یو کے
12-03-2012

تخلیقی گداز کا مالک کالم نگار

سہیل احمد لون ایک نہایت خوبصورت دل رکھنے والا حسین فنکار ہے۔اللہ تعالیٰ نے اسے پیدائشی طور پر "آرٹ لور" بنایا ہے۔شاعر، کالم نگار اور کمپوزر اور پتہ نہیں کیا کیا؟ اس کا دل ہمہ وقت آرٹ کی طرف لپکتا ہے اور وہ اپنی ذات اور جذبات کے اظہار کے لیے راستے تلاش کرتا رہتا ہے۔زمانے کی کج روی اور انسانی رویوں کے انسانی نہ ہونے پر اس کا دل کڑھتا ہے تو کبھی وہ شعر کے دامن میں پناہ لیتا ہے تو کبھی کالم نگاری کے ذریعے احتجاج کرتا نظر آتا ہے۔نرم اور ملائم احساس رکھنے والا سہیل لون اپنی شاعری میں تو تخلیقی گداز کا مالک ہے ہی لیکن کالم لکھتے وقت بھی وہ نرم روی اور شائستگی کا دامن اپنے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیتا۔مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ اس کے اندر یہ تمام وصف اس کے والد کے شفاف کردار اور والدہ کی اچھی تربیت سے پیدا ہوئے۔میں اس بات پر بہت مسرور ہوں کہ مجھے اس خوبصورت انسان کا پیار حاصل ہے۔

فرحت عباس شاہ
شاعر۔ادیب۔ریڈیو ٹی۔وی پریزینٹر
سی ای او فرض فاؤنڈیشن
26فروری 2012ء

محبِ وطن، دوست کالم نگار

سہیل احمد لون سے میری دوستی اور تعلق پچھلے بارہ تیرہ سالوں پر محیط ہے۔وہ ایک حساس، دیانتدار، سچا، مخلص غمگسار دوست، رشتوں سے وفا کرنے والا اور دیارِ غیر میں رہتے ہوئے وطن سے گہری محبت اور وابستگی رکھنے والا انسان ہے......اردو ادب اور صحافت میں ابھرتا ہوا نام ہے۔ اپنی تحریروں میں انفرادیت رکھنے کی وجہ سے اس نے بہت جلد اردو صحافت میں اپنا نام منوالیا ہے۔

سہیل کے کالموں اور مضامین کا بنیادی محور وطنِ عزیز کے غریب عوام کے مسائل، ان کے حل، ملکی اداروں کی زبوں حالی، دوسرے ملکوں سے تقابلی جائزے، تجزیے ہیں۔وہ جس دلچسپ مگر کڑکتے انداز میں اپنے زندگی کے تجربات، واقعات کے حوالوں سے ایک مشکل موضوع کو اپنے دائرہ تحریر میں لاتے ہیں اس سے قاری کو مسائل کو سمجھنے اور شعور حاصل کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ان کا یہی اندازِ تحریر انہیں دوسرے کالم نگاروں سے منفرد کرتا ہے۔

میری دعا ہے کہ ربِ کریم ان کو زندگی میں مزید کامیابیاں و کامرانیاں عطا کرے۔آمین

تنویر احمد میر

لندن 4 مارچ 2012ء

سہیل لون: محسوسات کا ترجمان

میرا ماننا ہے کہ جو شخص اپنے رشتوں سے مخلص ہوتا ہے، سچا ہوتا ہے وہ انسان تو اچھا ہوتا ہی ہے، فنکار بھی بہت اچھا ہوتا ہے اور کسی بھی قلمکار میں ان خصوصیات کا ہونا بے حد ضروری ہے۔جو بھی دیکھنا، محسوس کرنا، کسی بھی بات کا، مسئلے کا کوئی بھی پہلو اس انداز سے تحریر میں سمونا کہ قاری کو خود پر نازل ہونے کا گمان گزرے۔تو میرے نزدیک ایسے قلمکار کو مبارکباد ضرور دینی چاہیے۔اسی لیے میں تہہ دل سے جناب سہیل احمد لون کو مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ان کے کالم اور آرٹیکل کو پڑھتے وقت آغاز سے اختتام تک دلچسپی کا عالم ایک سا ہی رہتا ہے۔شاعری کے مداح تو ہم پہلے ہی سے تھے اب نثر کے بھی ہو گئے ہیں......!!!میری دعا ہے کہ مزید لکھیں، خوب لکھیں......!

بہترین دعاؤں کے ساتھ

انیسہ ناصر

ریڈیو۔ٹی وی پریزینٹر

لندن۔یوکے

07 مارچ 2012ء

12مارچ 2012ء

اللہ کرے تیز فہم حسن قلم اور زیادہ

سہیل کو میں کافی عرصے سے پڑھ رہی ہوں ۔ان کے کالم بہت اثر انگیز اور شائستگی سے بھرپور ہوتے ہیں ۔اور آج مجھے بڑی مسرت ہو رہی ہے کہ ان کے کالموں کے مجموعہ کا مسودہ میرے سامنے پڑا ہے۔وہ اپنے کالم کے آئینہ میں معاشرے کا مسخ شدہ بھیانک چہرہ دکھا کر ہمیں دعوت فکر دیتے ہیں کہ کیا ہم اپنی اگلی نسلوں کو وراثت میں یہی زندگی دے کر جانا چاہتے ہیں جو کرپشن، بے ایمانی، مکر و فریب، استحصال، کاروکاری، سیاسی و مذہبی انتہاپسندی کے جبر و تشدد جیسی آلودگیوں میں ڈوبی ہوئی ہے یا معاشرے کو مزید تنزلی سے بچاتے ہوئے اس میں بہتری لانے کی کوشش کرنے کو تیار ہیں۔

سہیل کا اپنا لب و لہجہ اور طرز بیان ہے ان کی زبان سادہ اور شائستہ ہے جو بلاشبہ انہیں دوسرے لکھاریوں سے ممتاز کرتی ہے اور میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ اب ایسی زبان لکھنے والے بہت کم رہ گئے ہیں ۔ان کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ وہ جس طرح سوچتے ہیں اسی طرح لکھتے ہیں اور اسی طرح بات کرتے ہیں ۔یہ بڑا مشکل کام ہے کہ جس طرح سوچا جائے اسی طرح اظہار بھی کیا جائے ۔ان کی باتیں جس طرح مخلصانہ ہیں اسی طرح ان کا فن بھی خالص اور اثر انگیز ہے ۔میری دعا ہے کہ سہیل کی دل میں اتر جانے والی تحریریں زیادہ سے زیادہ پڑھنے کو ملیں ۔اُن کے کالموں کا یہ مجموعہ پڑھنے والوں کو بہت کچھ ایک ساتھ سوچنے پر مجبور کرے گا اور یہی اس کی کامیابی ہے۔

اللہ کرے تیز فہم حسن قلم اور زیادہ

طاہرہ ضیاء کراچی

قابل غور

☆ عمران خان کرکٹ میں ثابت کر چکا ہے کہ وہ غیر معروف کھلاڑیوں کو اٹھا کر دنوں میں سپر سٹار بنا دیتا تھا تو وہی بصارت اور پرکھنے والی آنکھ سیاسی میدان میں بھی استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔

☆ الیکشن میں ہر سیٹ پر عمران خود تو کھڑا نہیں ہو سکتا تو اس کے لیے اسے عوام کو اپنی ٹیم کا تعارف کروانا بہت ضروری ہے۔

☆ اس کے سیاسی مخالفین نے یہ تک کہہ دیا کہ عمران خان کو عوام چندہ تو دے سکتے ہیں مگر ووٹ نہیں تو عوام سے ووٹ لینے کے لیے عمران کو اپنی پارٹی مزید منظم اور وسیع کرنا پڑے گی۔

☆ اکیلا آفتاب یا مہتاب تو پوری دنیا کو منور کر سکتے ہیں مگر انسان کو کچھ کرنے کے لیے دوسرے انسانوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

اکیلایا "اک" "یلا"

عمران خان جو نہ کبھی میچ فکسنگ اور نہ اسپاٹ فکسنگ میں ملوث پایا گیا اور جس کی قائدانہ صلاحیتوں سے پاکستان 2 بار سیمی فائنل تک رسائی حاصل کرنے کے بعد تیسری بار بالآخر ورلڈ چیمپئن بن گیا۔شوکت خانم ہسپتال لاہور اور نمل یونیورسٹی میانوالی اس کے پکے ارادوں اور بلند حوصلوں کا ثبوت ہیں اور ان کو جس خوش اسلوبی سے چلایا جا رہا ہے اس سے عمران خان کے انتظامی امور میں عبور سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ موجودہ دور میں وہ واحد لیڈر ہے جو ہر ایک کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا ہے حتیٰ کہ بیوروکریسی اور امریکہ تک کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔یہ اس کے نڈر، دیانتدار اور سچا محب الوطن ہونے کی دلیل ہے۔

کرکٹ کے میدان میں کامیابیاں سمیٹنے والا قسمت کا دھنی کپتان جب سیاست کا میچ کھیلنے آیا تو بیچارے کی ایک باری آئی جس میں اسے کھاتہ کھولنے سے پہلے ہی متنازعہ ایل بی ڈبلیو قرار دے کر پھر سے فیلڈنگ پہ لگا دیا گیا اور آج تک تھکا دینے والا طویل باؤلنگ اسپل کروا رہا ہے۔مگر کیا کرے ایک تو وکٹ ڈیڈ ہے اور دوسرا باری لینے والے "ڈھیٹ"......!

مشرف کے آؤٹ ہونے کے بعد سوچا کہ آنے والے نئے بیٹسمینوں کے لیے شاید ریورس سوئنگ کارگر ثابت ہو کیونکہ سیاسی گیند عمران خان کے ہاتھ میں اب 15 سال پرانی ہو چکی ہے۔مگر نئے باری لینے والے اتنے شریر نکلے کہ انہوں نے سارے فیلڈرز کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا اور اب پانچ سالہ ٹیسٹ ڈرا کھیلنے کی کامیاب منصوبہ بندی سے کھیلتے جا رہے ہیں۔بڑا شور مچا کہ عمران خان نے نیوٹرل امپائرنگ کے لیے آزاد عدلیہ بحال کروائی مگر شفاف الیکشن کمیشن بورڈ کا مطالبہ جوں کا توں ہے۔جیسے پی سی بی

کو آئی سی سی چلا رہا ہے اسی طرح الیکشن کمیشن بورڈ کی ڈور پتا کون کے ہاتھ میں ہے۔ جو جس کی چاہے ٹرن اور ٹرم فکس کرتا ہے اور ان کی فکسنگ میں ملوث کسی کو معطل نہیں کیا گیا۔چاہے ان کے پیچھے دی ورلڈ نیوز ہو یا وکی لیکس ......

پتا کون آئی سی سی کی طرح اتنا ظالم نہیں کہ اپنے پیاروں کو پانچ، سات یا دس سال کی سزا سنا دے بلکہ ان کو بڑے عیش و عشرت اور ٹھاٹھ سے لندن یا جدہ رکھا جاتا ہے اور پھر بڑی شان و شوکت سے دوبارہ بلکہ تی بارہ کھیلنے کے لیے واپس بلا لیا جاتا ہے۔سیاسی ٹیموں کو دیکھیں تو ہر ٹیم کا ایک کپتان اور ہر کپتان کی سپر سٹاروں سے بھری ٹیم ہے مگر عمران خان کو دیکھیں تو ٹیم عمران سے شروع ہو کر خان پہ ختم ہو جاتی ہے۔ عمران خان کرکٹ میں ثابت کر چکا ہے کہ وہ غیر معروف کھلاڑیوں کو اٹھا کر دنوں میں سپر سٹار بنا دیتا تھا اب وہی بصارت اور پرکھنے والی آنکھ سیاسی میدان میں بھی استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔اپنی ذہانت اور بصارت سے سیاسی میدان میں بھی میانداد کی طرح شاطر۔اعجاز احمد اور شعیب محمد کی طرح پھرتیلے فیلڈرز، سلیم یوسف کی طرح ٹائیگر، قادر کی طرح جدید گگلی کے موجد، وسیم، وقار اور عاقب کی طرح تیز سوئنگ باؤلرز، رمیض اور سعید انور کی طرح اننگز کا پراعتماد آغاز کرنے والے اوپنرز کی طرز کے سیاسی کھلاڑی اپنی سیاسی ٹیم میں شامل کرنے کی ضرورت ہے جو عمران خان کے ساتھ مل کر ان کرپٹ لیڈروں کی باری کا خاتمہ کر کے ان کو ہمیشہ کے لیے پویلین بھیج دیں۔ جو اقتصادی، معاشرتی، سماجی، عمرانی، خارجی، داخلی، دفاعی، دینی، قانونی اور انتظامی امور سے واقف ہوں جو عمران خان کی طرح اصلی ڈگری والے تعلیم یافتہ ہوں اور سب سے بڑھ کر مخلص، دیانتدار اور سچے پاکستانی ہوں کیونکہ ابھی تک لوگوں کو یہ پتہ نہیں چل سکا کہ عمران خان کی نمائندگی کون کر رہے ہیں اور کوئی تبدیلی یا انقلاب اس وقت تک ممکن نہیں جب تک عمران خان اپنے ساتھ چند ایسے افراد عوام میں روشناس نہیں کروا لیتے جن پہ عوام بھی اعتماد کرتی ہو کیونکہ الیکشن میں ہر سیٹ پر عمران خود تو کھڑا نہیں ہو سکتا تو اس کے لیے اسے عوام کو اپنی ٹیم کا تعارف کروانا بہت ضروری ہے۔

عمران کی دیانتداری پر عوام نے ہمیشہ ہی بھرپور اعتماد کا اظہار کیا ہے اور انہوں نے اس کا ثبوت حالیہ سیلاب زدگان کے لیے دل کھول کر چندہ دے کر کیا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے سیاسی مخالفین نے یہ تک کہہ دیا کہ عمران خان کو عوام چندہ تو دے سکتے ہیں مگر ووٹ نہیں تو عوام سے ووٹ لینے کے لیے عمران کو اپنی پارٹی مزید منظم اور وسیع کرنا پڑے گی۔ آج کے دور میں سب سے مشکل کام کسی کی جیب سے پیسہ نکلوانا ہے اور وہ بھی بغیر کسی لالچ کے۔ اگر عمران خان عوام کی جیب سے پیسہ نکلوا سکتا ہے تو اسی عوام سے ووٹ کیوں نہیں لے سکتا۔ کمال کی بات یہ ہے کہ پیسہ بھی مڈل کلاس اور لوئر مڈل کلاس نے ہی دیا ہے اور وہی حقیقی طاقت اور اصل اکثریت ہیں۔ بس جب ووٹ دینے کی بات آتی ہے تو عوام کو عمران خان کے نمائندوں اور جانشینوں میں عمران والی بات نظر نہیں آتی۔ اس معاملے میں اگر ایم کیو ایم والا فارمولا بھی آزمانا پڑے تو کوئی حرج نہیں۔ یعنی مڈل اور لوئر مڈل کلاس سے تعلیم یافتہ مگر باکردار افراد کی ٹیم تشکیل دی جائے۔ کم از کم ہر بڑے شہر میں ایک یا دو نمائندے تو ایسے ہوں جو عوام کے دل کی آواز ہوں۔ اکیلا آفتاب یا مہتاب تو پوری دنیا کو منور کر سکتے ہیں مگر انسان کو کچھ کرنے کے لیے دوسرے انسانوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

مگر...... عمران خان جتنا بھی بہادر، بے باک، نڈر، دیانتدار، انتظامی امور کا ماہر، تعلیم یافتہ، دور اندیش اور محب الوطن سچا پاکستانی ہے جب تک وہ اکیلا ہے۔ "اک" "یلا" ہے۔

روزنامہ "دن" لاہور 22 فروری 2011ء

یو۔کے ٹائم لندن 24 مارچ 2011ء

❁.....❁.....❁

3

قابل غور

☆ مکمل بیداری کے لیے جس قیادت کی ضرورت ہوتی ہے گہری نیند سے بیدار ہونے والے ابھی اسے تلاش کر رہے ہیں۔

☆ اگر 313 مضبوط ایمان والے ہزاروں کے لشکر پر قابو پا

کر مکہ فتح کر سکتے ہیں تو کیا 17 کروڑ میں کیا 313 بھی مضبوط کردار اور ایمان والے نہیں جو اس ملک کو مزید ٹکڑے ہونے سے بچائیں اور اس کو صحیح سمت میں ڈال کر خوشحالی کی شاہراہ پر گامزن کریں۔

☆ جو ذات پات، رنگ نسل، زبان، فرقہ، دولت، شہرت سب کو بالائے طاق رکھ کہ صرف اور صرف مخلص پاکستانی بن کر سوچیں تو ہم صرف ایٹمی طاقت نہیں رہیں گے بلکہ قوم کا ہر فرد ایٹم بم ہوگا۔

سبز پرچم کو سرخ جھنڈی

رنگوں کی فلسفیانہ تشریح میں سبز رنگ خوشحالی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ساری دنیا میں سبز اشارے کو مثبت علامت کے طور پر تصور کیا جاتا ہے لہذا یہ ایک فطری عمل ہے کہ ہم جہاں کہیں بھی جائیں اگر گرین سگنل یا گرین لائٹ ہمارا استقبال کرے تو ایک پرسکون احساس ہمیں اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔ہم پاکستانی بڑے خوش قسمت ہیں کہ ہمارا پاسپورٹ بھی سبز ہے اور پرچم بھی۔ جسے ہم بڑے فخر سے لہراتے اور اس کو سربلند کرنے میں اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔اللہ تعالیٰ نے ہماری دھرتی کو ہر نعمت سے مالا مال کر رکھا ہے۔یہ خداوند پاک کا خاص عطیہ ہے کہ ہمارے خطے میں چاروں موسم، زرخیز زمین، گرم سمندر، بلند و بالا پہاڑ، صحرا، لذیذ پھل، خوشبودار پھول، مزیدار سبزیاں، معدنیات، گیس، وادیاں، انواع و اقسام کا مویشی، جنگل، میٹھا پانی اور بہت سی نعمتیں جن کا ہم شمار نہیں کر سکتے۔مختصراً کہ اس خطے کو اللہ تعالیٰ نے سبز روشنی سے منور کر رکھا ہے جس کا اصل منبع وہ سبز گنبد ہے جس سے کائنات کے تمام علم و حکمت کے خزانے پھوٹ کر تشنہ ذہنوں کو سیراب کرتے ہیں۔جس سے مشرق و مغرب مستفید ہوئے اور ہو رہے ہیں۔لیکن ہمارے نامہ اعمال نے اس سرزمین کی ہریالی، اس کی سبز روشنی کو پیلی روشنی میں بدل دیا ہے اور فنِ تصویر گری کے ماہر جانتے ہیں کہ پیلا رنگ بیماری کی علامت ہوتا ہے۔یہ سبز روشنی اب پیلی لائٹ میں تبدیل ہو گئی ہے جو کہ اکثر سرخ لائٹ سے قبل ایک وارننگ لائٹ کے طور پر نمودار ہوتی ہے۔ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اعمال سے خوش نہیں اور ہمیں آئے دن قدرتی آفات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔جو کبھی سیلاب، زلزلے، ڈینگی، ہیپاٹائٹس یا قحط و خشک سالی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔یہ ایک قسم کی وارننگ لائٹ ہے اور اللہ تعالیٰ ہم کو خبردار کر رہا ہے کہ ہم

اپنے اعمال درست کرلیں ورنہ اللہ تعالیٰ نے اگر ہم کو ریڈ لائٹ دکھائی تو ہم دنیا میں تاریخ بن کر رہ جائیں گے اور ہمارا نام تو ہوگا مگر نشان باقی نہیں رہے گا۔ جس کی نشاندہی علامہ اقبالؒ بہت پہلے کر چکے ہیں کہ ”تمہاری داستاں بھی نہ ہوگی داستانوں میں“

ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ہم اپنا سبز پاسپورٹ دنیا کے کسی خطے میں بھی دکھائیں تو ایک ریڈ لائٹ خود بخود آن ہو جاتی ہے؟ ہمارے سبز پرچم اور سبز پاسپورٹ کو دیکھ کر سبز جھنڈی کیوں نہیں لہرائی جاتی؟

کہنے کو تو ہم مسلمان ہیں اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کے مہذب شہری ہونے کے دعویدار بھی! ویسے تو ہمارے پاس ہدایت کا سرچشمہ ہے ”قرآن پاک“ اور ”حیات طیبہؐ اس پر عمل کا کامل نمونہ...... تو پھر ہم اتنے منتشر اور بے مقصد کیوں ہیں؟ اسلام کا معنی ہی امن و سلامتی ہے تو پھر دہشتگری کو عروج کیوں؟ ہم کیوں تیسری دنیا میں رہ رہے ہیں؟ کیوں ہم کٹھ پتلی بنے ہیں، جس کی ڈور امریکہ کے ہاتھ میں ہے۔ کیوں ہم آج تک آزاد ملک میں رہ کر بھی محکوم ہیں؟ کیوں ہم آج بھی بنیادی ضروریات زندگی کی کو ترس رہے ہیں؟ کیوں ہر چوتھا بندہ شوگر کی بیماری میں مبتلا ہے حالانکہ چائے کی پیالی میں ڈالنے کو شوگر میسر نہیں؟ کیونکہ بندوق کی گولی دوا کی گولی سے سستی ہے؟ کیوں ہماری لیڈر شپ حکمرانی تو کرنا چاہتی ہے مگر خدمت کرنے کے لیے تیار نہیں؟ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں اپنے لیڈروں کی طرف سے بھی گرین سگنل نہیں مل رہا۔ یہی اضطرابی اور تذبذب کی حالت ہم کو تباہی کے دہانے کی طرف دھکیلتی جا رہی ہے اور یہ اک ”انقلاب“ کا پیش خیمہ بھی ہے۔

انقلاب کی بھی ہمیشہ سے چند وجوہات رہی ہیں۔ جب سیاسی، سماجی، تعلیمی، معاشی، سیکورٹی، ہیلتھ اینڈ سیفٹی کی قدریں عوام الناس کو مطمئن نہ کریں۔ جب عوام کو طبقاتی درجہ بندی میں تقسیم کر کے ان سے امتیازی سلوک کیا جائے تو ان برائیوں کو جڑ سے اکھاڑنے کا حل صرف انقلاب سے ہی ممکن ہوتا ہے۔

یہ قدرتی امر ہے کہ ہر مسئلے کا حل موجود ہوتا ہے اور ہمیشہ مثبت سوچ کے ساتھ

میدان میں اترنا چاہئے۔ میرے خیال میں اکیسویں صدی میں ہمارے لوگ بیدار تو ہو چکے ہیں لیکن ابھی انہیں مکمل بیداری میں کچھ وقت لگے گا کیونکہ مکمل بیداری کے لیے جس قیادت کی ضرورت ہوتی ہے۔ گہری نیند سے بیدار ہونے والے ابھی اسے تلاش کر رہے ہیں لیکن یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں کے عوام ایسے مواقعوں پر بھی غلط فیصلے نہیں کیا کرتی۔ اس وقت جناح اور گاندھی جیسے لیڈروں کی ضرورت ہے جنھوں نے اپنا ہر سانس ملک وقوم کی خاطر قربان کر دیا۔ جو آج کی لیڈر شپ کی طرح مادیت پرست نہ تھے بلکہ قومی مفادات کو اپنی ذات پر ہمیشہ ترجیح دیتے تھے۔ ان کا ملک وقوم سے اس قدر لگن، جذبہ، محبت، پیار اور قربانی ان کی صحت سے ہی ظاہر ہے۔ آج کی لیڈر شپ کو دیکھیں تو ان کی صحت اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو ملک وقوم کا کوئی فکر نہیں۔

یہ سب مل کر ہمارے ملک کے Sources اور Resources سے کھیل رہے ہیں۔ ہمارے پاس جذبہ، ٹیلنٹ، ولولہ اور جوش ہے مگر پھر بھی ہم اپنے نوجوانوں کو ضائع کر رہے ہیں۔ کیوں؟ آخر کیوں؟ صرف اور صرف گریٹ لیڈر شپ کی وجہ سے! اس وقت حالات خطرے کے نشان کو کراس کر رہے ہیں اور عزت اور وقار بحال کرنے کے لیے مکمل تبدیلی کی ضرورت ہے۔ ہم میں سے جس کسی میں بھی یہ قابلیت ہے وہ بگل بجائے اور لوگوں کو خبردار کرے کہ وہ اپنے حقوق کے لیے میدان عمل میں اتریں۔

تاریخ گواہ ہے کہ فرانس، روس اور چین میں جب انقلاب آیا تو اس کی کیا وجوہات تھیں اور کیا محرکات تھے۔ ان میں بھی طبقاتی درجہ بندی، ناانصافی، معاشی پستی، کرپشن، آبادی میں اضافہ وغیرہ انقلاب کو دعوت دینے کے سبب بنے۔ مگر آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اس میں بہت سے ایسے محرکات اور عوامل بھی ہیں جو اس وقت نہ تھے۔ مثلاً دہشت گردی، خودکش حملے، خودکشی، اجتماعی زیادتی، ڈرون حملے، اپنے بچے سڑکوں پر پھل سبزی کی طرح بیچنا، ٹارگٹ کلنگ، لوڈشیڈنگ، انفرادی سوچ کا اجتماعی سوچ پہ غلبہ، مذہب کے نام پر بدامنی، اقربہ پروری وغیرہ شاید فرانس، روس اور چین کو میسر نہ تھی۔

اگر 313 مضبوط ایمان والے ہزاروں کے لشکر پر قابو پا سکتے ہیں تو کیا 17

کروڑ میں 313 بھی مضبوط کردار اور ایمان والے نہیں جو اس ملک کو مزید ٹکڑے ہونے سے بچائیں اور اس کو صحیح سمت میں ڈال کر خوشحالی کی شاہراہ پر گامزن کریں۔ جذبہ ایمانی سچا ہو تو آج کے دور میں بھی معجزے ہو سکتے ہیں۔ ایم ایم عالم 58 سیکنڈ میں اگر F86 سے 5 انڈین فائٹرز کو زمین پر گرا سکتا ہے جو آج بھی ورلڈ ریکارڈ ہے۔ تو اس طرح کے کرشمے آئندہ بھی ہو سکتے ہیں بشرطیکہ ہم اپنے گناہوں کی معافی مانگ کر سچے دل سے توبہ کریں تو یہ اب بھی ممکن ہے کہ ہم بہت جلد دنیا میں ایک نام پیدا کریں۔

اگر آج بھی 117 ملین لوگوں میں سے 313 مضبوط ایمان والے محبّ الوطن، دیانتدار، نڈر، سچے اور کھرے، اصلی ڈگریوں والے تعلیم یافتہ، باکردار، انسانیت کے محسن، وفا کے علمبردار لوگ، ملک کے ہر شعبہ کے سربراہ بن جائیں۔ تو 117 ملین لوگوں کو قوم میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ جو ذات پات، رنگ نسل، زبان، فرقہ، دولت، شہرت سب کو بالائے طاق رکھ کہ صرف اور صرف مخلص پاکستانی بن کر سوچیں تو ہم صرف ایٹمی طاقت نہیں رہیں گے بلکہ قوم کا ہر فرد ایٹم بم ہو گا۔ تو پھر نہ کوئی عافیہ ملک سے اٹھانے کی جرات کرے گا اور نہ کوئی ریمنڈ ڈیوس استثناء مانگے گا۔ پھر ہمارے گرین پاسپورٹ اور سبز پرچم کو ہر طرف سے گرین سگنل اور ہری جھنڈی ہی نظر آئے گی۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالی اس قوم کی حالت نہیں بدلتا جو اپنی حالت خود نہ بدلے اور جیسی قوم ہو اللہ تعالی ویسے ہی حکمران مسلط کر دیتا ہے۔

بس اس سے قبل کہ اللہ تعالی ہم کو سرخ جھنڈی دکھائے ہم تائب ہوں اپنے اعمال درست کر کے مخلص اور دیانتدار لیڈر کے ہاتھ ملک کی باگ ڈور دیں تاکہ ساری دنیا میں اس سبز پاسپورٹ اور سبز ہلالی پرچم کو سبز سگنل ہی ملے۔

روزنامہ "دن" لاہور 8 مارچ 2011ء

یو۔کے ٹائم لندن 17 مارچ 2011ء

6

قابل غور

☆ منزل کی طرف اٹھنے والا پہلا قدم اپنے اندر ان گنت جذبات، احساسات، رعنائیاں، جوش اور ولولے سموئے ہوتا ہے۔

☆ آج جو انسانی حقوق کے نام نہاد علمبردار بنے بیٹھے ہیں اگر ان کی تاریخ دیکھیں تو ان کے انسان ہونے پر شرمندگی محسوس ہونا شروع ہوجاتی ہے۔

☆ اس وقت کسی سیاہ فام کو اس کی نشست سے اٹھا دینا تا کہ وہاں سفید فام بیٹھ سکے امریکہ میں قانونی حیثیت رکھتا تھا۔

☆ منزل کی طرف اٹھنے والا پہلا قدم اپنے اندر ان گنت جذبات، احساسات، رعنائیاں، جوش اور ولولے سموئے ہوتا ہے۔

☆ آج جو انسانی حقوق کے نام نہاد علمبردار بنے بیٹھے ہیں اگر ان کی تاریخ دیکھیں تو ان کے انسان ہونے پر شرمندگی محسوس ہونا شروع ہوجاتی ہے۔

☆ اس وقت کسی سیاہ فام کو اس کی نشست سے اٹھا دینا تا کہ وہاں سفید فام بیٹھ سکے امریکہ میں قانونی حیثیت رکھتا تھا۔

❁-----❁-----❁

غیر انسانی سلوک کے خاتمے کے لیے
پہلا قدم اٹھانا ہوگا

کسی بھی منزل کی جانب پہلے قدم کی عظمت سے انکار ممکن نہیں۔منزل کی طرف اٹھنے والا پہلا قدم اپنے اندر ان گنت جذبات، احساسات، رعنائیاں، جوش اور ولولے سموئے ہوتا ہے۔سو اس کی کٹھن مسافت بھی کسی تھکان کے احساس کے بغیر سفر طے کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔یہ بات مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی بھی بڑے مقصد کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے پہلا قدم تو اٹھانا ہی پڑتا ہے۔اس میں اکثر بے شمار تکالیف، مصائب اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور حوصلے، جرأت، بہادری، قائدانہ صلاحیت، خلوص نیت اور نیک ارادوں کو دیکھ کر خدا تعالیٰ اس میں ایسی برکت اور طاقت ڈالتا ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے پہلا قدم اٹھانے والے کے پیچھے سر پھروں کا ایک لشکر تیار ہو جاتا ہے اور وہی شخص قوم کا حقیقی رہنما بن کر ان کے حقوق کی آزادی کی جنگ لڑ کر نئی تاریخ رقم کر دیتا ہے۔جس کے بعد عبرت کے لیے ظالموں کا نام رہ جاتا ہے مگر نشان مٹ جاتا ہے۔

آج جو انسانی حقوق کے نام نہاد علمبردار بنے بیٹھے ہیں اگر ان کی تاریخ دیکھیں تو ان کے انسان ہونے پر شرمندگی محسوس ہونا شروع ہوجاتی ہے۔بات زیادہ پرانی نہیں یکم دسمبر 1955ء کی ایک یخ بستہ شام جب امریکہ میں ایک سیاہ فام افریقی خاتون "روزا پارکس" دن بھر کی محنت مشقت کر کے اپنا ہینڈ بیگ مضبوطی سے سینے سے چمٹائے اور اس کی گرمی کا احساس پا کر بس سٹاپ کی طرف تیزی سے جا رہی تھی۔10 منٹ کے انتظار کے بعد بالآخر بس سٹاپ پر رکی اور وہ اس میں سوار ہوگئی۔کافی نشستیں خالی تھیں وہ کھڑکی کے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گئی۔اس وقت کسی سیاہ فام کو اس کی

نشست سے اٹھا دیتا تا کہ وہاں سفید فام بیٹھ سکے امریکہ میں قانونی حیثیت رکھتا تھا۔ امریکی قانون سیاہ فاموں کو سختی سے روکتا تھا کہ اگر کوئی سفید فام کھڑا ہے تو وہ بیٹھنے کے مجاز نہیں۔ یہ قانون ہر سیاہ فام پر لاگو تھا چاہے وہ بوڑھا ہو، بچہ ہو، بیمار یا صنف نازک! اگر کوئی سیاہ فام بزرگ مرد یا عورت کسی نوجوان سفید فام کے کھڑے ہونے کی صورت میں بیٹھے پائے جاتے تو ان بزرگوں پر بھاری جرمانہ عائد کر دیا جاتا۔ یہ بات صرف بسوں تک محدود نہ تھی بلکہ اس وقت ہوٹلوں، ریستورانوں کے دروازوں پر تختی آویزاں ہوتی تھی کہ یہاں بلیوں، کتوں اور سیاہ فاموں کا داخلہ منع ہے۔ نسل پرستی کا یہ رویہ روزا پارکس کو افسردہ کئے رکھتا تھا۔

وہ ہمیشہ سوچتی تھی کہ کب تک ہم سیاہ فاموں کے ساتھ یہ کمتر، غیر انسانی اور امتیازی سلوک جاری رہے گا؟ کب تک سیاہ فاموں کو قطاروں میں آخر میں رکھا جائے گا؟ مگر سفید فاموں کے جانوروں کو بھی ان سے بہتر سلوک اور حقوق میسر تھے۔ وہ انہیں سوچوں میں غرقاب تھی کہ بس کی نشستیں آہستہ آہستہ پُر ہو گئیں۔ اگلے سٹاپ سے نوجوان سفید فام بس میں سوار ہوا اور پارکس کے پاس کھڑا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ اس انتظار میں تھا کہ روزا پارکس اس کے لیے نشست خالی کرے گی مگر پارکس نے اس دن تاریخ بدلنے کا فیصلہ کر رکھا تھا اور اس سفید فام کے کہنے پر بھی نشست خالی نہ کی۔ سفید فام کے چہرے پر توہین کا احساس نمایاں تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بس میں سوار مسافروں کا رویہ جارحانہ ہو گیا اور نوبت گالی گلوچ تک پہنچا گئی۔ ہر کوئی روزا پارکس کو نشست خالی کرنے کو کہہ رہا تھا مگر روز وہ اپنے موقف پر ڈٹی رہی۔ حتیٰ کہ بس کا ڈرائیور سیاہ فام عورت کی اس قانون شکنی کی جرأت اور ایک سفید فام کی توہین پر خاموش نہ رہ سکا اور بس کو پولیس سٹیشن لے گیا تا کہ ایک سفید فام کے آگے سر اٹھانے کی پاداش میں ایک سیاہ فام کو عبرت کا نشان بنایا جا سکے۔ تھانے میں پارکس کو گرفتار کرنے کے بعد "جرم" ثابت ہونے پر اسے 15 ڈالر کا جرمانہ کیا گیا۔ تا کہ یہ سزا دوسرے سیاہ فاموں کے لیے ایک مثال اور عبرت کا نشان بن سکے اور آئندہ کوئی سیاہ فام کسی سفید فام کی

توہین کا مرتکب ہونے کی جرأت نہ کرے مگر روزا پارکس کا یہ جرأت مندانہ "پہلا قدم" امریکہ کی سرزمین پر سوکھے تنکوں پر چنگاری کا کام کر گیا جس کے بعد حقوق کے مطالبے کی آگ نے سارے امریکہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ تمام سیاہ فام روزا پارکس کے ساتھ پیش آنے والے اس ناروا اور امتیازی سلوک پر متحد ہو گئے۔ جس نے تحریک کی شکل اختیار کر لی کہ سب سیاہ فام نقل و حمل کے تمام ذرائع کا اس وقت تک بائیکاٹ کریں گے جب تک امریکی حکومت ان کو تمام انسانی حقوق سفید فاموں کے مساوی دینے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ یہ تاریخی بائیکاٹ 381 دن تک جاری رہا، بالآخر "سفید گھر" کے مکین سیاہ جدوجہد کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ یقیناً براک اوبامہ آج بھی وائٹ ہاؤس میں بیٹھا دل ہی دل میں اس بہادر عورت کی عظمت کو سلام ضرور کرتا ہوگا۔ ورنہ وہ بھی آج کسی بس میں کھڑا سفر کر رہا ہوتا اور سفید فام اس کو حقارت سے دیکھ رہے ہوتے۔ سفید گھر کے سیاہ مکین کو ہمیشہ اُس سیاہ فام عورت کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔

4 فروری 1913ء کو پیدا ہونے والی یہ افریقی سیاہ فام خاتون تاریخ میں اپنا نام لکھوا کر 24 اکتوبر 2005ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملی لیکن زندگی میں وہ ایسا کارنامہ کر گئی کہ اس پر کتابیں لکھی گئیں، تمغوں، ایوارڈوں سے نوازا گیا۔ اس بہادر خاتون کو خراج تحسین پیش کرنے ہزاروں سوگواروں میں کئی ممالک کے سربراہان مملکت نے بھی شرکت کی اور اس دن امریکہ کا جھنڈا سرنگوں رکھا گیا اور اس کی آخری رسومات پورے قومی اعزازات کے ساتھ ادا کی گئیں جو سربراہان مملکت یا اہم ترین شخصیت کو نصیب ہوتی ہے۔ روزا پارکس کے لیے ان تمام ایوارڈوں، اعزازوں اور تمغوں سے بڑھ کر اس کا وہ "پہلا قدم" تھا جو اس نے ظلم کے خلاف اٹھایا جس کے بعد یہ نعرہ جو آج بھی ہم اکثر سنتے ہیں کہ قدم بڑھاؤ۔۔۔۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں، ایک انقلابی صورت میں نظر آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے قدم سے قدم ملا کر چلنے والوں کی تعداد بڑھتی گئی اور بالآخر اس کا "پہلا قدم" تاریخ کا ایک حصہ بن گیا۔

اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ امریکہ میں رہ کر انہوں نے ظلم کے آگے سر اٹھایا

اور وقت ایسا آیا کہ غلامی کے مارے سیاہ فاموں نے اپنا مقدر خود لکھ لیا۔ ہم تو امریکہ میں بھی نہیں رہتے اگر امریکہ میں بسنے والے سیاہ فام شہریوں نے ان کو چوہدری ماننے سے انکار کر دیا تھا تو ہم آزاد ریاست کے آزاد شہری ہیں، تو پھر ہم سے وہی سیاہ فاموں والا امتیازی سلوک کیوں ہو رہا ہے؟

جب تک ملک میں طبقاتی نظام جڑ سے ختم نہیں ہو جاتا، امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی تو بڑے ترقی یافتہ ہیں۔ ہمارے ساتھ تو بھارت، بنگلہ دیش اور دیگر ترقی پذیر ممالک بھی حسن سلوک میں ڈنڈی ماریں گے۔ ہر پاکستانی لیڈر اپنی پارٹی کا جھنڈا پاکستانی پرچم سے زیادہ استعمال کرتا ہے اور ان کے چمچے اور لوٹے قائداعظم سے زیادہ ان کرپٹ لیڈروں کی تصاویر اپنی پارٹی، دفاتر اور اجلاسوں میں آویزاں کرتے ہیں۔ اس سے نہ جانے وہ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟

ان گھمبیر حالات میں بچنے کی ایک ہی صورت نظر آتی ہے کہ "روزا پارکس" کی طرح جرأت مندانہ پہلا قدم اٹھائے اور اس غیر انسانی امتیازی سلوک کے خلاف اٹھ کھڑا ہو جو تمام تعصبات سے بالاتر ہو کر صرف پاکستانی بن کر سوچے۔ موجودہ حالات میں جو شخص پاکستان کے لیے پہلا قدم اٹھائے گا قوم اُس کے ساتھ ہو گی۔ ایک انقلاب کو ترسی یہ قوم پے در پے انقلابات دیکھے گی۔ مگر پہلا قدم کون اٹھائے گا؟

روزنامہ "دن" لاہور 22 مارچ 2011ء

دی نیشن لندن 25 مارچ 2011ء

قابلِ غور

☆ کسی بھی معاشرے میں جب لوگ تعصبات سے عاری ہو کر ایک پرچم تلے متحد ہو کر اپنے قائد کی آواز پر لبیک کہتے ہیں تو ہجوم سے ناقابلِ تسخیر قوم بن جاتے ہے۔

☆ مگر موجودہ دور کے انسانی حقوق کے علمبردار کو وہ تاریخی

اتحاد ہضم نہ ہو سکا اور اس کانفرنس کے وہ خاص متحرک قائدین جو براہ راست یا بالواسطہ اس میں شامل تھے یکے بعد دیگرے بڑے شاطرانہ طریقے سے صفحۂ ہستی سے مٹا دیئے گئے۔

- ☆ بیچارہ کرنل قذافی اکیلا ہی میدان میں رہ گیا جو اس اسلامی کانفرنس کا ایک اہم اور سرگرم رکن تھا اور جس کی اب باری آ گئی ہے۔

- ☆ اگر یہ سلسلہ جلد نہ روکا گیا تو افغانستان، عراق، لیبیا کے بعد ایران اور پاکستان کی باری بھی زیادہ دور نہیں۔

- ☆ اب ایسے قائد کی ضرورت ہے جو صرف پاکستانی بن کر سوچے اور ملک میں استحکام اور پرامن فضا لانے کے لیے صوبوں، زبانوں، نسلوں، فرقوں، مذہبوں اور طبقوں کی سیاست نہ کرے۔

❁-----❁-----❁

قومی یکجہتی کا ایک دن

کسی بھی غیر معمولی کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے دوسرے انسانوں کی مدد، رہنمائی اور دعاؤں کی ضرورت پڑتی ہے۔ خوشی اور غمی میں ہمارا اکٹھا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ زیست کے یہ متضاد مگر بنیادی ادوار ہیں جو ہم اکیلے نہیں گزار سکتے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جرم کی سب سے بڑی سزا موت کے بعد عمر قید یا قید تنہائی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکیلے رہنا بدترین سزا ہے۔ یونان کے عظیم فلاسفر ارسطو نے کہا تھا کہ انسانوں سے کٹ کر رہنے والا یا تو جنگلی جانور ہو سکتا ہے یا دیوتا وہ انسان نہیں ہو سکتا کیونکہ انسان اپنی ضروریات کے لیے دوسرے انسانوں کا محتاج ہے۔ دنیا کا کوئی انسان اپنی تمام ضرورتیں خود پوری نہیں کر سکتا اس لیے وہ مل جل کر رہنے پر مجبور ہے۔ انسانی معاشرے کی ابتداء زرعی معاشرے سے ہوئی جب انسان نے بیج سے خوراک حاصل کرنے کا راز دریافت کر لیا۔ مل جل کر رہنا ہی زندگی کا اصل حسن ہے۔ کسی بھی معاشرے میں جب لوگ تعصبات سے عاری ہو کر ایک پرچم تلے متحد ہو کر اپنے قائد کی آواز پر لبیک کہتے ہیں تو ہجوم سے ناقابل تسخیر قوم بن جاتے ہے۔ قائداعظم نے پاکستان کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے تین بنیادی اصول اتحاد، ایمان اور نظم و ضبط وضع کیے تھے۔ بدقسمتی سے ہم ۶۳ سال گزرنے کے بعد بھی ان اصولوں کو اپنی زندگیوں میں شامل نہ کر سکے اور اس عظیم قائد کے فرمان اور پاکستان کی تخلیق کی وجہ سے انکار کے مرتکب ہوئے۔ کہنے کو تو ہم اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آزاد شہری ہیں مگر شاید یہ بھول جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ''اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور آپس میں تفرقہ نہ کرو''۔ آج ہم نسلوں، رنگوں، صوبوں، زبانوں، طبقوں اور فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ برداشت کا مادہ بالکل ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ حالانکہ اتحاد کا برداشت سے

وہی تعلق ہے جو نبض کا قلب سے ہوتا ہے۔ اتحاد میں بڑی طاقت ہے اور نفاق کمزوری کا پیش خیمہ ہے۔ جیسے اینٹ سے اینٹ جڑنے سے اک مضبوط عمارت کھڑی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ملکی سلامتی کے لیے آپس میں مل کر مضبوط معاشرہ تشکیل دیا جا سکتا ہے۔ اگر ہم متحد ہو جائیں تو اس کے دائرہ کار کو دوسرے ملکوں تک بڑھایا جا سکتا ہے۔

کچھ سال پہلے کی بات ہے کہ یورپ کے دو درجن سے زائد ممالک نے آپس میں اتحاد کر کے یورپی یونین کی بنیاد رکھی۔ اور ان میں سے بارہ ممالک کی تو کرنسی بھی یورو ہے جس کا باقاعدہ اجراء ۱۹۹۹ء میں کامیابی سے کیا گیا۔ ان پچیس جمہوری ریاستوں کا ہیڈ آفس بلجیم کے شہر برسلز میں بنایا گیا اور یورپین سنٹرل بینک کا ہیڈ آفس جرمنی کے شہر فرینکفورٹ کو قرار دیا گیا۔ اتنے ممالک کا یکجا ہونا دنیا میں اک مثال ہے اور یہ اس اتحاد کا کرشمہ ہے کہ یورو نے بارہ سالوں میں امریکی ڈالر کو مات دے دی۔ رکن ممالک کے تمام شہریوں کو یکساں حقوق حاصل ہیں اور وہ آزادانہ کسی بھی ملک میں آ جا سکتے ہیں اور کہیں بھی رہ سکتے ہیں۔ یہ تاریخی اتحاد انہوں نے رنگ، نسل، زبان، طبقہ، مذہب اور حیثیت جیسے تمام تعصبات کو بالائے طاق رکھ کر کیا۔ ایسی ہی ایک کوشش ۲۲ سے ۲۴ فروری ۱۹۷۴ء کو پاکستان کے شہر لاہور میں ہو چکی ہے جب عالم اسلام کے سربراہان مملکت یا ان کے نمائندوں نے اس تاریخی اسلامی کانفرنس میں شرکت کی۔ جس میں ماسٹر مائنڈ ذوالفقار علی بھٹو مقتول پاکستان کی نمائندگی کر رہے تھے۔

ان کے علاوہ سعودی عرب کے شاہ فیصل، ایران کے فلسطین کے یاسر عرفات، بنگلہ دیش کے شیخ مجیب الرحمٰن، مصر کے انور سادات، وغیرہ کے علاوہ اور بھی بہت سے سربراہان مملکت نے شرکت کی۔ اس کا مقصد تمام رکن ممالک کے درمیان باہمی تعلقات اور تعاون کو مضبوط بنانے کے علاوہ سماجی، اقتصادی، سائنسی، ثقافتی سرگرمیوں کو فروغ دینا، نسل پرستی اور تعصب کو ختم کرنا تھا۔ تمام رکن ممالک میں یک جہتی کے ساتھ فلسطین کی عوام کو ان کے قومی حقوق کی حفاظت کی حمایت اور ان کی جدوجہد کی حمایت کرنا بھی اس کانفرنس میں طے ہوا۔ ذوالفقار علی بھٹو مقتول کو اس کانفرنس میں

11

چیئر مین منتخب کیا گیا مگر موجودہ دور کے انسانی حقوق کے علمبردار کو وہ تاریخی اتحاد ہضم نہ ہو سکا اور اس کانفرنس کے وہ خاص متحرک قائدین جو براہ راست یا بالواسطہ اس میں شامل تھے یکے بعد دیگرے بڑے شاطرانہ طریقے سے صفحۂ ہستی سے مٹا دیئے گئے۔ جن میں ذوالفقار علی بھٹو مقتول، شاہ فیصل، انور سادات، رضا شاہ پہلوی، وغیرہ سب ہی تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔ یاسر عرفات نے دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے ہی اپنی سوچ بدل کر مزاحمت ختم کر دی تھی۔

بیچارہ کرنل قذافی اکیلا ہی میدان میں رہ گیا جو اس اسلامی کانفرنس کا ایک اہم اور سرگرم رکن تھا اور جس کی اب باری آ گئی ہے۔ یوں اگر دیکھا جائے تو انھوں نے بڑی مکاری اور ہوشیاری سے اسلامی ممالک کی اس سوچ کو ہی ختم کر دیا جو ان کے لیے کبھی خطرے کی گھنٹی بنی تھی۔ جہاں تک کرنل قذافی اور اس کی حکومت کا سوال ہے تو اگر عوام ان کو واقعی برداشت نہیں کر رہی تو ان کو اپنے ملک کے وسیع تر مفاد میں خود ہی کرسی چھوڑ دینی چاہیے، مگر آج کل خارجی قوتوں کی مداخلت سے اسلامی ممالک کے سربراہان کو اپنی مرضی سے بدلنے کی روش عام ہوتی جا رہی ہے۔ جس کی بنیادی وجہ مسلم ممالک کا آپس میں اتحاد نہ ہونا ہے۔ حالانکہ حکومت یا ملک کا سربراہ چننے کا حق اور بدلنے کا کام تو اس ملک کی عوام کا ہوتا ہے۔

اب لیبیا پر جو جارحانہ کارروائی عمل میں لائی جا رہی ہے اس پر تمام اسلامی ممالک بے حسی کی تصویر بنے ہیں اور کسی میں اتنی جرات نہ ہو سکی کہ اس جارحیت کے خلاف آواز اٹھائے اور اس کو روک کر اس کا پر امن حل تلاش کرنے پر زور دے جس میں لیبیا کی عوام کی مرضی بھی شامل کی جائے۔ آخر کب تک ہمارے اندرونی معاملات کو باہر کا تھانیدار ڈنڈا لے کر اپنی مرضی کے مطابق سدھارنے کے لیے آتا رہے گا؟ اگر یہ سلسلہ جلد نہ روکا گیا تو افغانستان، عراق، لیبیا کے بعد ایران اور پاکستان کی باری بھی زیادہ دور نہیں۔ عقل اور دانش کا تقاضا یہی ہے کہ اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے ہم کو مثبت حکمت عملی اپنانی ہو گی۔ پچاس سے زائد اسلامی ممالک میں ہر طرح کے قدرتی

وسائل، معدنی ذخائر، زرعی دولت، اور کچھ تو ایٹمی طاقت سے بھی مالامال ہیں، مگر ہم اتنے تقسیم ہو چکے ہیں کہ کسی بھی خارجی قوت کا آسانی سے ہدف بن جاتے ہیں۔

باہمی یکجہتی اور اتحاد میں بڑی برکت اور طاقت ہے۔ ہر فرد کو اپنی سوچ میں تبدیلی لا کر برداشت کا مادہ لانا ہو گا۔ اتفاق گھر کے افراد سے شروع ہو کر محلے، گاؤں، شہر، صوبے اور ملکی سطح تک پہنچ سکتا ہے۔ ملک کی سلامتی اور بقاء کے لیے ہم کو تمام تعصبات بھول کر صرف پاکستانی بن کر ایک قوم بننا ہو گا۔ پہلے ہم خود متحد ہو نگے تو دوسرے ملک سے اتحاد کر سکیں گے۔ موجودہ دور میں ہر سیاسی پارٹی کسی مخصوص علاقے یا طبقے کی نمائندگی کر رہی ہیں۔ اب ایسے قائد کی ضرورت ہے جو صرف پاکستانی بن کر سوچے اور ملک میں استحکام اور پرامن فضا لانے کے لیے صوبوں، زبانوں، نسلوں، فرقوں، مذہبوں اور طبقوں کی سیاست نہ کرے بلکہ اسلام کے سنہری اصولوں کو بنیاد بنا کر انسانی مساوات کی سیاست کو فروغ دے۔ تبھی ہم اس بچے کھچے پاکستان کو ان بیرونی طاقتوں سے بچا سکیں گے، جو کسی خونخوار درندے کی طرح اس پر اپنے نوکیلے دانت گاڑنے کے لیے بے چین ہیں۔ اس کے لیے ہم سب کو ذہنی طور پر ایک ہونا ہو گا۔ وہ قدر مشترکہ تلاش کرنا ہو گی جو ہم سب میں پائی جاتی ہے۔ پاکستان اور بھارت کے خلاف میچ میں یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ 1965ء کے بعد پہلی بار پاکستانی عوام کسی قومی مفاد کے لیے ایک دن کے لیے یکجا ہو گئی تھی۔ کیا یہ سب کچھ پاکستان کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نہیں ہو سکتا؟

روزنامہ "دن" لاہور 2 اپریل 2011ء

دی نیشن لندن 8 اپریل 2011ء

قابل غور

☆ اگر پتھر کے دور کا انسان آج کی دنیا میں قدم رکھے تو وہ کبھی یقین نہیں کرے گا کہ یہ وہی دنیا ہے جہاں وہ ایک زندگی بسر کر کے جا چکا ہے۔

☆ حضرت عمرؓ نے تو اپنے دور خلافت میں علماء اور دانشوروں

کے وظائف بلا امتیاز مقرر کیئے۔جن میں یہودی، مسیحی، کفار اور مسلمان سب شامل تھے۔

☆ تمام اسلامی ملکوں میں 500 یونیورسٹی ہیں جبکہ صرف انڈیا میں 8407 یونیورسٹی ہیں اور امریکہ میں 5758 اور کسی اسلامی یونیورسٹی کا نام دنیا کی 500 بہترین یونیورسٹی کی فہرست میں شامل نہیں۔

☆ اگر U N O یہ کردار صرف ظلم مٹانے اور جمہوریت پھیلانے کے واسطے ادا کر رہی ہے تو کشمیر اور فلسطین سے چشم پوشی کیوں؟

☆ جعلی ڈگریوں اور بوٹی مافیا کے اس دور میں اب تو پڑھے لکھے افراد بھی متنازعہ ہوتے جا رہے ہیں۔

☆ ہمیں یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہئے کہ ہمارے آباء و اجداد نے علم کی روشنی سے فیض یاب ہو کر دنیا پر حکومت کی تھی اور یہ قانون آج تک بدلا نہیں۔

اہل علم ہی دنیا پر حکمرانی کرتے ہیں

سماجی ارتقاء انسان کی سوچ،مشاہدے،تجربات،تحقیقات اور جدوجہد کا مرہون منت ہے۔اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور اس کی جبلت میں بہتر سے بہترین کرنے کی جستجو ڈال دی۔ایک دور تھا جب انسان غاروں میں رہتا تھا اور پتوں سے اپنا جسم ڈھانپتا تھا اُس کا معیارزندگی حیوانوں سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا۔انسان کے اندر ازل سے ہی تجسس کی صفت نے اسے زندگی گزارنے کے بہتر مواقع سکھائے۔رسم الخط کے ایجاد ہونے سے قبل ہی انسان تحقیقات کے مراحل سے گزر کر کئی اشیاء ایجاد اور دریافت کر چکا تھا۔جن میں کئی ہتھیار بھی شامل ہیں جن کو وہ اپنے دفاع اور شکار کے لیے استعمال کرتا تھا۔تاریخ لکھنے کا آغاز تحریر کے ساتھ وجود میں آیا۔اس سے قبل انسان پتھر اور دھات کے عہد گزار کر زرعی معاشرے میں داخل ہو چکا تھا۔ابتدا میں پتھروں،چمڑے اور پھر کاغذ پہ ہاتھ سے لکھا جاتا رہا۔پرنٹنگ پریس کی ایجاد سے ایک انقلاب برپا ہو گیا اور بہت جلد اس کو پوری دنیا میں صنعت کا درجہ حاصل ہو گیا۔قرآن پاک،احادیث،اخبارات،رسائل اور نصابی کتب دنیا میں عام ہوئیں جن سے مستفید ہو کر اگلی نسل اس سے بہتر کرنے کی سعی میں مصروف ہو گئی۔دنیا ایک صنعتی انقلاب سے آشنا ہوئی اور دیکھتے دیکھتے صنعتی عہد کا دور بھی گزار کر انسان انفارمیشن ٹیکنالوجی کے دور میں داخل ہو گیا۔جس سے انسان نے ترقی کے مراحل اتنی سبک رفتاری سے طے کئے کہ اگر پتھر کے دور کا انسان آج کی دنیا میں قدم رکھے تو وہ کبھی یقین نہیں کرے گا کہ یہ وہی دنیا ہے جہاں وہ ایک زندگی بسر کر کے جا چکا ہے۔ترقی کے اس دور تک سارے سفر کی وجہ جستجو اور خوب سے خوب تر کی تلاش ہے جو قدرت نے انسان میں ودیعت کر رکھی ہے۔جستجو انسان کو مطالعے اور مشاہدے کی طرف لے کر آتی

ہے اور یہ بات ایک مسلمان سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب سے جو حرف سب سے پہلے کہا وہ اقراء ہے یعنی پڑھ..........!!! قرآن پاک کا آغاز ہی پڑھنے سے ہوا اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ علم حاصل کرو خواہ تم کو چین ہی جانا پڑے۔آپ ﷺ نے جہالت کا اندھیرا علم کی روشنی سے دور کیا۔کلام اللہ جو زبان رسول سے ہوتا ہوا ہم تک پہنچا کتاب نور کے ذریعے ہمیشہ انسانوں کی رہنمائی کرتا رہے گا۔ آپؐ کے وصال کے بعد آپ کے خلفاءؓ نے بھی علم کے زیور سے آراستہ رہنے کی تلقین فرمائی۔حضرت عمرؓ نے تو اپنے دور خلافت میں علماء اور دانشوروں کے وظائف بلا امتیاز مقرر کئے۔جن میں یہودی، مسیحی، کفار اور مسلمان سب شامل تھے۔اور اس دور میں ڈاک کا نظام، چونگی، ٹیکس کا نظام، دودھ پلانے والی عورتوں کو وظائف وغیرہ متعارف کروائے۔

جابر بن حیان، ابن خلدون، بو علی سینا، فیثا غورث، ابن الہیثم، محمد بن موسیٰ خوارزمی، الفرغانی، محمد ابن زکریا رازی، عمر الخیام، جلال الدین رومی، ابو حامد الغزالی، اور ان جیسے کئی سائنسدانوں اور فلاسفروں کی تحقیقات کی بدولت دنیا میں علم کی طاقت سے مسلمانوں نے دیر تک دنیا پر راج کیا۔پھر بد قسمتی سے مسلمان علمی پستی کا شکار ہو گئے۔ یہ علم ہی تھا جس نے سماج کو بدلا اور وہ زرعی اور صنعتی ترقی میں اتنا آگے پہنچ گیا کہ اب کچھ بھی کرنا ناممکن نہیں لگتا۔آج اگر دنیا کا جائزہ لیا جائے تو یہ علم اور تعلیم ہی ہے جس نے کسی ملک کو ترقی یافتہ، ترقی پذیر اور پسماندہ بنا دیا ہے۔تعجب ہے کہ گزشتہ صدی میں صرف ایک مسلمان سائنسدان ڈاکٹر عبدالسلام کو نوبل پرائز مل سکا۔

تمام اسلامی ملکوں میں 500 یونیورسٹی ہیں جبکہ صرف انڈیا میں 8407 یونیورسٹی ہیں اور امریکہ میں 5758 اور کسی اسلامی یونیورسٹی کا نام دنیا کی 500 بہترین یونیورسٹی کی فہرست میں شامل نہیں۔مسلمان ملکوں میں پڑھے لکھے لوگوں کا تناسب 40 فیصد جبکہ مسیحی ملکوں میں یہ تناسب 90 فیصد اور 15 ملکوں میں یہ تناسب 100 فیصد بھی ہے۔مسلمان ملکوں میں کوئی بھی ایسا نہیں جہاں پڑھے لکھے لوگوں کا تناسب 100 فیصد ہو۔مسلمان ملکوں میں یونیورسٹی میں داخلے کی شرح کا تناسب صرف 2 فیصد اور مسیحی

ملکوں میں یہ تناسب 40 فیصد ہے۔دنیا میں یہودیوں کی تعداد صرف 1 کروڑ 40 لاکھ ہے مگر جدید دور کے ہر شعبہ میں ان کی خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔البرٹ آئن سٹائن، سیگمنڈ فرائڈ، کارل مارکس، ملٹن فریڈ مین، پال سموئلسن وغیرہ سب تاریخی سائنسدان ہیں۔ٹیکہ لگانے والی سرنج اور سوئی کا موجد روبن، پولیو کے علاج کا موجد جوناس سالک، خون کے کینسر کے علاج کا موجد جیرٹرود ایلیون، غدود کے امراض اور ریسرچ کا اہم نام اینڈریو شالی سب یہودی ہیں۔مختصراً یہ کہ موجودہ دور میں تمام ایجادات، تحقیقات اور تجربات پہ انہی کا قبضہ ہے۔میڈیا کے اس دور میں سی این این، اے بی سی نیوز، واشنگٹن پوسٹ، ٹائم میگزین، نیویارک ٹائم بھی یہی چلا رہے ہیں۔گزشتہ صدی میں 180 نوبل پرائز یہودی سائنسدانوں کے حصہ میں آئے۔یہی وجہ ہے کہ تعداد میں کم ہونے کے باوجود انہوں نے علمی طاقت سے اپنے آپ کو اتنا مضبوط کر رکھا ہے کہ NASA اور Pantagon بھی ان کی مرضی اور مشورہ کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے۔

یہ تعلیم اور علم کی برکت تھی کہ جاپان اور جرمنی جنگ عظیم کے بعد نہ صرف اپنے پاؤں پہ کھڑے ہوئے بلکہ پوری دنیا میں انہوں نے 1990ء تک معاشی استحکام میں نمایاں پوزیشن حاصل کی۔آج لیبیا، یمن، مصر اور تیونس میں جو ہو رہا ہے وہ علمی پستی کا نتیجہ ہے۔اگر مسلمان ملکوں نے بھی علمی اسلحے سے اپنے آپ کو لیس کیا ہوتا تو کبھی کوئی افغانستان، عراق، لیبیا، مصر، یمن، تیونس، ایران، کویت، وغیرہ کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کی ہمت نہ کرتا۔

ہم جہالت کی تاریکی میں ہیں جہاں ہمیں اپنے حقوق و فرائض کے راستے کا تعین کرنے میں دشواری ہوتی ہے۔پاکستان کی خواندگی کی شرح خوفناک حد تک کم ہے۔جعلی ڈگریوں اور بوٹی مافیا کے اس دور میں اب تو پڑھے لکھے افراد بھی متنازعہ ہوتے جا رہے ہیں۔پاکستان میں انقلاب کی باتیں کرنے والے پہلے لوگوں کے اس ہجوم کو قوم تو بنائیں جو جہالت کی گہری نیند میں ہیں، کوئی ان کے شعور کو بیدار تو کرے۔

ناموس رسالت پہ جان نثار کرنے پر ہر وقت تیار رہنے والے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ آپ ﷺ کی تعلیمات پر عمل کر کے ان سے محبت کا عملی ثبوت دیا جاسکتا ہے۔اب ناگزیر ہو گیا ہے کہ ملک میں تعلیمی نظام کا ڈھانچہ مکمل طور پر بدلا جائے۔ملک بھر میں یکساں نصاب اور نظام تعلیم رائج ہو۔کم سے کم تعلیم میٹرک ہو اور غریبوں کے لیے تعلیمی سہولیات مفت ہوں۔تا کہ عوام کی سوچ میں وسعت آئے اور آنے والی نسل اس ملک کی ترقی میں اپنا بھرپور کردار ادا کر سکے۔ہمیں یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہیے کہ ہمارے آباء واجداد نے علم کی روشنی سے فیض یاب ہو کر دنیا پر حکومت کی تھی اور یہ قانون آج تک بدلا نہیں۔

روزنامہ ''دن'' لاہور 08 اپریل 2011ء

یو کے ٹائم لندن 14 اپریل 2011ء

قابل غور

☆ اکیس سال بعد کرکٹ کے سامری سچن ٹنڈلکر کا ورلڈ کپ اپنی جنم بھومی میں جیتنے کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکا۔ آسٹریلیا کی 16 سالہ کرکٹ پر حکمرانی کا سورج برطانیہ کی حکمرانی کے سورج کی طرح غروب ہو گیا۔

☆ کہنے کوتو کرکٹ ایک کھیل ہے مگر پاکستان میں واحد شئے ہے جو ساری عوام کو چاہے چند گھنٹوں کے لیے سہی مختلف گروہوں سے پاکستانی بنا دیتی ہے۔

☆ ہم نے آسٹریلیا کو 1999ء کے بعد دوبارہ عالمی کرکٹ کپ میں ہرا کر اس کی کشتی میں پہلا سوراخ کردیا ہے عنقریب یہ سوراخوں والی کشتی کہلائے گی۔

☆ ویسٹ انڈیز جو کبھی کالی آندھی تھی آج کالی بھیڑ بن چکی ہے۔کالی آندھی اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود سبز باؤنڈری عبور نہ کرسکی۔

☆ اگر بات انڈیا سے میچ ہارنے کی ہے تو ہم اس کو دوسرے میدانوں میں اپنا حریف اسی شدت سے کیوں نہیں بناتے......؟

❁......❁......❁

جیت جاتے تو کیا ہو جاتا؟

آخر کار کرکٹ ورلڈ کپ 2011ء کے بخار سے پاکستانی قوم کو اللہ تعالیٰ نے شفا بخش دی ہے۔سترہ سال بعد ہنومان نے لنکا سے سیتا واپس چھین لی ہے۔اکیس سال بعد کرکٹ کے سامری سچن ٹنڈلکر کا ورلڈ کپ اپنی جنم بھومی میں جیتنے کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکا۔آسٹریلیا کی 16 سالہ کرکٹ پر حکمرانی کا سورج برطانیہ کی حکمرانی کے سورج کی طرح غروب ہوگیا۔آسٹریلیا نے گزشتہ تین عالمی کرکٹ کپس میں پاکستان،انڈیا اور سری لنکا کو یکے بعد دیگرے فائنل میں شکست دے کر عالمی کپ میں کامیابیاں حاصل کیں مگر اس بار یہ تینوں ایشین ٹیمیں سیمی فائنل تک پہنچیں اور آسٹریلیا اس بار کسی کو شکست نہ دے سکا۔تینوں نے دوسری بار عالمی کپ حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کی لیکن کامیابی کا قرعہ بھارت کے نام نکلا۔کہنے کو تو کرکٹ ایک کھیل ہے مگر پاکستان میں واحد شئے ہے جو ساری عوام کو چاہے چند گھنٹوں کے لیے سہی مختلف گروہوں سے پاکستانی بنا دیتی ہے۔یہ پہلی بار نہیں ہوا کہ پاکستانی ٹیم سیمی فائنل ہاری ہو۔ہم اس سے پیشتر فائنل بھی ہار چکے ہیں لیکن اس بار فرق یہ تھا کہ حریف بھارت تھا سوئیں بھارت سے ہار تو کسی صورت قبول نہیں لیکن کھیل میں تو یہ برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔عالمی کرکٹ کپ سے قبل پاکستانی ٹیم کی سیمی فائنل تک رسائی کا کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن شاہد خان آفریدی نے جس خواہش کا اظہار کیا اللہ تعالیٰ نے اس کو وہاں تک پہنچا دیا۔مجھے اب یہ افسوس ہو رہا ہے کہ اس پٹھان نے دعا بھی مانگی تو صرف سیمی فائنل کی۔کاش اُس وقت وہ فائنل کی دعا ہی مانگ لیتا۔مگر یہ بھی سچ ہے کہ جن حالات سے پاکستانی ٹیم اب گزری ہے وہ پہلے نہیں دیکھنے پڑے۔دہشت گردی کی وجہ سے دوسری ٹیموں کا پاکستان میں کھیلنے سے انکار اور کچھ ممالک نے تو پاکستانی ٹیم کو گھر بلا

کر بھی کھیلنے سے انکار کردیا تھا۔کرکٹ ورلڈکپ سے محرومی، سپاٹ و میچ فکسنگ اسکینڈلز، کرپشن مافیا، خاندانی قبضہ گروپ، غیر متوازن ٹیم کا انتخاب، آخر تک کپتان کا پتہ نہیں، سلیکشن کے مراحل میں کپتان کی مشاورت کا پہلو ہی خارج، آئی پی ایل میں کسی پاکستانی کھلاڑی کا حصہ نہ لینا، یک طرفہ اور بے حوصلہ تماشائی، میچ سے قبل بھارتی میڈیا کا منفی پراپیگنڈا، شیوسینا کی دھمکیاں، رحمٰن ملک کا بیان، ٹنڈلکر پر فیلڈرز کی مہربانیاں، نصف درجن کیچ چھوڑنا، بوڑھوں کی جوڑی کی بھارت نوازبیٹنگ، وغیرہ وغیرہ کے باوجود پاکستان کی ٹیم صرف 29رنز سے ہاری بیشک اللہ تعالی کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے۔ شکر ہے ہم نہیں جیتے ورنہ اعجاز بٹ تو کبھی جانے کا نام نہیں لیتے ویسے وہ ہیں چکنے ڈھیٹ جانے کا ذکر اب بھی نہیں کریں گے اور اس حوالے سے وہ ضیاءالحق کے جانشین دکھائی دیتے ہیں۔اگر ہم جیت جاتے تو نا جانے کب تک کامران اکمل کو برداشت کرنا پڑتا لیکن یہ کڑوا گھونٹ تو اب بھی پینا ہی پڑے گا۔

ہمارے عوام تو برداشت کر ہی لیتے ہیں مگر جیت جاتے تو بھارتی جنتا اس کو کیسے ہضم کرتی؟ جو پہلے ہی متعدد بار اپنی ٹیم کو ہارتا دیکھ کر سٹیڈیم کو آگ لگا چکی ہے۔بھارتی میڈیا کا کیا حال ہو جاتا؟ سیاسی تناؤ ممکن ہے جنگی جنون میں بدل جاتا؟ہارنے کے باوجود کچھ احباب ابھی تک ٹیم کا حصہ ہیں، جیت جاتے تو نا جانے کتنی نحوستیں ٹیم میں ہی رہتیں۔بعض اوقات ہم جو جیت کر حاصل نہیں کرسکتے وہ ہار کر حاصل کر لیتے ہیں، غلطیوں سے سبق......!!مگر اپنی حالت تو یہ ہے کہ غلطی کر دریا میں ڈال ......!!سبق سیکھنے کی ضرورت کیا ہے؟ سبق سیکھنے کے لیے تو عمر پڑی ہے۔ابھی تو میں جواں ہوں......!! ٹیم اور ٹیم انتظامیہ میں کئی بارہ سنگھے ایسا ہی سوچتے ہوں گے۔

عالمی کرکٹ کپ میں ہم کو جہاں بھارت سے نہ جیتنے کا دکھ ہے وہاں کئی اچھے پہلو بھی ہیں۔ہم نے آسٹریلیا کو 1999ء کے بعد دوبارہ عالمی کرکٹ کپ میں ہرا کر اس کی کشتی میں پہلا سوراخ کردیا ہے عنقریب یہ سوراخوں والی کشتی کہلائے گی۔سری لنکا کو بھی شکست دی اور اپنے گروپ میں سرفہرست رہے۔جہاں تک ہارنے کی بات ہے

تو کرکٹ کا موجد برطانیہ اور ہارٹ فیورٹ ساؤتھ افریقہ بھی سیمی فائنل سے پہلے ہی باہر ہوئے۔ویسٹ انڈیز جو کبھی کالی آندھی تھی آج کالی بھیڑ بن چکی ہے۔کالی آندھی اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود سبز باؤنڈری عبور نہ کرسکی۔نیوزی لینڈ کا حوصلہ ہے کہ جس نے سب سے زیادہ سیمی فائنل ہارنے کی نئی تاریخ رقم کی۔ان حالات کو دیکھا جائے تو ہماری کارکردگی اتنی بری نہیں رہی کہ ہم شرمندہ شرمندہ دکھائی دیں۔کرکٹ کھیل ہے اور اسے کھیل ہی رہنے دیا جائے تو بہتر ہے۔کیا ہی اچھا ہو کہ لوگ کرکٹ کے میچ پر جیسے قوم دکھائی دیئے اسی طرح دوسرے معاملات میں بھی صرف پاکستانی بن کر سوچیں۔کیونکہ کرکٹ ورلڈکپ کی جیت ہمارے مسائل کا حل نہیں۔

عالمی کرکٹ کپ جیت کر جان عزیز وطن کے حالات تو نہ بدلتے، دہشت گردی کم نہ ہوتی، مہنگائی بیروزگاری، لوڈشیڈنگ، لوٹ مار، قتل و غارت، جہالت، غنڈہ گردی، بھوک افلاس، ناانصافی، لاقانونیت، اقربہ پروری، جعلسازی، ڈاکہ زنی، خودکشی و خودسوزی، ڈرون حملے اور ظلم، سب ایسے ہی چلتے رہنا تھا اور کچھ بھی ختم نہیں ہونا تھا۔اگر جیت کر بھی یہ سب مسائل ویسے ہی رہنے تھے تو پھر ہماری قوم کی سوچ کا محور صرف کرکٹ کا میچ ہی کیوں......؟اگر بات انڈیا سے میچ ہارنے کی ہے تو ہم اس کو دوسرے میدانوں میں اپنا حریف اسی شدت سے کیوں نہیں بناتے......؟تعلیمی معیار، معاشی استحکام، خارجہ پالیسی اور جمہوریت کے نفاذ میں وہ ہم سے آگے ہیں اور مزید آگے نکلتے جارہے ہیں۔کیوں ہم دوسرے معاملات میں پر توجہ مرکوز نہیں کرتے؟اُن کی روایات، رسمیں اور تہذیب و تمدن کو ہم نے اپنی زندگی کا حصہ بنالیا ہے۔ہر گھر میں ان کے پروگرامز بڑی شوق سے دیکھے جاتے ہیں۔حال یہ ہوگیا ہے کہ ہمیں اپنی اسلامی تاریخ کا پتہ ہو نہ ہو مگر ان کے مذہبی اور علاقائی تہوار کا پتہ ہوگا۔ان کا میڈیا ہم کو ہر بات پہ نیچا دکھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا مگر ہمارے کچھ چینلز کے پاس انٹرٹینمیٹ کی خبریں صرف بھارت سے ہی امپورٹ ہوتی ہیں۔

ہمارے کھلاڑیوں کو چاہے IPL میں کوئی لفٹ نہ بھی کرائے مگر وہ چینلز

IPLبراہ راست دکھانا قومی فریضہ سمجھتے ہیں۔ہر فنکار بھارت سے سند یافتہ ہونا چاہتا ہے شاید ادھر کی سند کو کوئی جعلی قرار نہ دیتا ہو۔ہم نے تو اپنے نصاب سے بھی اسلامی تاریخ کے کئی واقعات کو اس لیے نکال دیا کہ دنیا والے ہم کو جہادی یا دہشت گرد نہ سمجھیں مگر انڈین تو بڑی ڈھٹائی اور چالاکی سے اپنے میڈیا کے ذریعہ ہندوازم کا پرچار کر رہا ہے۔اپنی ہر فلم اور ڈرامے میں مذہبی رسومات اور تہوار دکھا کر ہماری نسلوں میں اپنا کلچر داخل کرتا جارہا ہے۔تبلیغ کا یہ دائرہ صرف پاکستان تک ہی محدود نہیں بلکہ برطانیہ، یورپ، امریکہ، کینیڈا اور آسٹریلیا تک جا پہنچا ہے۔

اگر ہم کو انڈین کلچر اتنا ہی اچھا لگتا ہے تو اک میچ کی شکست پر اتنا شدید تناؤ سمجھ سے بالاتر ہے۔اس وقت کرکٹ سے زیادہ کئی اہم معاملات ہیں جن پر ہم کو یکجا ہو کر سوچنے کی ضرورت ہے۔میچ والے دن سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ ابھی ہم مردار نہیں ہوئے۔ہم زندہ ہیں بس ذرا ضمیر سویا ہوا ہے۔اس سوئے ضمیر کو جگانے والا کوئی چاہیے۔

روزنامہ "دن" لاہور 18اپریل 2011ء
دی نیشن لندن 22اپریل 2011ء

قابل غور

☆ ماں وہ عظیم ہستی ہے جس کی گود سے ہی سب کی دنیا شروع ہوتی ہے اور اس کے آنچل میں شفقت کے وہ ستارے جگمگاتے ہیں جو اماوس کی سیاہ راتوں میں بھی کبھی مدھم نہیں پڑتے۔

☆ اللہ تعالیٰ کے بعد اگر کوئی بے لوث ہو کر حسن سلوک کا

مظاہرہ کرتا ہے تو وہ صرف ماں ہے۔

☆ وہ بھی ماں کا دوسرا نام ہے "دھرتی ماں" جس پہ ہماری ہر ماں اپنے دل کے ٹکڑے کو قربان کر کے فخر محسوس کرتی ہے۔

☆ محبت کے جذبے کو صرف اور صرف جدائی کی کسوٹی پہ پرکھا جا سکتا ہے۔

☆ پردیس آ کر جب ہر کام اپنے ہاتھ سے کرنا پڑتا ہے تو بعض اوقات تو ماں کی ماں یعنی نانی بھی یاد آ جاتی ہے۔

☆ وہ مصیبتوں اور پریشانیوں کا ذکر اور حل تو مانگتے ہیں مگر ان جلاوطنوں سے کبھی ان کے مسائل کا نہیں پوچھتے۔

☆ محنت کا یہ عالم کہ جس نے اپنے دیس میں کبھی تنکا بھی نہ توڑا ہوا ادھر ہر کام نہ صرف کرنے کو تیار رہتے ہیں بلکہ ہفتے کے 7 دن 12 سے 16 گھنٹے تک بھی کام کرتے نظر آتے ہیں۔

تارکین وطن کی مجبوریاں

ماں وہ عظیم ہستی ہے جس کی گود سے ہی سب کی دنیا شروع ہوتی ہے اور اس کے آنچل میں شفقت کے وہ ستارے جگمگاتے ہیں جو اماوس کی سیاہ راتوں میں بھی مدھم نہیں پڑتے۔ جس کی انگلی پکڑ کر ہم پہلا قدم اٹھاتے ہیں تو ماں کے دل سے دعا، آنکھوں سے خوشی کے آنسو اور زبان سے حوصلہ افزائی کے وہ کلمات نکلتے ہیں جن کی بدولت ہم تا حیات کامرانی کی طرف قدم بڑھاتے رہتے ہیں اور زندگی کی آخری سانس تک وہ ہر قدم پر اسی سچے جذبے سے ہمارے حوصلہ بڑھاتی رہتی ہے۔ دنیا کے نشیب و فراز کی تھکان بھی اسی کے کندھے پر سر رکھنے سے دور ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بعد اگر کوئی بے لوث ہو کر حسن سلوک کا مظاہرہ کرتا ہے تو وہ صرف ماں ہے۔ دنیا میں اگر ہم کو سب سے زیادہ الٰہی صفات کی مالک کوئی ہستی نظر آتی ہے تو وہ ماں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان سے جنت سے بڑھ کر کوئی وعدہ نہیں کیا، نیک اور پارسا انسان کی زندگی کی ہر نیکی صرف رضاءِ الٰہی اور اُس کے نتیجہ میں حصول جنت کے لیے ہوتی ہے لیکن اس جنت کا مقام یہ ہے کہ یہ ماں کے قدم تلے ہے۔ ہم جہاں چاہیں چلے جائیں اور جتنی مرضی زبانیں سیکھ لیں مگر جو مزہ مادری زبان یعنی ماں بولی میں ہے وہ کسی اور زبان میں نہیں۔ شاید یہ اس لیے بھی ہے کہ بچہ یہ زبان ماں کے پیٹ سے ہی سیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ دنیا میں ہر شخص خواب تو ضرور دیکھتا ہے۔ جاگتے میں وہ چاہے جتنی مرضی زبانیں بولے مگر خواب ہمیشہ مادری زبان میں ہی آتا ہے۔ ہمارے دیس کی ماں اپنے بچے پہ اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی ہے مگر ایک شے ایسی بھی ہے جس پہ ماں اپنے لخت جگر کو قربان کرنا فخر سمجھتی ہے۔ وہ بھی ماں کا دوسرا نام ہے "دھرتی ماں" جس پہ ہماری ہر ماں اپنے دل کے ٹکڑے کو قربان کر کے فخر محسوس کرتی ہے۔ وہ خوش

قسمت ہوتے ہیں جن کی زندگی کی ابتدا ماں کی گود اور زیست کی انتہا دھرتی ماں کی گود میں ہو۔ گود سے گور تک کے اس سفر میں ہمیں بعض اوقات ان دونوں ماؤں سے دور ایک نئی دنیا میں اپنی دنیا بسانی پڑتی ہے۔

ہم میں سے کوئی بھی خوشی سے نہ تو اپنی ماں اور نہ ہی دھرتی ماں کو چھوڑنا چاہتا۔ اس وقت لاکھوں تارکین وطن جانِ عزیز پاکستان کو چھوڑ کر دنیا کے مختلف حصوں میں اپنی قسمت آزمائی کر رہے ہیں۔ اس جلاوطنی کا محرک چاہے سیاسی ہو یا معاشی مگر درد ایک ہی ہے۔ ہم پردیس میں رہنے والوں کی اپنی ماں اور دھرتی ماں سے پیار کی جو شدت ہے وہ ان سے کہیں زیادہ ہوتی ہے جو وطن عزیز میں اپنی ماں کی آنکھوں کے سامنے ہیں۔ یہ فطری عمل ہے کہ جب تک آپ کسی شخص یا چیز کے پاس ہوں اس کی قدر و منزلت کا اندازہ اُتنی شدت سے نہیں ہوتا جتنا اُس سے دور جا کر ہوتا ہے۔ محبت کے جذبے کو صرف اور صرف جدائی کی کسوٹی پہ پرکھا جا سکتا ہے۔ ہم میں سے بیشتر جو کسی بھی حالات کی وجہ سے ماں اور دھرتی ماں چھوڑنے پر مجبور ہوتے ہیں تو ان کو ماں نے اپنے لاڈ پیار سے اتنا کاہل پسند بنا دیا ہوتا ہے کہ کچھ پکانا تو دور کی بات پانی کا گلاس تک ہم خود اٹھا کر نہیں لیتے مگر دیارِ غیر میں آتے ہی ہر قدم پہ ہمیں ماں اور دھرتی ماں شدت سے یاد آتی ہیں۔ نہ ہی کوئی نازنخرے دیکھنے والی ماں ہے اور نہ ہی اپنی مرضی سے "موجاں" کروانے والی دھرتی ماں۔ پردیس آ کر جب ہر کام اپنے ہاتھ سے کرنا پڑتا ہے تو بعض اوقات تو ماں کی ماں یعنی نانی بھی یاد آ جاتی ہے۔ اب تو شکر ہے الیکٹرونک ٹیکنالوجی اتنی ایڈوانس ہو چکی ہے کہ انٹرنیٹ اور فون کے ذریعے آدھی ملاقات تو روزانہ ہی ہو جاتی ہے مگر کبھی وقت تھا کہ جب چٹھی پر ہی گزارا کرنا پڑتا تھا۔ ادھر آ کر جہاں احساس ذمہ داری بڑھتی ہے وہاں حب الوطنی بھی بڑھ جاتی ہے اور ملک میں رہ کر اس کو برا بھلا کہنے والے جب پردیس میں آتے ہیں تو وہ یہاں کے شفاف سسٹم میں رہ کر اس نتیجے پہ پہنچتے ہیں کہ ہم کو ایک قوم بن کر ملک کی ترقی اور استحکام کے لیے موثر اقدامات کرنا ہوں گے۔ الزامات اور جوابی الزامات کے بجائے دھرتی ماں کی

بہتری کے لیے ایک ایجنڈے پہ متفق ہونا چاہیے۔ پردیس میں آئے ہوئے ان جلاوطنوں میں ایک بات مشترک ہے کہ وہ اپنے دیس اور اس میں بسنے والوں کی مشکلات سے بخوبی واقف ہوتے ہیں بلکہ جتنا درد وہ محسوس کرتے ہیں دیس میں بیٹھے لوگ اتنا نہیں کرتے مگر ان کے "پردیسی مسائل" سے دیس والے آشنا نہیں ہوتے۔ وہ مصیبتوں اور پریشانیوں کا ذکر اور حل تو مانگتے ہیں مگر ان جلاوطنوں سے کبھی ان کے مسائل کا نہیں پوچھتے۔ بیچارے اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پردیس آتے ہیں جہاں زبان، تہذیب، موسم، لباس، تمدن، سماج اور اقدار سب کچھ نیا ہوتا ہے۔ جس کو سمجھنے میں ان کو کافی وقت لگ جاتا ہے۔ ایک جدائی کا غم اور دوسرا روزگار مسئلہ۔ تیسرا دیسی مسائل۔ ان سب سے وہ اکیلا جنگ کرتا ہے۔

تارکین وطن میں قربانی کا جذبہ بھی دیکھنے لائق ہے۔ پردیس میں رہ کر وہ اپنی خواہشات کا گلا گھونٹ کر اپنے دیس میں گھر بار والوں کی خواہشات کو مقدم رکھتے ہیں۔ محنت کا یہ عالم کہ جس نے اپنے دیس میں کبھی تنکا بھی نہ توڑا ہو ادھر ہر کام نہ صرف کرنے کو تیار رہتے ہیں بلکہ ہفتے کے 7 دن 12 سے 16 گھنٹے تک بھی کام کرتے نظر آتے ہیں۔ قناعت، عاجزی اور اتحاد کا پہلو بھی ان پردیسوں میں قابل دید ہے۔ ایک چھوٹے سے فلیٹ یا کمرے میں 6، 7 افراد مل کر نہ صرف پیار سے رہ رہے ہوتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کے دکھ درد اور تکلیف میں فیملی ممبر کی طرح مدد بھی کرتے ہیں۔ ان میں طالب علم، مزدور، تاجر بھی شامل ہیں۔

نظم و ضبط اور قانون کی پاسداری بھی دنوں میں سیکھ جاتے ہیں اور اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔ موجودہ حالات میں تارکین وطن کی مشکلات تو اور بھی زیادہ ہو گئی ہیں۔ ہمارے ملک پہ جس طرح مکاری اور چالاکی سے دہشت گردی کا لیبل چسپاں کیا جا رہا ہے اس کے اثرات یہاں بسنے والوں پر بھی نمایاں ہیں اور ہم سے بڑی ہوشیاری سے امتیازی سلوک کیا جا رہا ہے۔ ہمارے کسی بھی طالب علم کو محض شک کی بنا پر ہی ملک بدر کر دینا عام سی بات ہے جبکہ ہمارے ملک میں کوئی باہر سے آ کر کھلے عام قتل و غارت

کرے اس کو اعزاز کے ساتھ چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ہمارے غیر شفاف تعلیمی نظام کی وجہ سے ہمارے اعلیٰ تعلیم یافتہ کی ڈگریاں بھی سوالیہ نشان بن گئی ہیں اور ان کو یہاں پیشہ وارانہ جوہر دکھانے کے لیے پھر سے امتحانوں کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اپنے دیس سے نکلتے ہم یہ سوچ رہے ہوتے ہیں کہ اب جاتے ہی یورو، ڈالر یا پاؤنڈ کمانا شروع ہو جائیں گے اور سب مسائل ختم مگر یہاں پہنچ کر پتہ چلتا ہے کہ دیس سے پردیس آ کر مسائل ختم تو نہ ہوئے مگر ان کی شکل بدل گئی۔ ادھر تو ہر تارک وطن اپنے ملک کا سفیر ہی نہیں ایک وکیل بھی ہے جو آئے دن ملک میں پیش آنے والے برے واقعات پر لوگوں کے چبھتے سوالوں کا جواب دلائل سے دینے کی کوشش کرتا ہیں۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہم اگر پردیس میں آ کر محنتی، قربانی کے جذبے سے سرشار، متحد، عاجز، قانون کی پاسداری کرنے والے محب الوطن بن سکتے ہیں تو اپنے ملک میں رہ کر ان خصوصیات کو استعمال کیوں نہیں کرتے؟ آخر دیس کا سارا ٹیلنٹ دوسرے ممالک کو ہی فائدہ کیوں دے رہا ہے؟ سب سے پہلے پاکستان کیوں نہیں؟ آخر وہ کیا وجوہات ہیں کہ ایک ماں یا بیوی اپنا زیور بیچ کر اپنے لختِ جگر یا جان من کو پردیس بھیج کر خود جدائی کا زہر پینے کو ترجیح دیتی ہیں؟

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ کوئی بھی ملک چھوڑنا نہیں چاہتا کیونکہ ہر کوئی ماں اور دھرتی ماں سے عشق کرتا ہے اور پردیس میں خواہ جتنی دیر رہے ہر کسی کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی گور دھرتی ماں میں ہی ہو۔

روزنامہ "دن" لاہور 24 اپریل 2011ء

یو کے ٹائم لندن 5 مئی 2011ء

قابلِ غور

☆ اہلِ قریش نے کہا محمدؐ بن عبداللہ ہم یہ سمجھیں گے کہ ہم ہی اندھے ہیں جو دیکھ نہیں سکتے مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ آپؐ جو فرمائیں وہ درست نہ ہو۔

☆ بچے کی نیت بڑی شفاف ہوتی ہے اور یہ اس کے یقین کا

ثبوت ہوتا ہے جب ہم اس کو ہوا میں اچھالتے ہیں تو وہ زور سے ہنس رہا ہوتا ہے کیونکہ اس کو اس بات کا یقین ہوتا ہے ہم اس کو گرنے سے پہلے ہی پکڑ لیں گے۔

☆ جہاں ایوان اقتدار میں بیٹھے لوگ قرآن پاک پر کئے وعدے وفا نہ کریں وہ عوام سے کئے کسی اور وعدے کو پورا کیا کریں گے۔

☆ آج ہم کو تین دن سچ بولنا اور صرف سچ کا ساتھ دینا پڑ جائے تو شاید یہ تین دن ہم کو زندگی کے مشکل ترین دن تصور ہونگے۔

☆ ترقی یافتہ ممالک میں جھوٹ کا عملی زندگی میں وہ تناسب ہے جو ہمارے معاشرے میں سچ کا ہے۔

❁----❁----❁

کیا ہم جھوٹ بول کر ترقی کر سکتے ہیں؟؟؟

میں جرمنی کے شہر شوائن فورٹ میں ایک نجی کمپنی کا شفٹ انچارج تھا۔ 1998ء کی گرمیوں کی ایک شفٹ کے دوران دو ورکرز ڈیوٹی پر نہ آئے۔ میں نے فون پر وجہ جاننے کی کوشش کی تاکہ ان کا متبادل بندوبست ہو سکے مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اسی اثناء میں جرمن لڑکی جس کی ڈیوٹی تھی کمرے میں داخل ہوئی اور آتے ہی معذرت کرتے ہوئے بتانے لگی کہ کل اُس کے بوائے فرینڈ کی سالگرہ تھی اور رات کو دیر تک موج مستی کی اور اتنی پی لی کہ آج صبح وقت پر جاگ نہ سکی، موبائل بھی چارج نہ تھا کہ فون کال ریسیو کر سکتی۔ تھوڑی دیر بعد دوسرا ورکر جو پاکستانی تھا وہ بھی کام پر آ گیا اور مجھ کو لیٹ آنے کی ایسی وجہ بتائی کہ اس کو میں نے دو گھنٹے پہلے ہی گھر بھیج دیا۔ شاید مجھ میں تھوڑی دیر کے لیے اس دیسی پردیسی کی کہانی نے اتنا اثر کیا کہ مجھ میں اپنے دیس کی محبت نے احساس کا جذبہ جگا دیا جس کی وجہ سے میں ڈیوٹی ختم کر کے سیدھا اس کے گھر چلا گیا تاکہ اس کی خیریت معلوم کر سکوں۔ اچانک دروازے پر مجھ کو دیکھ کر وہ حیران اور کچھ پریشان سا ہو گیا۔ حیران ہونے کی وجہ میرا اچانک آنا تھا اور پریشان اس لیے کہ اس کے جھوٹ کا پول کھل گیا۔ خیر میں اپنے پاکستانی ساتھی کے ساتھ کچھ ہمدردی کرنے گیا مگر......! واپسی پر میں یہی سوچتے سوچتے گھر پہنچا کہ اس جرمن لڑکی نے کتنی بے باکی سے سچ بولا اور ہم اپنے آپ کو سب سے اعلیٰ دین اسلام کے پیروکار ہونے کے بلند و بالا دعوے کرنے والے کتنی ڈھٹائی سے جھوٹ بول دیتے ہیں۔ جیسے یہ کوئی برائی نہ ہو۔ اب تو لگتا ہے ہم جھوٹ کی اس دلدل میں ایسا پھنس چکے ہیں کہ کوئی سچا ہم کو اس سے نکالنے کے لیے ہاتھ بڑھائے تو اس کو بھی ہم اپنے ساتھ جھوٹ کی اس دلدل میں لے اتریں گے۔

کہنے کوتو ہم اُنؐ کے ماننے والے ہیں جنؐ کی ذات اقدس کل کائنات کے لیے ایک نمونہ ہے۔جنؐ کی حیات طیبہ دنیا میں سب سے افضل اور سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب قرآن پاک کا عملی نمونہ ہے۔آپؐ نے جہالت کے اندھیروں کو علم اور عمل سے پرُنور کیا۔آپؐ کی تاثیر زباں کا یہ عالم تھا کہ آپکے دشمن بھی آپ کو صادق اور امین کہتے تھے۔پہاڑی کی چوٹی پر کھڑے ہوکر اگر آپؐ لوگوں سے یہ فرماتے کہ اگر میں یہ کہوں کہ پہاڑ کے دوسری طرف دشمن کی فوج ہے تو کیا تم میری بات مان لوگے۔سب نے یک زبان ہوکر بے شک ہم آپ کی بات کو تسلیم کریں گے کیوں کہ آپؐ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا کبھی امانت میں خیانت نہیں کی۔آپؐ نے فرمایا اور اگر تم لوگ پہاڑ کی دوسری طرف جا کر دیکھو اور وہاں فوج موجود نہ ہو تو تم کیا سوچو گے؟اہلِ قریش نے کہا محمدؐ بن عبداللہ ہم یہ سمجھیں گے کہ ہم ہی اندھے ہیں جو دیکھ نہیں سکتے مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ آپؐ جو فرمائیں وہ درست نہ ہو۔آپؐ کسی بچے کو بھی صرف میٹھا کھانے سے منع کرنے میں اگلے دن کا انتظار فرماتے کہ اس دن آپؐ نے بھی میٹھا کھایا ہوا تھا یعنی وہ عمل آپؐ نے تو نہیں کیا جس سے کسی کو منع فرمانا ہو۔واقعی بات میں اثر ہی تب آتا ہے جب کوئی اس پر خود کاربند ہو۔اللہ رب العزت فرماتے ہیں "اے ایمان والو! وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں"

آج اسلامی جمہوریہ پاکستان میں آپ کی محبت میں ہر وقت قربان ہونے کے دعوے کرنے والے کروڑوں ہیں۔ان میں سے بہت سے صرف ناموس رسالتؐ کے نام پر ہی بغیر کسی تصدیق کے کسی کے لہو سے ہاتھ رنگ کر فخر محسوس کرتے ہیں مگر آپؐ کی تعلیم اور عمل کی جھلک ان کے کردار کے کسی پہلو میں نظر نہیں آتی۔اب یہ عالم ہے کہ ہر محلے میں عالم ہے......مگر علم نہیں،اگر کسی کے پاس علم ہے......تو عمل نہیں،اگر کوئی عمل کرتا ہے......تو نیت صاف نہیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ آج کے ان نام نہاد علماء پر کوئی با شعور شخص یقین کرنے کے لیے تیار نہیں۔ایمان، نیت، یقین اور عمل کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔یہ چاروں خصوصیات پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ ہماری زندگی کا حصہ بنتی

جاتی ہیں۔بچے کی نیت بڑی شفاف ہوتی ہے اور یہ اس کے یقین کا ثبوت ہوتا ہے جب ہم اس کو ہوا میں اچھالتے ہیں تو وہ زور سے ہنس رہا ہوتا ہے کیونکہ اس کو اس بات کا یقین ہوتا ہے ہم اس کو گرنے سے پہلے ہی پکڑ لیں گے۔ایمان اور عمل اس کی زیست میں وقت، ماحول، تربیت اور حالات کی وجہ سے پختہ ہوتے جاتے ہیں۔آج ہمارے معاشرے میں بچہ اکثر جھوٹے وعدوں اور کھوکھلے دلاسوں کے ماحول میں پروان چڑھتا ہے۔اور تمام برائیوں کی جڑ جھوٹ،اس کے رگ و پے میں ایسا سرایت کر چکا ہے کہ بڑا ہوکر وہ بھی اس معاشرے کا حصہ بن جاتا ہے جہاں سچ اور جھوٹ میں کوئی امتیاز نہیں۔ ہم اب جھوٹ کے مکروہ جال میں اس بری طرح سے پھنس گئے ہیں کہ اس سے نکلنا ناممکن حد تک مشکل دکھائی دیتا ہے۔جہاں ایوان اقتدار میں بیٹھے لوگ قرآن پاک پر کئے وعدے وفا نہ کریں وہ عوام سے کئے کسی اور وعدے کو پورا کیا کریں گے۔جہاں اپنے آپ کو مردِ مومن اور مردِ حق کہلوانے والا قوم سے جھوٹے وعدے کی بنیاد پر تا مرگ اقتدار کی کرسی سے چپکا رہے۔جہاں سچ کہنے اور لکھنے والے کو پابند سلاسل کر دیا جاتا ہے کیونکہ سچ سننے کے لیے برداشت ہونی چاہیئے اور جھوٹے لوگ اس خوبی سے عاری ہوتے ہیں۔

یہ دو حروف کا ایک لفظ 'سچ' اپنے اندر بے پناہ طاقت سموئے ہوئے ہے مگر المیہ یہ ہے کہ ہم اس سے بہت دور ہو چکے ہیں اور اپنے روزمرہ کے عام معاملات میں جھوٹ کا اتنا استعمال کرتے ہیں کہ اب یہ ہماری عادت میں شامل ہو چکا ہے اور جھوٹ بولتے ہم کو یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہم اس برائی کے مرتکب ہو رہے ہیں جو تمام برائیوں کی جڑ ہے۔حتیٰ کہ اکثر وہاں بھی جھوٹ بول دیتے ہیں جہاں اس سے کسی قسم کا کوئی فائدہ بھی نہ ہوتا ہو۔

یہ سچ ہے کہ ہمارے معاشرے میں اب سچ بولنا آسان کام نہیں۔اور سچ سننا اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔اور سچ کا ساتھ دینا اس سے بھی کٹھن کام ہے جبکہ حق کی بات پر ڈٹے رہنا مشکل ترین......! آج ہم کو تین دن سچ بولنا اور صرف سچ کا ساتھ دینا

پڑ جائے تو شاید یہ تین دن ہم کو زندگی کے مشکل ترین دن تصور ہونگے۔اس کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب ہم اپنے ملک سے باہر نکلیں۔کنوئیں کے مینڈک کی طرح ہم جب تک اپنے ملک میں رہتے ہیں تو اس برائی کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ترقی یافتہ ممالک میں جھوٹ کا عملی زندگی میں وہ تناسب ہے جو ہمارے معاشرے میں سچ کا ہے۔یہ ان کے عروج اور ہمارے زوال کا ایک بہت بڑا سبب ہے۔ہم آج تباہی کے دہانے پر ہیں اور بیرونی ممالک میں ہماری بات کا نہ تو کوئی تحقیق کے بغیر اعتبار کرتا ہے اور نہ ہی کوئی ہماری کسی ڈگری اور دستاویز کو سچائی کی کسوٹی پہ پرکھے بغیر درست مانتا ہے۔ہم بیرون ممالک آ کر بھی کافی دیر تک اس برائی یا عادت سے اپنے آپ کو آزاد نہیں کر پاتے۔ہماری اور ہمارے ملک کی بقاء اسی میں ہے کہ ہم برائیوں کی جڑ جھوٹ کو اکھاڑ پھینکیں۔سچ بولیں، سچ سننے کا حوصلہ پیدا کریں اور حق کا ساتھ بلا امتیاز دیں۔

روزنامہ ''دن'' لاہور 2 مئی 2011ء

قابل غور

☆ اس کی دوا ہے نہ دارو------!صرف آپریشن ہی اس کا واحد حل ہے اور وہ بھی جہاں سے ''خس'' برآمد ہو وہاں کا آپریشن------! اس آپریشن کی انفرادیت یہ ہے کہ سرجن اپنی مرضی سے مریض اور مرض والی جگہ ڈھونڈتا ہے اور اسے جب چاہے آپریشن تھیٹر بنالیتا ہے اور کبھی مریض یا

اس کے لواحقین سے اجازت لینا تو دور کی بات۔۔۔۔۔۔

☆ دوران آپریشن جاں بحق ہونے بلکہ کر دینے کی صورت میں لاش نہ تو ورثہ کے حوالے کی جاتی ہے اور نہ کسی کو دکھائی جاتی ہے۔

☆ جب اسامہ بن لادن کو پکڑنے کی باری آئی تو بازی امریکی فوج لے گئی۔۔۔۔۔۔!!! یہ تو ایسا ہی ہے کہ ”کھان پین نوں باندریاں تے مارکھان نوں ریچھ“۔۔۔۔۔۔!

☆ تو کیا وجہ ہے کہ امریکیوں کو تو اسامہ بن لادن کی خوشبو ایک دہائی گزر جانے کے بعد ایبٹ آباد لے آئی مگر ہمیں کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ کیا اس کے پیچھے کوئی لمبی پلاننگ تو نہیں؟

❁۔۔۔۔۔۔❁۔۔۔۔۔۔❁

خس کم جہاں پاک

دنیا کا ہر ملک کسی نہ کسی چیز میں خود کفیل ہوتا ہے اور بعض ممالک کسی خاص شئے میں اتنے مالامال ہوتے ہیں کہ وہ اس کو دوسرے ممالک میں برآمد کر کہ زرمبادلہ کما کر اپنی معیشت کو مضبوط کرتے ہیں۔ کوئی تیل بیچتا ہے تو کوئی اسلحہ، کوئی گاڑیاں برآمد کرتا ہے تو کوئی الیکٹرونک اور الیکٹرک کے آلات، کوئی اناج بیچ کر تو کوئی جہاز۔۔۔۔۔۔ غرض ہر ملک کی کوئی نہ کوئی خاص شئے اس کی دنیا میں پہچان بن جاتی ہے۔ ہمارے دیس کو دنیا میں بریکنگ نیوز کا سرچشمہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں جس کا میڈیا ہمارے ملک سے اچھی طرح واقف نہ ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ خبروں کی بڑی تعداد منفی اور دکھ دینے والی ہی ہوتی ہے۔ 9/11 ہو یا 7/7 ممبئی میں کچھ ہو یا کرکٹ کے میدان میں، کھلاڑیوں پر بندوق سے حملہ ہو یا کسی سیاسی شخصیت پر خود کش۔۔۔۔۔۔ سب کی جڑیں اس زمین میں ہی تلاش کی جاتی ہیں۔ کافی دیر سے ہمارے ملک کو دہشت گردی کا لیبل چسپاں کرنے کی بین الاقوامی سازشیں بڑی پلاننگ اور مکاری سے جاری ہیں۔ نیٹو فورسز کو کسی بھی شخص کا نام لے کر کسی بھی اسلامی ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے کی جیسے عادت پڑ چکی ہے۔ کبھی صدام کے نام پر عراق، کبھی قذافی کے نام پر لیبیا اور کبھی اسامہ کے نام پر افغانستان اور پاکستان۔۔۔۔۔۔!

ایک دھائی کی انتھک کوششیں آخر کار رنگ لے آئیں اور امریکی سپاہ اسامہ بن لادن کو ہلاک کر کے دنیا اور اپنی قوم کے سامنے سرخرو ہونے میں کامیاب قرار پائی۔ بالآخر دنیا کے مطلوب ترین شخص کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کا امریکی اعلان منظرِ عام پر آ ہی گیا!

”خس کم جہاں پاک“۔۔۔۔۔۔ کاش! ایسا ہو سکتا مگر نہیں اس ”خس“ کا تو محض بہانہ تھا۔ مگر یہ خس تو امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے گلے میں ایک دہائی تک چبھتا رہا

ہے اور اب اس سے نجات تو مل گئی مگر اتنے سال گلے میں چھپتے رہنے کی وجہ سے "خس" سے بری طرح گھائل کر دیا ہے سو یہ زخم ایک تو اندرونی اور دوسرا دس سال پرانا ہے۔لہٰذا صرف اس "خس" سے خلاصی ہونے سے کام نہیں بنے گا اور نہ ہی عام مرہم اور دوا لگانے سے صحت یابی کا امکان ہے.....! اس کی دوا ہے نہ دارو.....!صرف آپریشن ہی اس کا واحد حل ہے اور وہ بھی جہاں سے "خس" برآمد ہوا وہاں کا آپریشن.....!اس آپریشن کی انفرادیت یہ ہے کہ سرجن اپنی مرضی سے مریض اور مرض والی جگہ ڈھونڈتا ہے اور اسے جب چاہے آپریشن تھیٹر بنا لیتا ہے اور کبھی مریض یا اس کے لواحقین سے اجازت لینا تو دور کی بات.....دوران آپریشن جاں بحق ہونے بلکہ کر دینے کی صورت میں لاش نہ تو ورثہ کے حوالے کی جاتی ہے اور نہ کسی کو دکھائی جاتی ہے۔ البتہ سمندری جانوروں کی بھوک کا احساس کرتے ہوئے فوراً اُن کے حوالے کر دی جاتی ہے۔کوئی پوچھنے کی جرات بھی نہیں کرتا کہ آپ نے ہماری سرزمین کو ڈوعہ بنا کر ہمیں مشکوک بنا دیا ہے بلکہ الٹا سب آمین کہہ کر ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں۔

اب آگے آگے دیکھئے کیا ہوتا ہے۔9/11 کے بعد دنیا کی سب سے بڑی بریکنگ نیوز جس کو امریکی مرد اول نے خود بریک کیا.....!!!اسامہ بن لادن کو پاکستان میں امریکی فوجیوں نے آپریشن کے دوران مار دیا۔یہ خبر کیا بریک ہوئی کہ پوری دنیا کے میڈیا کی باقی سب خبروں پر جیسے اوس پڑ گئی ہو اور ہمارے دیس کا نام دنیا کے ہر چینل پر آ گیا۔

پاکستان جو دہشت گردی کے خلاف اس پرائی جنگ میں سب سے بڑا حلیف ہے اور اس کو سب سے زیادہ جانی اور مالی نقصان بھی ہوا۔اس نے اپنی تمام سیکورٹی اور خفیہ ایجنسیز کو اس "کارِ خیر" میں ہمہ وقت مصروف رکھا اور بیچاروں کو سب سے زیادہ خود کش حملہ آوروں نے ہدف بھی بنایا۔اور ہوا کیا.....؟ جب اسامہ بن لادن کو پکڑنے کی باری آئی تو بازی امریکی فوج لے گئی.....!!! یہ تو ایسا ہی ہے کہ "کھان چین نوں باندریاں تے مار کھان نوں ریچھ".....! اب تو لگتا ہے کہ اس ریچھ کو اور بھی مار پڑنے

والی ہے۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ باندریاں ان ریچھوں کی وفا اور محنت کا صلہ جنگل کے بادشاہ سے ناک میں نکیل ڈلوا کر اس کو سدا کے لیے اپنا غلام نہ بنائیں کیونکہ جنگل کے بادشاہ سے ان کا بڑا قریبی تعلق ہے۔

اسامہ بن لادن جو کبھی امریکہ کا سپاہی، مجاہد اور آنکھ کا تارا تھا۔امریکہ نے اپنا کام لے لیا تو یہی آنکھ کا کنکرہ بن گیا اور لمحوں میں مجاہد سے دہشت گرد بنا دیا گیا۔اسامہ کی ہلاکت کوئی عام سی بات نہیں بلکہ اس کے درپردہ کافی سوالات ہیں جن کا جواب اکثریت کے علم میں ہے اور بچ جانے والوں کو کچھ وقت گزر جانے کے بعد معلوم ہو جائے گا۔کیا وہ واقعی ہی اسامہ بن لادن تھا؟ اگر وہ اسامہ بن لادن تھا تو اس کی لاش کو منظرِ عام پر کیوں نہیں لایا گیا؟ اس کی نعش کو سمندر برد کرنے کی کیا جلدی تھی؟صدام حسین کو تو زمین کی تہہ سے زندہ پکڑا اور سارے منظر کو ریکارڈ بھی کیا گیا تھا اور عدالتی کارروائی سے لے کر پھانسی تک کے مناظر دکھائے گئے۔اسامہ بن لادن تو صرف چند رفقاء کے ساتھ ایبٹ آباد کے ایک گھر میں تھا اور اس کو تو دو درجن کمانڈوز کے ساتھ زندہ پکڑا جا سکتا تھا اور اس پر بھی عدالتی کارروائی کر کے سزا دی جا سکتی تھی۔ اس سے تمام شکوک و شبہات ختم ہو جاتے.....!اگر وہ اسامہ بن لادن تھا تو کیا مقامی لوگوں اور خفیہ اداروں کو پتہ ہی نہیں چلا۔ایبٹ آباد تو ویسے ہی دہشت گردی کے واقعات کے بعد حساس علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔جہاں پر پاکستان ملٹری اکیڈیمی بھی ہے اور اسلام آباد بھی اتنا دور نہیں۔تو کیا وجہ ہے کہ امریکیوں کو تو اسامہ بن لادن کی خوشبو ایک دہائی گزر جانے کے بعد ایبٹ آباد لے آئی مگر ہمیں کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ کیا اس کے پیچھے کوئی لمبی پلاننگ تو نہیں؟بن لادن کی ہلاکت سے کس کو کیا فائدہ ہوا اور کس کو کیا نقصان ہو گا؟ہمارے لیے تو سب سے بڑا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ وہ ہمارے ملک میں فوجی ٹریننگ سنٹر کے قریب امریکی فوج کے ہاتھوں مارا گیا۔صرف براک اوبامہ کے کہنے پر ہم یقین کر لیں کہ بن لادن اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ایسے تو پہلے بھی ہو چکا ہے اور اسامہ بن لادن دوسرا اور پھر تیسرا جنم لے کر امریکی صدور کی مشکل کشائی کے

وقت آ پہنچتا ہے۔ جیسے زندہ ہاتھی لاکھ کا اور مرا سوا لاکھ کا ہو......! کہیں اس ہاتھی کو پاکستان میں مار کر کچھ زیادہ قیمت نہ مانگ لی جائے اور do more کی پالیسی کو ٹاپ گیئر میں ڈال کر گاڑی بھگانے کو نہ بول دیا جائے۔ کیا اس کو پاکستان میں مارنے کا ڈرامہ رچا کر خاص نتائج حاصل کرنے کی پلاننگ تو نہیں؟ آئندہ الیکشن میں براک اوبامہ کو یہ مرا ہاتھی مزید پانچ سال سفید مکان میں رہنے کا حقدار نہ بنا دے؟ پاکستان کی خفیہ اور سیکورٹی اداروں پر بھی ایک سوالیہ نشان بنانے کی پلاننگ تو نہیں؟ اس طرح کے کئی اور سوالوں کا جواب آئندہ آنے والا وقت ہی بتائے گا لیکن ہمارے لیکن اب اپنی خارجہ پالیسی تشکیل دینے کے لیے بہت سے مشکلات منتظر ہیں۔

روزنامہ ”دن“ لاہور 7 مئی 2011ء

دی نیشن لندن 20 مئی 2011ء

❀-----❀-----❀

قابل غور

☆ 12 مئی کو چیف جسٹس آف پاکستان افتخار محمد چوہدری کی آمد پر خونریزی کی گئی مگر اب تو حق پرستوں کا یہ حق ہے کہ وہ کراچی اور سندھ کے علاقوں میں اپنے حریفوں کو خود جلسہ عام کرنے کی دعوت دیں اور حسن سلوک میں خود کو مہاجر کی بجائے انصار ثابت کر کے دکھائیں۔

☆ انسان تو غلطی کا پتلا ہے اور ہم میں اور کوئی مثبت صفت ہو نہ ہو مگر معاف کرنے کی بلکہ پہ در پہ معاف کرنے کی صفتِ الٰہیہ سب میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

☆ اس گاؤں میں یہ آفت میری وجہ سے نہیں آئی بلکہ ان لوگوں کے اپنے اعمال کی وجہ سے ہے جو حق کا ساتھ دینے کی جرأت نہیں کرتے۔

☆ جب عوام کا ضمیر بیدار ہو اور ووٹ دیتے وقت ضمیر کی آواز سنیں۔ کسی الومیاں یا الو کے پٹھے کو اس لیے ووٹ نہ دیں کہ وہ اپنا ہے اور کل کو کسی کام آئے گا۔ ایم کیو ایم کی اچھی بات یہ ہے کہ ان کے پاس اکثریت اصلی ڈگری والے تعلیم یافتہ سیاسی رہنماؤں کی ہے جن کا تعلق متوسط گھرانوں سے ہے۔

❁---❁---❁

مہاجروں سے انصاروں کا حسن سلوک

ایم کیو ایم نے لاہور میں استحکام پاکستان کے نام سے جلسہ کر کہ یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان کا دائرہ اثر اب پنجاب تک آ پہنچا ہے۔ الطاف حسین کو مبارک باد وصول کرنے سے پہلے تو زندہ دلان لاہور اور صوبائی و وفاقی حکومت کا شکریہ ادا کرنا چاہئے جن کی معاونت سے یہ جلسہ منعقد ہوا۔ سیکیورٹی انتظامات، میڈیا کوریج اور نظم وضبط سب میں حکومتی ساتھ شامل رہا اور کسی نے رنگ میں بھنگ ڈالنے کی کوشش نہیں کی۔ کیا ایم کیو ایم یہ قرض اتار سکے گی؟ کراچی سمیت سندھ کے دوسرے شہروں میں مولانا صاحب اور عمران خان کو تو اس کی اجازت نہ دی گئی۔ 12 مئی کو چیف جسٹس آف پاکستان افتخار محمد چودھری کی آمد پر خونریزی کی گئی مگر اب تو حق پرستوں کا یہ حق ہے کہ وہ کراچی اور سندھ کے علاقوں میں اپنے حریفوں کو خود جلسہ عام کرنے کی دعوت دیں اور حسن سلوک میں خود کو مہاجر کی بجائے انصار ثابت کر کہ دکھائیں۔ جہاں تک ووٹ پڑنے کا تعلق ہے تو اس میں ہماری عوام بڑی مستقل مزاج ہے اور ہمیشہ آزمائے کو ہی بار بار آزماتی ہے۔ اس فارمولے پر فرزندان و دختران ملت روز اول سے کاربند ہیں۔ چور ہو یا ڈاکو، لٹیرا ہو یا رسہ گیر، جاہل ہو یا جعلساز، غدار ہو یا بدمعاش اس سے ان ووٹر صاحبان کا کوئی تعلق نہیں۔ بس اپنا کام چلنا چاہیے بندہ وہ ہو جو کل کو کام تو آئے، بھلا یہ کردار اور سوچ میں کیا رکھا ہے؟ انسان تو غلطی کا پتلا ہے اور ہم میں اور کوئی مثبت صفت ہو نہ ہو مگر معاف کرنے کی بلکہ پہ در پہ معاف کرنے کی صفتِ الٰہیہ سب میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ جب ہم درگزر اور معافی کی صفت کا کبھی بھی ختم نہ ہونے والا ذخیرہ رکھتے ہیں تو پھر ایم کیو ایم کو کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟ جس کے پاس حوصلہ اور ورکرز ہیں کراچی اور سندھ کے دیگر علاقوں میں جلسہ کرے۔ ایم کیو ایم کے ووٹ تو پکے بلکہ بہت ہی پکے ہیں......!

ہنسوں کا ایک جوڑا پیار کی باتیں کرتا محو پرواز تھا کہ اچانک اُن کی نظر نیچے ایک گاؤں پر پڑی۔جسے افسردگی، بھوک،افلاس اورمردگی نے کسی ماں کی طرح آغوش میں لیا ہوا تھا۔ہریالی نام کی کوئی شے ڈھونڈے سے نظر نہ آرہی تھی۔ہر طرف نحوست ہی نحوست چھائی تھی۔اتنے میں ان کی نظر ایک سوکھے درخت کی شاخ پر بیٹھے الو پر پڑی۔اس کو دیکھ کر ہنس نے اپنی مادہ سے کہا: "ہو نہ ہو اس گاؤں میں اس نحوست کا ذمہ دار یہ الو ہی ہوسکتا ہے۔جس کی نحوست سے سارا گاؤں آسیب زدہ دکھائی دے رہا ہے"۔
الومیاں نے ان کی بات سنتے ہی کہا: "مجھ سے اس کا جواب بھی لیتے جاؤ"۔ہنسوں کا جوڑا بھی اس کے ساتھ سوکھی شاخ پر آ کر بیٹھا ہی تھا کہ الومیاں نے جھٹ سے ہنس کی مادہ کو دبوچ لیا اور اس کو کہا کہ "یہ تو میری مادہ ہے۔تم اب بھاگ جاؤ"۔ہنس نے کہا کہ "یہ کیسے ہوسکتا ہے......تم الو اور یہ ہنسنی......!" الومیاں نے کہا چلو اس کا فیصلہ ابھی کروا لیتے ہیں۔الومیاں نے سب گاؤں والوں کو اکٹھا کر لیا اور لگا پوچھنے کہ آپ گاؤں کے معزز لوگ ہیں بتائیں یہ مادہ کس کی ہے؟ سب کو صاف نظر آ رہا تھا کہ الومیاں جھوٹا اور ہنس سچا ہے مگر انہوں نے سوچا کہ ہنس تو باہر سے آیا ہے۔الومیاں چاہے غلط ہی سہی مگر ہے تو اپنے گاؤں کا۔اگر حق کا ساتھ دیا تو ہنس کو فائدہ ہوگا۔بھلا اس کے فائدے سے ہمیں کیا فائدہ؟ الو چاہے جھوٹا ہی سہی مگر اپنے گاؤں کا تو ہے کل کو ہمارے کسی کام تو آ سکتا ہے۔یہ سوچ کر سب گاؤں والوں نے ووٹ الومیاں کے حق میں دیا اور چلے گئے۔
ہنس بیچارہ آبدیدہ ہوگیا۔یہ دیکھ کر الومیاں نے ہنستے ہوئے اُسکی مادہ کو کہا کہ اب پتہ چل گیا ہوگا کہ اس گاؤں میں یہ آفت میری وجہ سے نہیں آئی بلکہ ان لوگوں کے اپنے اعمال کی وجہ سے ہے۔جو حق کا ساتھ دینے کی جرأت نہیں کرتے۔یہ لو اپنی مادہ اور آئندہ کبھی اس طرف نہ آنا۔

بس ہمارے دیس کا حال بھی ان گاؤں والوں کی طرح ہے۔جن کو معلوم ہے کہ کون صحیح اور کون غلط......! مگر پھر بھی حق کا ساتھ نہیں دیتے۔اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وزیراعظم گیلانی صاحب کہہ دیتے ہیں کہ سیاستدانوں کو عوام منتخب کرتے ہیں ان کو کسی

سے سرٹیفکیٹ لینے کی ضرورت نہیں......! تو بجا فرماتے ہیں جناب وزیراعظم......! ان کو لانے والے ہم ہی تو ہیں۔سو ہمیں الومیاں کو قصوروار نہیں ٹھہرانا چاہیے کہ یہ سب ہمارے اپنے عمل کا نتیجہ ہے۔
ایم کیوایم نے تو استحکام پاکستان کا لاہور میں جلسہ کر یہاں کی قیادت کو خبردار کر دیا ہے اور ہوسکتا ہے کہ اب کی بار الومیاں کو منہ کی کھانی پڑے۔وہ صرف اسی صورت میں ممکن ہوسکتا ہے جب عوام کا ضمیر بیدار ہو اور ووٹ دیتے وقت ضمیر کی آواز سنیں۔کسی الومیاں یا الو کے پٹھے کو اس لیے ووٹ نہ دیں کہ وہ اپنا ہے اور کل کو کسی کام آئے گا۔ایم کیوایم کی اچھی بات یہ ہے کہ ان کے پاس اکثریت اصلی ڈگری والے تعلیم یافتہ سیاسی رہنماؤں کی ہے جن کا تعلق متوسط گھرانوں سے ہے۔سب بہت منظم اور اپنے قائد کی اک آواز پر کان کھول کر اور آنکھیں بند کر لبیک کہتے ہیں۔یہی نہیں اطاعت میں تو جذبہ یہ ہے کہ اگر کوئی آن ایئر بھی ان کے قائد کو کچھ کہہ دے تو یہ ٹی وی پر ہی اس کو جان سے ماردینے کی دھمکی دینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔خود کو پچاس سال تک پاکستان میں رہ کر اپنے آپ کو مہاجر کہنے اور لسانیت کی بنا پر پارٹی بنانے والے جب لاہور آئے تو اہلیانِ لاہور نے ان سے انصاروں والا برتاؤ کیا ہے مگر کیا کراچی اور سندھ کے علاقوں میں عمران خان نیازی، مولانا صاحب اور افتخار محمد چوہدری مہاجر بن کر بھی داخل ہوں تو یہ کچھ دیر کے لیے انصار نہیں بن سکتے؟
دیر آید درست آید ان کو یہ احساس تو ہوگیا کہ مہاجر کا نعرہ لگا کر وہ اپنے عام کو خاص علاقے اور طبقے تک محدود کر رہے تھے۔لہٰذا کل کی مہاجر قومی موومنٹ نے آج کی متحدہ قومی موومنٹ بن کر لاہور میں بھی اپنے منشور کا اعلان کر دیا ہے۔کراچی کا نقشہ تو ایم کیوایم نے خوب بدلہ......مگر متحدہ سے ایک درخواست ضرور ہے کہ پہلے کراچی کو متحد کرلیں جہاں لسانیت کی بنیاد پر ٹارگٹ کلنگ کا اک لامتناہی سلسلہ قابو میں ہی نہیں آ رہا۔جیسے خود پنجاب کے دارالحکومت لاہور میں جلسہ کیا خواہ کتنے ہی افراد کو کراچی اور حیدرآباد سے امپورٹ کرنا پڑا۔بلاشبہ ایم کیوایم کا ہمیشہ سے ہی دہشت

گردی، جاگیردارانہ نظام اور اقلیتوں کے مساوی حقوق کا موقف بڑا واضح رہا ہے۔ان میں موروثی سیاست کے جراثیم بھی نہیں۔ قائد تحریک سمیت بہت سے رہنما اس پارٹی میں ایسے موجود ہیں جو 70 گز کے پلاٹ میں رہ کر جوان ہوئے اور ہنڈا 50 یا منی بس میں بیٹھ کر کالج اور یونیورسٹی جاتے رہے ہیں۔گلی محلوں کی سیاست سے ہو کر اوپر تک آئے ہیں۔لہٰذا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ عوامی لوگ ہیں اور عام لوگوں کے مسائل کو بخوبی سمجھتے ہیں مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنے رویے میں نرمی، عاجزی اور انکساری لائیں۔ملکی مفادات کی خاطر جارحانہ اندازِ سیاست اور بندوق کی زبان میں مکالمہ ختم کرنا ہوگا اور سب سے اہم بات کہ اپنے حریفوں کو بھی کھلے دل سے برداشت کرنے کا مادہ پیدا کریں کیونکہ اتحاد کبھی بھی برداشت کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا۔

دی نیشن لندن 6 مئی 2011ء

قابل غور

☆ معین اختر جس نے اپنے فنی سفر کا آغاز ۱۹۶۶ء میں صرف ۱۶ برس کی عمر میں پی ٹی وی سے کیا اور اس کے بعد فن کی تمام بلندیوں کو چھو کر ساڑھے چار دہائیاں تک فن کی دنیا پر حکومت کرتا رہا۔

☆ وہ اردو، انگریزی، بنگالی، سندھی، پنجابی، میمن، پشتو، گجراتی اور کئی زبانیں بھی بڑی مہارت سے بولتا تھا۔

☆ انور مقصود فن کا وہ سپہ سالار ہے جس نے معین اختر اور بشریٰ انصاری کو تلوار اور ڈھال کے طرح استعمال کر کے فن کے میدان میں اب تک بڑی شان سے فتح یاب ہوتا رہا۔

☆ ورنہ حال ہی میں مستانہ اور ببو برال اور ماضی میں کئی معروف سٹار اور سپر اسٹارز علاج کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اپنی جان کی امانت خدا کے سپرد کرتے نظر آئے۔

☆ المیہ یہ ہے کہ کوئی اچھا انسان جاتا ہے تو اس کا نعم البدل کتنی دہائیوں تک نہیں ملتا جبکہ کوئی شیطان صفت اس دنیا سے جائے اس کے خلاء کو پر کرنے والے سینکڑوں آ جاتے ہیں۔

مزاح کے چمن میں خزاں کی آمد

مزاح کے چمن میں جیسے خزاں کا موسم آ گیا ہو۔ یکے بعد دیگرے ہنستے مسکراتے پھول مرجھا مرجھا کر گرنا شروع ہو گئے۔ لیاقت سولجر، مستانہ، ببو برال اور اب معین اختر...... بھی اپنی فن کی یادوں کا وسیع خزانہ چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ معین اختر جس نے اپنے فنی سفر کا آغاز ۱۹۶۶ء میں صرف ۱۶ برس کی عمر میں پی ٹی وی سے کیا اور اس کے بعد فن کی تمام بلندیوں کو چھو کر ساڑھے چار دہائیاں تک فن کی دنیا پر حکومت کرتا رہا۔ اس کی ذہانت اور قابلیت کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اردو، انگریزی، بنگالی، سندھی، پنجابی، میمن، پشتو، گجراتی اور کئی زبانیں بھی بڑی مہارت سے بولتا تھا۔

ٹی وی، سٹیج اور فلم کا معروف اداکار، آل ٹائم بہترین کامیڈین، اعلیٰ پایہ کا میزبان، مصنف، ہدایتکار، پیشکار، گلوکار...... اور شاید ہی فنی دنیا کا کوئی شعبہ ایسا ہو جو معین اختر سے بچا ہو۔ وہ ان فنکاروں میں سے ایک تھا جو بیک وقت کئی خوبیوں کے مالک ہوتے ہیں اور ہر خوبی میں اپنی مثال آپ ہوتے ہیں یعنی وہ فن کی دنیا کا عظیم آل راؤنڈر تھا۔ ون مین شو ہو یا ٹیم شو ہر اک کو وہ بلا کی خوبصورتی سے نبھاتا تھا کہ دیکھنے والے کو کردار میں کبھی معین اختر کی جھلک نظر نہ آئی بلکہ ان کو حقیقی کردار ہی نظر آیا اور ہر بھیس، لباس، حلیے اور زبان میں کردار نبھائے حتیٰ کہ مس روزی کے کردار میں بھی صنف نازک فنکاراؤں کو ان سے جلن ہونا شروع ہو گئی کہ اب ان کا کیا بنے گا۔ ان کی ٹیم میں بشریٰ انصاری اور انور مقصود قابل ذکر ہیں۔ جنہوں نے مل کر نہ جانے کتنے پروگرامز کیے۔ انور مقصود فن کا وہ سپہ سالار ہے جس نے معین اختر اور بشریٰ انصاری کو تلوار اور ڈھال کے طرح استعمال کر کے فن کے میدان میں اب تک بڑی شان سے فتح یاب ہوتا رہا۔ اب

اس میں یہ جاننا مشکل ہے کہ تلوار کون ہے اور ڈھال کون؟ بڑی بڑی شخصیات کے بڑے پر اعتماد طریقے سے انٹرویوز کیے اور کسی کو بھی کاپی کرنے میں اس کو کوئی مسئلہ نہ تھا۔

زندگی تو اللہ تعالیٰ کی وہ امانت ہے جس کو ہر کسی نے ایک نہ ایک دن واپس لوٹانا ہے۔خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اس امانت کو دنیا کی کج روی اور حالات کی ستم ظریفی دیکھنے سے قبل ہی واپس لوٹا دیں۔اس لحاظ سے معین اختر کے بخت اچھے تھے کہ اس کو یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوا اور وہ ہم کو داغ مفارقت دے کر چپ چاپ مگر شان سے ۲۲ اپریل کو اس دنیا فانی سے کوچ کر گیا۔ورنہ حال ہی میں مستانہ اور ببو برال اور ماضی میں کئی معروف سٹار اور سپر اسٹارز علاج کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اپنی جان کی امانت خدا کے سپرد کرتے نظر آئے۔یہ المیہ ہے کہ مصیبت کی چکی میں پھنسے ہوئے کروڑوں لوگوں کو ہنسا کر وقتی طور پر ان کے غموں کے نجات دہندہ بننے والے جب خود مصیبت میں آتے ہیں تو ان کروڑوں میں سے کوئی درجنوں بھی ایسے نظر نہیں آتے جو ان کے زخموں پر پیار کا مرہم رکھے۔جو ان کے غموں کی اتھاہ گہرائیوں میں سے خوشی کی چند موتی تلاش کر کے ان کو دے سکیں۔مالی مدد تو دور کی بات ایسے موقع پر پیار بھری اور دعاؤں کا صدقہ دینے کو بھی کوئی نہیں آتا۔ماضی میں فن کے افق پر چمکنے والے سپر اسٹارز مہدی حسن اور لہری کا حال بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔

روتے آئے اور...... رلا کر چل دیئے
زندگی ہے بس...... رونے رلانے کا نام

اس رونے رلانے کی دنیا میں حقیقتاً ہنسنے ہنسانے والے لوگ بہت کم ہیں۔انسان کو خوش کرنا کوکہ مشکل ترین کام ہے مگر معین اختر کو یہ ملکہ حاصل تھا کہ وہ ہر قسم کے انسان کو اپنے فن کے سحر میں ایسا مسحور کرتا کہ بندہ ہنسنے پہ مجبور ہو جاتا تھا۔یوں دیکھیں تو انسان کو خوش کرنا خدا کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنا ہے۔لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ معین اختر ۴۵ سال تک اپنے اعمال نامے میں نیکیاں لکھواتا رہا۔وہ جتنا بڑا فنکار تھا اسی پایہ کا بلند کردار کا انسان بھی تھا۔اللہ تعالیٰ نے اس کو بڑی عزت سے نوازہ اور

موجودہ دور کے تمام بڑے ایوارڈز اس کے حصے میں آئے۔اس نے جس شعبے میں بھی ہاتھ ڈالا اپنی محنت، قابلیت اور دعاؤں سے اپنا لوہا منوایا۔جس طرح دیسی گھی کا تڑکہ عام ذائقہ پکوان کے ذائقے کو بھی چار چاند لگا دیتا ہے اسی طرح فن کے پکوانوں کو معین اختر کی اداکاری کا تڑکہ لگ جاتا تو بے جان سکرپٹ بھی چٹ پٹا بن جاتا کہ دیکھنے والے اسے مدتوں فراموش نہ کر پاتے اور بار بار دیکھ کر بھی دل نہ بھرتا۔ہر کردار کی کھال میں گھس کر پرفارم کرنا اس کا طرہ امتیاز تھا۔

المیہ یہ ہے کہ کوئی اچھا انسان جاتا ہے تو اس کا نعم البدل کتنی دہائیوں تک نہیں ملتا جبکہ کوئی شیطان صفت اس دنیا سے جائے اس کے خلاء کو پر کرنے والے سینکڑوں آ جاتے ہیں۔مزاح کے بے تاج شہنشاہ منور ظریف، ننھا، لیاقت سولجر، مستانہ، ببو برال اور اب معین اختر...... باری باری چلے گئے مگر ان کا خلاء پر کرنا بڑا مشکل ہے۔اس عظیم فنکار کی نماز جنازہ بھی اک فنکار جمشید جنید نے ہی پڑھائی......

اذان سے شروع ہوئی نماز پہ ختم
دور حیات ایک صلوۃ ہی تو ہے

ایسے بہت سے فنکار اور کھلاڑی اور زندگی کے دوسرے شعبہ جات سے تعلق رکھنے والے لوگ جو کبھی پاکستان کا نام روشن کرتے تھے۔حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہو کر خستہ حالی، تنگدستی، اور بھوک افلاس کے شکنجے میں ایسا آئے کہ ان کو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے پر مجبور ہونا پڑا یا اس وقت بھی وہ غیرت کی بوسیدہ چادر اوڑھے گھر کی چار دیواری میں مقید ہو کر اپنے آخری وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔ویسے آج تک کسی سابقہ جرنیل، جوائنٹ سیکریٹری یا کسی سابقہ ایم این اے یا ایم پی اے کو اس حالت میں نہیں دیکھا گیا...... اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

اس لیے فنکاروں اور زندگی کے دوسرے شعبہ جات کے لوگوں کو اب کچھ سبق لینا چاہیے اور مستقبل کے لیے کوئی ایسا لائحہ عمل تیار کرنا چاہیے کہ کم از کم کوئی فنکار اور کھلاڑی آئندہ علاج کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایڑیاں رگڑتا ہوا دم نہ توڑے۔ان کو

آپس میں مل کر کوئی ایسی انجمن بنانی چاہیے جو مصیبت زدہ فنکاروں کی فلاح بہبود کی کیے کام کرے۔برا وقت کسی پر بھی آ سکتا ہے اور کم از کم جو اچھے دنوں کے ساتھی ہوں وہ تو آگے بڑھ کر ان کے دکھوں کا مداوہ کریں۔ضرورت پڑنے پر باہر آئیں اور اسی عوام الناس میں جہاں یہ کبھی خوشیاں بانٹتے تھے مدد کی اپیل کریں۔تا کہ آئندہ کسی فنکار کے ساتھ ہو برا ل اور ستانے والا حال نہ ہو۔آج بھی لہری زندگی اور موت کی جنگ ایک بند کمرے میں اکیلا ہی لڑ رہا ہے اور کتنے اس کے ساتھی فنکار ہیں جو اس کے لیے سوچتے ہیں؟اگر آج وہ آگے بڑھیں گے تو ہو سکتا ہے کل ان کے لیے بھی کوئی قدم اٹھائے گا۔

روزنامہ ”دن“ لاہور 12 مئی 2011ء

دی نیشن لندن 10 جون 2011ء

قابل غور

☆ محنت ،لگن اور دعاؤں کی کشتی سے ہم مایوسی کا ہر دریا حوصلے کے چپو چلا کر پار اتر سکتے ہیں۔

☆ آپ ہمارے لیے باعث افتخار ہیں کہ آج تک دنیا میں آپ واحد نابینا انسان ہیں جو بیرسٹر ڈاکٹر آف سول لاء

بن پائے۔ آپ نوجوانی کے ایام میں بصارت سے محروم ہو گئے مگر آپ نے بصیرت کے چراغ ہمیشہ کے لیے روشن کر لیے۔

☆ علم کی پوزیشنوں کی اس دوڑ میں انہوں نے آنکھوں والوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا اور یہ بھی ہمارے لیے اعزاز کی بات ہے کہ علم کی اس دوڑ میں انگلینڈ کے بینا گورے بھی ان سے مات کھا گئے۔

☆ بصارت سے محروم ہونے کے باوجود اگر کوئی شخص انسانی دکھ کو محسوس کر کے ان کی بھلائی کے لیے مثبت قدم اٹھا سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے تو ہم کو بصارت جیسی انمول نعمت سے نوازا ہے۔

ایک پاکستانی جس پر ہم سب فخر کر سکتے ہیں

28 اپریل کی شام کو میں کونسلر مشتاق لاشاری کی دعوت پر دالعلم اسٹولندن کے اسمبلی ہال میں ایک چیریٹی ڈنر کی تقریب میں شرکت کے لیے گیا۔ہال میں داخل ہوا تو پورا ہال گول میزوں اور کرسیوں سے سجا تھا اور سٹیج پر موسیقی کے آلات بھی پڑے تھے۔ذہن میں تو تھا یہ ایک عام سا چیریٹی ڈنر ہوگا جس میں مہمانوں سے چندے کی اپیل کی جائے گی اور پھر کھانے کے بعد سب اپنے اپنے گھروں کو سدھار جائیں گے۔ مگر جب پروگرام کا باقاعدہ آغاز ہوا تو سارا میڈیا کوریج کے لیے موجود تھا اور وہاں میئر مسعود احمد، میئر اسد عمر، لارڈ کولن لاؤ، لارڈ جسٹس (ر) سٹیفن سیڈلے، کے علاوہ اور بہت سے V.I.Ps موجود تھے جن کا تعلق ہر نسل اور رنگ سے تھا۔جب مہمانان خصوصی کے تعارف کے بعد GOFUND کے بارے میں تفصیلاً بتایا گیا تو معلوم ہوا کہ پنجاب کے شہر گوجرہ میں آنکھوں کا ایک ہسپتال بنانے کا منصوبہ ہے جس پر ڈاکٹر صاحب کام کر رہے ہیں۔۔ پہلے تو یہ لگا کہ یہ بھی عمران خان اور ابرارالحق کی طرح کوئی سماجی سوچ والا شخص ہوگا جو رفاع عامہ کے لیے کچھ کرنا چاہ رہا ہے۔مگر یہ شخص عمران خان اور ابرارالحق اور کئی دوسری سماجی شخصیات سے بہت منفرد تھا۔جس کے تعارف سے میری سوچ کا زاویہ ہی بدل گیا۔مصیبتوں سے بھری اس دنیا میں ہم اکثر چھوٹی سی ناکامی سے مایوس ہو کر گناہ کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔حالانکہ ہم سب جانتے ہیں کہ مایوسی گناہ اور کفر ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے صرف کافر ہی مایوس ہوا کرتا ہے۔اس شخص کے بارے میں جان کر سب سے پہلے تو اس عہد کی تجدید کی کہ آئندہ کبھی ہمت نہیں ہارنی اور محنت، لگن اور دعاؤں کی کشتی سے ہم مایوسی کا ہر دریا حوصلے کے چپو چلا کر پار اتر سکتے ہیں۔اس متاثر کن اور باعث فخر شخصیت کا نام "ڈاکٹر عامر علی ماجد" ہے۔جو 17 سال کی عمر میں جب

وہ زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں طالبعلم تھے تو اپنی قوت بینائی سے محروم ہو گئے۔ مگر انہوں نے قدرت کے اس فیصلے کو اپنی قسمت سمجھ کر کھلے دل سے قبول کیا اور تاریخ میں اپنا نام اس رنگ سے لکھوایا کہ آپ کے ارادوں اور ہمت کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ اقبال کا یہ شعر شاید آپ کے لیے لکھا گیا تھا۔

ارادے جن کے پختہ ہوں نظر جن کی خدا پر ہو
طلاطم خیز موجوں سے وہ گھبرایا نہیں کرتے

آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کیا اور اس کے بعد ایل ایل بی آنرز، ایل ایل ایم (لندن)، ڈپلو مہ ان ایئر اینڈ سپیس لاء، (لندن انسٹیٹیوٹ آف ورلڈ افیرز)، ڈاکٹر آف سول لاء (Mcgill) بیرسٹر، قانون کی کتاب کے مصنف، ممبر آف ہائیر ایجوکیشن اکیڈمی، ہیومن رائٹس اور ڈس ایبلٹی لاء کے پروفیسر، امیگریشن جج، اور Gofund کے صدر ہونے کے علاوہ بہت سے اداروں میں اعلٰی عہدوں پر کام کیا۔ آپ کی گراں قدر خدمات کے اعتراف میں کئی بین الاقوامی ایوارڈز سے بھی نوازا گیا۔

آپ ہمارے لیے باعث افتخار ہیں کہ آج تک دنیا میں آپ واحد نابینا انسان ہیں جو بیرسٹر ڈاکٹر آف سول لاء بن پائے۔ آپ نوجوانی کے ایام میں بصارت سے محروم ہو گئے مگر آپ نے بصیرت کے چراغ ہمیشہ کے لیے روشن کر لیے۔ وہ ہمت اور حوصلے کی مشعل آنکھوں کی بجائے ذہن میں جلا کر دنیا کی دوڑ میں شامل ہو گئے اور دنیا کو بتا دیا کہ پڑھنے لکھنے کے لیے آنکھوں کی نہیں بلکہ جنون کی حد تک لگن کی ضرورت ہوتی ہے۔ علم کی پوزیشنوں کی اس دوڑ میں انہوں نے آنکھوں والوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا اور یہ بھی ہمارے لیے اعزاز کی بات ہے کہ علم کی اس دوڑ میں انگلینڈ کے بینا گورے بھی ان سے مات کھا گئے۔ اور آپ نے ہر امتحان میں امتیازی پوزیشن لی۔ فنی میدان میں جب پیشہ وارانہ صلاحیتیں اور مہارت دکھانے کا وقت آیا تو انہوں نے وہ گراں قدر خدمات سرانجام دیں کہ ہماری قوم کو ساری دنیا میں ایسے پاکستانی کا تعارف اور مثال دے کر سر فخر سے بلند کرنا چاہیے۔

انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اس دور میں جہاں ہمارے ملک میں محدود وسائل اور علمی پستی کی وجہ سے ہمارا شمار تیسری دنیا کے ممالک میں ہوتا ہے مگر ڈاکٹر صاحب نے تمام دنیا کو یہ دکھا دیا کہ پاکستانی کچھ کرنے پر آ جائیں تو ایسا بھی کر دیتے ہیں کہ آج تک دنیا میں کسی نے نہ کیا ہو......!! جہاں دنیا میں ہماری منفی تصویر کشی بڑی ہوشیاری سے کی جا رہی ہے۔ وہاں پر ہمارے میڈیا کا بھی یہ فرض بنتا ہے کہ ایسے کہنہ مشق اور گراں قدر انسان کی پذیرائی کریں۔ اس سے ان کی عزت افزائی تو ہو گی ساتھ بہت سے دوسرے ڈس ایبل اور نارمل لوگوں میں حوصلہ آئے گا اور کچھ کرنے کی، حالات سے لڑنے کی تحریک بھی پیدا ہو گی۔ اس سے دنیا میں ہمارا امیج بہتر ہو گا۔

ڈاکٹر صاحب کے اس نیک، سماجی اور رفاعی کام میں ہم سب کو بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے۔ انہوں نے فری آئی ہسپتال کا خواب اندھیرے میں ڈوبی آنکھوں کے ساتھ دیکھا ہے۔ ہم سب کو ان کا بھرپور ساتھ دینا چاہئے اور خاص طور پر میڈیا کو ان کا پیغام سب تک پہنچانا چاہئے۔ بصارت سے محروم ہونے کے باوجود اگر کوئی شخص انسانی دکھ کو محسوس کر کہ انکی بھلائی کے لیے مثبت قدم اٹھا سکتا ہے تو اللہ تعالٰی نے تو ہم کو بصارت جیسی انمول نعمت سے نوازا ہے۔ ہمیں بھی انسانوں کے دکھ نظر آنے اور محسوس ہونے چاہئیں۔ ان کے پاس اتنا سرمایہ نہیں مگر پھر بھی انسانیت کی خدمت کرنے کے لیے سرشار ہیں۔ اور ہم میں سے بہت سے ایسے ہیں جن کو اللہ تعالٰی نے مال و دولت سے خوب نوازا ہے اور وسائل بھی وافر مقدار میں دیئے ہیں تو ان کا بھی فرض بنتا ہے کہ اللہ تعالٰی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے خدا کی مخلوق کے کام آئیں۔ کیونکہ بعض اوقات اللہ تعالٰی دے کر آزماتا ہے کہ ہم اس کی راہ میں کتنا خرچتے ہیں اور کتنا شکر ادا کرتے ہیں اور بعض اوقات نہ دے کر بھی آزماتا ہے کہ ہم کتنا صبر اور قناعت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے اس خواب کو پورا کرنے کے لیے ہمیں ہر طرح سے مدد کرنی چاہئے۔ یہ مالی طور پر بھی ہو سکتی ہے، قلمی تقاضے پورے کر کے بھی ہو سکتی ہے، جسمانی طور پر بھی اپنی خدمات پیش کی جا سکتی ہیں، اپنے وسائل اور اثر و رسوخ کو

استعمال میں لا کر بھی اس کارِ خیر میں شامل ہوا جا سکتا ہے، میڈیا والے اپنا حصہ ان کا پیغام احسن طریقے سے لوگوں تک پہنچا کر ڈال سکتے ہیں۔ غرضیکہ ہر فرد اپنی صلاحیت اور استطاعت کے مطابق اگر ڈاکٹر صاحب کی مدد کر دے تو ڈاکٹر صاحب فری آئی ہسپتال بنا سکتے ہیں۔ جو اس عظیم شخص کو ہماری قوم کی طرف سے ایک ایوارڈ، ایک حقیر سا ایوارڈ ہو گا اس کی جدوجہد کے مقابلے میں۔ اس کے لیے مزید معلومات اس ویب سائٹ سے لی جا سکتی ہیں۔ www.gofund.org

روزنامہ ''دن'' لاہور 14 مئی 2011ء

یو کے ٹائم لندن 19 مئی 2011ء

قابل غور

☆ امریکہ والے دوسرے ممالک کے انسانوں سے چاہے انسانوں والا سلوک نہ کریں مگر ساری دنیا کے جانوروں کے مساوی حقوق کی پاسداری کا خیال ضرور رکھتے ہیں۔

☆ بلآخر اسامہ بن لادن کے آخری جنم کا انت ایبٹ آباد

میں کیا گیا اور اختتامی سین فلم بند کرتے وقت یہ پروڈکشن صرف امریکی ہی رہ گئی اور اس میں کسی اور کے اشتراک کی مزید ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

☆ اس فلم میں سب سے بڑی بات جو آج تک کسی فلم میں نہیں تھی وہ یہ ہے کہ اس میں وہ اصلی ہے جو تمام فلموں میں نقلی ہوتا ہے اور وہ سب نقلی ہے جو عام فلموں میں اصلی ہوتا ہے۔

☆ کیا کبھی اسٹنٹ مین کو بھی کوئی ایوارڈ ملا ہے؟ ان کی شکل تو دور کی بات نام تک فلم میں شامل نہیں کیا جاتا۔

❁.....❁.....❁

اسامہ بن لادن کا ساتواں جنم

پچھلے چند سالوں میں بھارت نے دنیائے کرکٹ اور فلم کے میدان میں بھرپور جست لگائی ہے کہ اب اکثر کھلاڑی اپنے ملک کی نمائندگی کو آئی پی ایل پر ترجیح دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ کرکٹ کے موجد برطانیہ کی کاؤنٹی کے میدان بھی اس سے متاثر ہوئے ہیں۔اسی طرح بالی ووڈ نے پچھلی دہائی سے زیادہ فلمیں ریلیز کرنے کا ریکارڈ بھی ہالی ووڈ سے چھین لیا ہے۔بالی ووڈ کی فلموں اور ڈراموں کا اثر امریکی ایوانوں تک جا پہنچا اور ہندو مذہب کے سات جنم کے اعتقاد نے تو ان کو اتنا متاثر کیا کہ انہوں نے کسی حد تک تو اس کو قبول کر لیا۔اسی لیے تو اسامہ بن لادن نے پچھلے چند برسوں میں سات بار جنم لیا۔انفارمیشن اور ٹیکنالوجی کے اس ترقی یافتہ دور میں اگلے جنم میں جدت کا یہ پہلو آ گیا ہے کہ اگلا جنم وہاں سے ہی شروع ہوا جہاں پر پہلا جنم ختم ہوا تھا۔اور ہر بار اسامہ معجزانہ طور پر بن لادن کے روپ میں ہی جلوہ افروز ہوا۔ ہر جنم کے مرن دن پہ اعلیٰ حکام کی تصدیق ہوتی رہی اور کئی بار تو ان تصدیق کنندگان کی فہرست میں مرداول نے بھی شامل ہو کر اس کو تقویت بخشی۔ ہندو مذہب میں شکر ہے کہ سات سے زائد جنم کا تصور نہیں ورنہ اس بار مرداول یہ نہ کہتے کہ آئندہ اسامہ بن لادن کبھی زندہ نظر نہیں آئے گا......ویسے تو وہ کسی کو کبھی مردہ بھی نظر نہیں آیا اور نہ آئے گا۔شاید یہ بھی بالی ووڈ کی فلموں کا اثر تھا کہ اسامہ کی لاش کو جلد پانی کی نذر کر دیا اور جلایا اس لیے نہ ہو کہ فلم کا یہ مرکزی کردار کہنے کو تو مسلمان تھا۔اور دفنایا اس لیے نہ ہو کہ جنم جنم کا عقیدہ ہندوانہ ہے۔لہٰذا دونوں مذاہب کا خیال تو رکھا ہی ساتھ آبی مخلوقات کی بھوک کا خیال بھی رکھا کیونکہ امریکہ والے دوسرے ممالک کے انسانوں سے چاہے انسانوں والا سلوک نہ کریں مگر ساری دنیا کے جانوروں کے مساوی حقوق کی پاسداری کا خیال ضرور رکھتے ہیں۔

مشترکہ پروڈکشن سے شروع کی جانے والی اس فلم میں بالآخر اسامہ بن لادن کے آخری جنم کا انت ایبٹ آباد میں کیا گیا۔اور اختتامی سین فلم بند کرتے وقت یہ پروڈکشن صرف امریکی ہی رہ گئی اور اس میں کسی اور کے اشتراک کی مزید ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ کوکہ اس فلم کی پروڈکشن بہت بڑی ہے مگر ڈائریکشن اور کہانی میں تکنیکی اعتبار سے اتنی خامیاں اور کمزوریاں ہیں کہ وہ خامیاں ہماری پشتو اور پنجابی فلموں میں بھی نظر نہ آئیں۔مگر پھر بھی اس بار آسکر ایوارڈ کے لیے اس سے زیادہ موزوں کوئی اور فلم نہیں سمجھتے۔اس فلم کے ڈائریکٹر، پروڈیوسر، رائٹر سے لے کر کیمرہ مین تک سب امریکی ہی ہیں۔اور ایسی فلم جو ریلیز ہونے سے پہلے ہی سپرہٹ ہو جائے تو اس کو آسکر ایوارڈ سے کون روک سکتا ہے۔ویسے بھی ایوارڈ دینے والے اور لینے والے وکیل بھی خود اور جج بھی خود......اناں وڈے شیر بتیاں تے مڑ مڑ ابنیاں نوں......! ظاہر ہے کسی اور کی کیا مجال......!!!

اس فلم میں سب سے خاص بات کہ کوئی ہیروئن نہیں تھی۔ ویسے بغیر ہیروئن کے ہالی ووڈ نے پہلے بھی کئی ہٹ فلمیں دی ہیں۔سلوسٹر سٹالن کی فرسٹ بلڈ میں بھی تو کوئی ہیروئن نہ تھی اور وہ اپنے دور کی کامیاب فلم تھی۔بن لادن کے سات جنم کی اس فلم کو لگتا ہے دنیا کے تمام ایوارڈز سے نوازا جائے گا۔اس فلم میں سب سے بڑی بات جو آج تک کسی فلم میں نہیں تھی وہ یہ ہے کہ اس میں وہ اصلی ہے جو تمام فلموں میں نقلی ہوتا ہے اور وہ سب نقلی ہے جو عام فلموں میں اصلی ہوتا ہے۔اس فلم میں ہمارے بھی کئی عسکری' سیاسی اور بیوروکریٹک فنکاروں نے بھرپور حصہ لیا۔اور اپنے اپنے فن کے وہ جوہر دکھائے کہ ڈائریکٹر کو اس کا یقین نہیں ہوتا تھا کہ ہمارے فنکار فن کی اس بلندی تک بھی جا سکتے ہیں۔فن سے وفاداری اور ہدایتکار کی تعظیم کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے آگے بیٹھنے کا کہتا تو ہمارے فنکار لیٹ جاتے اور وہ بھی آنکھیں بند کر کے......! وفا کے ان پیکروں کو فلم کے ڈراپ سین میں ایکسٹرا کے طور پر بھی دکھایا نہ گیا۔وہ بیچارے تو اپنے آپ کو بڑے فنکار سمجھتے تھے مگر ان کو تو بس اسٹنٹ مین کے طور پر فلم میں شامل کیا گیا

تھا......بلکہ استعمال کیا گیا تھا۔کیا کبھی اسٹنٹ مین کو بھی کوئی ایوارڈ ملا ہے؟ ان کی شکل تو دور کی بات نام تک فلم میں شامل نہیں کیا جاتا۔ہمارے فنکاروں کی تابعداری اور پیشہ وارانہ مہارت ہالی ووڈ والوں کو پسند آئی ہو یا نہیں......مگر اس فلم کی شوٹنگ کرنے میں سب سے زیادہ مزہ اسی خطے میں آیا ہے۔ایبٹ آباد میں شوٹنگ سے اگر فلم باکس آفس آنے سے پہلے ہی سپرہٹ ہو گئی ہے تو اس اگلی فلم کی شوٹنگ اگر اسلام آباد، لاہور، کراچی، کوئٹہ، پشاور اور دیگر شہروں میں کی جائے تو اس کو بغیر ریلیز ہوئے ہی آسکر ایوارڈ کے لیے نامزد کر لیا جائے گا۔فلم کے چاہے تمام شعبہ جات میں وہ ایوارڈ لے جائیں مگر بیسٹ لوکیشن کا ایوارڈ تو ہم کو مجبوراً دینا ہی پڑے گا۔اور اسی بنا پر آئندہ فلم کی تمام عکس بندی اب اسی خطے میں ہو گی۔

اس ساری فلم میں ہمارے حصے بس لوکیشن کا ایوارڈ ہی آرہا ہے مگر ہماری وفاداری کا کچھ صلہ تو ملے گا......فلم تو بن گئی مگر ایک چیز ابھی باقی ہے اور وہ ہے......آئیٹم سونگ......منی بدنام ہوئی ڈارلنگ تیرے لیے!! اور اس کو کس پر فلم بند کیا جائے ابھی فیصلہ ہونا باقی ہے کیونکہ اس کے لیے کافی منے ہیں۔اور اس میں ایکسٹرا کے رول کے لیے بھی کافی فنکاروں کی گنجائش ہے۔پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ......!

اسامہ بن لادن کی بار بار واپسی کا سلسلہ تو بقول مرداول اب بند ہو گیا ہے مگر ہالی ووڈ والوں کو فلموں کے پارٹ ٹو اور پارٹ تھری بنانے کا بھی بڑا وسیع تجربہ ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ چنگا کون پروڈکشن کی جانب سے براک اوبامہ پارٹ ٹو میں کیا پیش کرتے ہیں اور اگلی فلم کی شوٹنگ کا آغاز کس جگہ سے ہوتا ہے اور اس میں ہمارے سیاسی، عسکری اور بیوروکریٹک فنکاروں کو کیسا رول دیا جاتا ہے؟؟؟

روزنامہ جنگ لندن 15 مئی 2011ء

☆ ویسے بھی انتہائی مجبوری کی حالت میں ”حرام“ بھی حلال ہو جاتا ہے۔ یہ تو پھر امریکی ڈالر ہیں اور کرنسی کا کوئی مذہب یا پاک اور پلید تو نہیں ہوتی نا۔

☆ اب تو مدد اور قرضے کی عادت اتنی پکی ہوگئی ہے کہ اگر یہ کچھ عرصہ کہیں سے نہ ملے تو سب سیاسی اکابرین سیلاب اور زلزلے کی دعائیں مانگنا شروع ہو جاتے ہیں۔

❀-----❀-----❀

قابل غور

☆ ین سے انکار دوستی میں دراڑ-----چینی کے فقدان میں چینی سے دوستی تو نبھانی ہے ناں-----! شاید یورو اور پاؤنڈ سے بھی منہ موڑ لیا جائے مگر سعودی ریال تو بڑے متبرک ہیں۔

بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ......!

"بڑے میاں" نے اپنے دور حکومت میں کشکول توڑنے کی بات کی تھی اور اب میاں برادران کے "چھوٹے میاں" نے بیرونی امداد لینے بلکہ اس میں سے اپنا حصہ لینے سے بھی انکار کر دیا ہے۔اس میں موقف واضح ہونا ابھی باقی ہے کہ اب ان کو صرف "ڈالر" والی امداد سے الرجی ہونا شروع ہوگئی ہے یا اس میں "یورو، پاؤنڈ، ریال" اور "ین" بھی شامل ہیں۔ین والے تو ہمارے ہمسائے ہی نہیں اچھے دوست بھی ہیں جو ہر مشکل میں کام آتے ہیں۔اس لیے وہ جو بھی دیں دوستی کا خلوص سمجھ کر لیا جا سکتا ہے۔ ین سے انکار دوستی میں دراڑ......چینی کے فقدان میں چینی سے دوستی تو نبھانی ہے ناں......! شاید یورو اور پاؤنڈ سے بھی منہ موڑ لیا جائے مگر سعودی ریال تو بڑے متبرک ہیں۔کیونکہ ان کا تعلق اس دھرتی سے ہے جس کی خاک بھی بڑی مقدس ہے اور ریال مبارک پر تو عربی بھی لکھی ہوتی ہے اور یہ رسم الخط بھی بہت مقدس ہے اور جن کی اوپر تصویر ہوتی ہے اس شاہی خاندان کی تو ہین کر کے آئندہ جلا وطنی کہاں کاٹنی ہے؟ بھئی برے وقت کا کیا پتہ......؟ کب کوئی بوٹوں والا ہاتھ میں چھڑی گھماتا آ جائے اور پھر کسی 10 سالہ معاہدہ پر دستخط کروا کر جدہ روانہ کر دے۔اس تناظر میں تو ریال سے انکار ممکن دکھائی نہیں دیتا۔ملکی حالات کا اثر زرداری کو ہو نہ ہو مگر وڈے میاں کو تو چوٹ سیدھی دل پر ہی لگتی ہے۔اور چھوٹے میاں کی تو کمر ہی ٹوٹ جاتی ہے۔اسی لیے تو دونوں کو علاج کے لیے آئے دن ملکہ کا مہمان بھی بننا پڑتا ہے۔اسی بہانے اپنے پرانے حریفوں سے آنکھیں چار بھی ہو جاتی ہیں۔میاں برادرز اپنے پرانے حریفوں کو ذرا چڑاتے بھی ہیں اور کچھ اتراتے بھی ہیں کہ وہ تو آزاد گھوم رہے ہیں مگر حریف بیچارے اس "ولائتی

پنجرے" میں ہی مقید ہو کر رہ گئے ہیں۔اگر ہمت ہے تو آؤ پاکستان......اب تو بڑا منصف ہمارا اپنا ہے۔حریف بھی ان کو کہہ دیتے ہیں کہ "چوہدریوں" سے وفا کی امید لگانا میاں برادران کی پرانی عادت ہے۔ان حالات میں دونوں "پاجی" پاؤنڈ اسٹرلنگ کی توہین بھی نہیں کر سکتے۔ملکی حالات تو اونٹ کی کل کی طرح ہیں جو سیدھے کم اور ٹیڑھے زیادہ ہیں۔کمزور "دل اور کمر" تو کسی وقت بھی دھوکہ دے سکتے ہیں۔تو دل لگانے اور ذرا کمر سیدھی کرنے کے لیے ملکہ کا مہمان بننا ہی پڑ سکتا ہے ملکہ کی فوٹو بھی پاؤنڈ پر چھپی ہے۔ہم تو عورت اور وہ بھی "ملکہ عورت" کے تقدس کی پامالی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔برطانوی گوروں سے جو ملے اس پر تو "حق" ہے کیونکہ یہ تو امداد کی "مد" میں نہیں آتا۔یہ اس مال غنیمت سے واپسی کی ایک "حقیر قسط" ہے جو انہوں نے ہمارے خطے کو لوٹ کر اپنے قومی خزانے بھرے تھے۔ہماری دشمنی تو "امریکی ڈالر" سے ہے کیونکہ دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔اس لحاظ سے "امریکی ڈالر" کے دشمن "یورو" سے دوستی کر کے دشمن کو جلانے کا موقع ہاتھ سے کیوں جانے دیں۔اس لیے یورو سے دوستی کر کے اس کو قبول کرنے میں ہی دانشمندی ہے۔ایک تیر سے دو شکار......!! امریکی ڈالر کو ذلیل بھی کریں گے اور یورو سے یاری لگا کر دو درجن سے زائد ممالک کو بھی اپنا دوست بنا سکتے ہیں مگر اس وقت تو ہم دہشت گردی کی جنگ میں بری طرح الجھے ہوئے ہیں اور امریکہ کے فرنٹ لائن اتحادی بھی ہیں سو امریکہ سے طوطا چشمی کا مطلب یہ لیا جائے گا کہ خدانخواستہ ہم "طالبان یا القاعدہ" کا ساتھ دے رہے ہیں۔یہ سیاہ دھبہ تو ہم اپنے دامن پر نہیں لگنے دیں گے۔خوشحال پاکستان کا قیام امن کے بغیر ممکن نہیں۔ امن وسلامتی کے لیے دہشت گردی کا خاتمہ ضروری ہے۔دہشت گردی کے خاتمے کے لیے ہمیں جدید ہتھیار، موثر ٹیکنالوجی اور پینٹاگون کا آشیرباد بھی ضروری ہے۔ان حالات میں "امریکی ڈالر" بھی جائز ہے ناں......!! ویسے بھی انتہائی مجبوری کی حالت میں "حرام" بھی حلال ہو جاتا ہے۔یہ تو پھر امریکی ڈالر ہیں اور کرنسی کا کوئی مذہب یا پاک اور پلید تو نہیں ہوتی نا۔

کہنے اور کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے کیونکہ نظریئے اور عمل میں بھی بڑا فرق ہوتا ہے۔اگر ہم خون ٹیسٹ کروائیں تو اس میں کاغذی رپورٹ کے مطابق آئرن،شوگر اور کیلشیم وغیرہ کے علاوہ پتہ نہیں کیا کیا نکل آتا ہے۔مگر کیا مقناطیس کبھی ہمارے جسم سے چپکا؟ شوگر زدہ انگلی اگر چائے کی پیالی میں ڈال کر ہلائی جائے تو کیا چائے میٹھی ہوئی ؟ نہیں ناں......!!اسی طرح ہمارا مسئلہ ہے۔جو نظریہ ہم بیان کرتے ہیں۔وہ عملی طور پر ممکن دکھائی نہیں دیتا۔سو اگر ہم پرانا چھوٹا کشکول توڑ دیں اور نیا بڑا کشکول نہ بھی لیں، جھولی نہ پھیلائیں اور کسی کی ''گود'' میں گرنا بند بھی کر دیں تو کیا ہم وہ شاہانہ انداز اپنا سکتے ہیں؟ کپڑا پاٹاں اے ماکاں داتے دھوبی دی کی جانی اے چھو......!!یہ سب اثر تو عوام پر ہوتا ہے۔اگر ہم امداد نہ لیں تو ہمارا حال بھی کہیں وہ نہ ہو جائے کہ پیٹ پر پتھر باندھنا پڑ جائے۔عوام تو شاید پیٹ پر ایک پتھر باندھ کر گزارہ کر لے گی بلکہ اس وقت بھی کر رہی ہے۔کیا ان لیڈروں میں کوئی ایسا ہے جو پیٹ پر دو پتھر باندھ کر گزارہ کر سکے......؟؟؟؟ادھر تو پیٹ بھی حرام کی کھا کھا کر اتنا پھیل گیا ہے کہ ان پر ایک دو پتھر کیا پورا پہاڑ ہی باندھنا پڑے گا۔

امدادوں اور قرضوں پر ہمیشہ گزارہ تو نہیں ہو سکتا لیکن اگر یہ امداد اور قرضے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے لیے دیانتداری سے استعمال کیے جاتے تو آج ہم دوسروں کی مدد کرنے کے قابل ہوتے چہ جائیکہ...... مگر خود کفیل ضرور ہو چکے ہوتے۔امریکہ کے ہاتھوں میں اپنے ہاتھ دے کر اتنے سالوں سے ہمارا حکمران طبقہ'' کیکلی''کھیل رہا ہے اور جب اس کا دل کرتا ہے ہاتھ چھوڑ کر گرا بھی دیتا ہے اور قصوروار بھی ہم کو ٹھہراتا ہے۔اس سے تو بہتر تھا کہ ہم چین،روس، جاپان اور ایران سے برابری کے اصولوں پر ''ٹھاپو''کھیل لیتے تو آج ہم ''ٹپ''گئے ہوتے۔

امداد اور قرضے تو حکمران طبقہ،بیوروکریسی اور عسکری قیادتیں ہی ہضم کر جاتی ہیں اور عوام کے حصے میں اس کا ''سود''ہی آتا ہے اور وہ بھی نسل در نسل......!اب تو مدد اور قرضے کی عادت اتنی پکی ہو گئی ہے کہ اگر یہ کچھ عرصہ کہیں سے نہ ملے تو سب سیاسی

اکابرین سیلاب اور زلزلے کی دعائیں مانگنا شروع کر دیتے ہیں۔ایسی آفت میں تو ہمسایہ ملک کا بھی خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ کہیں اس کی امداد سے انکاری ہو کر اس کا دل نہ توڑ دیں۔تبھی تو ہمسایہ چاہے کیسا بھی ہو جب کچھ ''دے'' رہا ہو تو اس کو خوش رکھنے کے لیے لے لینا چاہیئے۔کرکٹ میچ، سیلاب اور زلزلے ہی تو ہمسایہ ملک کے ساتھ امن کا چھکا لگانے میں مدد دیتے ہے دوسرے معاملات میں ہمسائے سے اختلاف اپنی جگہ......مگر مدد اور وہ بھی ''نقد''ہو تو انکار کر کے تعلقات مزید کشیدہ کرنے میں کیسی دانشمندی......؟؟اسی لیے تو ہم ''قائداعظم ثانی'' ہیں۔ہم جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں اور جو کرتے ہیں وہ ظاہر نہیں ہونے دیتے۔

روزنامہ ''دن'' لاہور 30 مئی 2011ء

دی نیشن لندن 3 جون 2011ء

قابل غور

☆ اسی طرح نسل نو کو بھی غلط ماحول اور منفی سوچ کے لوگوں سے بچانے کے لیے حفاظتی اقدامات کرنے کی جتنی ضرورت آج ہے پہلے نہ تھی۔

☆ ایک کلمہ گو کے ہاتھوں دوسرے کلمہ گو کی ہلاکت پر آسمان

بھی اشک بار اور انسانیت شرمندہ ہے کہ جنہوں نے امن کا عالمی پیام پھیلانا تھا انہوں نے خود قتل و غارت گری کا بازار گرم کر رکھا ہے۔

☆ ہم نے افغانستان جنگ کا برا درخت لگایا تھا اور آج اُس کا پھل تو دور کی بات جڑیں بھی ہمارے اپنے آنگوں تک آ پہنچی ہیں۔

☆ اسامہ بن لادن جیسے امریکی سپاہی کی ہلاکت پر بھی ہمارے ملک میں ایک طبقہ ناصرف اسے شہید کا درجہ دیتا ہے بلکہ اُس کی غائبانہ نماز جنازہ بھی کروا رہا ہے۔ کوئی یہ تو بتائے کہ اسامہ نے پاکستان کی عوام اور اسلام کے لیے کیا خدمات سرانجام دیں؟

جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے۔۔۔ جنگ کیا مسئلوں کا حل دے گی

عطیہ خداوندی ہے کہ ہماری دھرتی کی مٹی زرخیز اور قدرتی وسائل سے مالا مال ہے۔ زرخیز مٹی بھی اُس وقت تک کچھ نہیں کر سکتی جب تک کسان، باغبان اور مزدور اسکی مناسب دیکھ بھال نہ کریں۔ اس پر جتنی محنت اور لگن سے کام کیا جائیگا اتنا ہی کھیتوں میں اناج اور چمن میں پھول اور پھل کھلتے رہیں گے اور میرے مزدوروں کا زور بازو انہیں انسانوں تک پہنچاتا رہے گا لیکن اس کی مناسب حفاظت نہ کی جائے تو طرح طرح کے حشرات الارض ان لہلاتی فصلوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ ذرا سی غفلت برتنے سے ان پر آکاس بیل کا حملہ بھی ہو سکتا ہے۔ جوان کو دم گھونٹنے والے حصار میں لے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سلا دیتی ہے۔ اگر ہم اس زرخیز مٹی کا مناسب استعمال نہ کریں تو اس میں خودرو پودے اور جھاڑیاں اگنا شروع ہو جاتی ہیں جس سے دوسرے پھلوں اور پھولوں کو نقصان پہنچنے کے ساتھ ساتھ اس کی خوبصورتی بھی ماند پڑتی ہے۔ اسی طرح ہمارے دیس کے لوگوں کا ذہن بھی بہت زرخیز ہے۔ ان کے ذہنوں کی مناسب نشونما کے لیے ماں باپ کی دیکھ بھال، اساتذہ کی تعلیم و تربیت کے علاوہ صحت مندانہ معاشرتی ماحول بھی اشد ضروری ہے۔ جس میں پر امن فضا کا ہونا لازمی جزو ہے۔ جس طرح مالی اور کسان اپنی فصل اور پھل، پھول کو کیڑے مکوڑوں سے تباہ ہونے سے بچانے کے لیے حفاظتی اقدامات کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح نسل نو کو بھی غلط ماحول اور منفی سوچ کے لوگوں سے بچانے کے لیے حفاظتی اقدامات کرنے کی جتنی ضرورت آج ہے پہلے نہ تھی۔ ورنہ ان کو دہشت گردی کی آکاس بیل اپنے مکروہ شکنجے میں لے کر ہمیشہ کے لیے اپنا غلام بنا لے گی۔ ذہانت، ہمت، حوصلہ اور جذبہ قومی مفاد کے خلاف استعمال ہونا

43

شروع ہو گیا تو ہمارا انجام بڑا بھیانک ہو گا۔

اس دیس کی مٹی میں بڑی طاقت ہے اور بیج بو کر جب محنت کی جاتی ہے تو اس کا ثمر بھی باکمال ہوتا ہے۔ اسی طرح ہماری نسل نو کو مناسب تعلیم و تربیت اور سازگار ماحول میسر آئے تو وہ بھی ملک و قوم کے لیے سرمایہ ثابت ہو سکتی ہے لیکن اگر ان کو مثبت ماحول نہ ملا اور بدقسمتی سے یہ غلط ہاتھوں میں چلے گئے۔ جوان کے ذہنوں میں دہشت گردی کا بیج بو کر انتہا پسندی کا پانی دینے کے بعد ہمارے خلاف ہی استعمال کر سکتے ہیں۔ موجودہ دور میں ہمارا ملک تکلیف دہ حالات سے گزر رہا ہے۔ ایک کلمہ گو کے ہاتھوں دوسرے کلمہ گو کی ہلاکت پر آسمان اشک بار اور انسانیت شرمندہ ہے کہ جنہوں نے امن کا عالمی پیام پھیلانا تھا انہوں نے خود قتل و غارت گری کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ سر پر دہشت گردی کا کفن باندھ کر معصوم لوگوں کی جان لینے والے بھی اپنے آپ کو جنت کا حقدار اور شہادت کے رتبے پر فائز سمجھتے ہیں اور جوان کی سفاکی کا نشانہ بنتے ہیں وہ بھی شہید ہیں......! اس کا فائدہ جس کو ہو رہا ہے اور کس کو ہو گا وہ کوئی نہ کوئی تو ہے لیکن ہمارے لیے خسارہ ہی خسارہ ہے۔

ایک وقت وہ بھی تھا جب ہمارے فوجی جوانوں نے اپنے جسموں پر بم باندھ کر دشمن کے ٹینکوں کے نیچے لیٹ کر ان کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملا کر جام شہادت نوش کیا اور اپنی تاریخ اپنے لہو سے لکھ کر آنیوالی نسلوں کو درس دیا کہ زندہ قومیں اپنی خود مختاری کی حفاظت کے وقت کسی قربانی سے دریغ نہیں کرتیں۔ آج انہی شہداء کا وہ جنگی حربہ ان کے خلاف استعمال ہو رہا ہے اور کرنے والے بھی وہ معصوم ذہن ہیں جن کے جان و مال کی حفاظت کرتے وہ مقدس جسم شہید ہوئے تھے۔ ہماری فوج کے عظیم کارناموں کی وجہ سے عوام میں ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی فوجی وردی میں کہیں سے گزرتا تو بچے، بوڑھے اور جوان سب اس کو عزت و احترام سے دیکھتے۔ کوئی پیار سے ہاتھ ہلاتا اور کوئی سیلوٹ کرتا۔ آج کیا ہو گیا ہے کہ ہماری، بری، بحری، اور فضائی فوج کے ساتھ ساتھ سیکیورٹی ادارے بھی دہشت گردی کا ہدف بنتے جا رہے

ہیں۔ جب حالات اس نہج پر پہنچ چکے ہیں تو باقی عوام ان درندوں سے بھلا کیسے محفوظ رہ سکتی ہے۔

دہشت گردی کا یہ بیج جو ضیاء الحق نے اپنے دور میں بویا تھا آج ساری قوم اس کا پھل کھا رہی ہے۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ اچھا درخت کبھی برا پھل نہیں دیتا اور برا درخت کبھی اچھا پھل نہیں دے گا۔ ہم نے افغانستان جنگ کا برا درخت لگایا تھا اور آج اُس کا پھل تو دور کی بات جڑیں بھی ہمارے اپنے آنگوں تک آ پہنچی ہیں۔ پچھلے چند سالوں میں پاکستان کی کون سی جگہ ہے جو دہشت گردی کے واقعات سے محفوظ رہی ہوگی؟ حساس اداروں کے ہیڈ کوارٹرز، مساجد، جلسہ گاہ، امام بارگاہ، تھانے، چھاؤنیاں، اقلیتوں کی عبادت گاہ، ہوٹل، بازار، جنازے، پولیس، فوجی، عام شہری غرضیکہ کوئی بھی محفوظ نہیں رہا۔ حالات بد سے بدترین ہوتے جا رہے ہیں اور ساری قوم کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ اگر حالات میں بہتری نہ آئی اور ہمارے حساس ادارے اسی طرح دہشت گردی کا شکار ہوتے رہے تو عوام کا اپنے دفاعی اداروں پر سے اعتماد اٹھ جائے گا اور شاید مکار دشمن اُسی وقت کا منتظر ہے۔ درحقیقت عوامی اعتماد ہی ان اداروں کی سب سے بڑی قوت ہوتی ہے جو بڑی مکاری سے ختم کی جا رہی ہے اور جوں ہی یہ کمزوری عیاں ہوئی، ہم کسی بیرونی جارحیت کا شکار ہو سکتے ہیں۔ اس وقت سب سے زیادہ ضروری اندرونی معاملات کی درستگی ہے۔ بجائے اس کے ہم کسی کا آلہ کار بنیں۔ خود ہی سیاسی بصیرت، حکمت و دانائی سے اس مسئلے کا حل نکالیں۔ دہشت گردی کی اس نام نہاد جنگ میں ہم نے 40 ہزار سے زائد جانوں کی قربانی تو دے دی۔ مگر آج تک مثبت نتائج سامنے نہیں آئے۔ اب اور کتنی دیر تک اسی جنگ میں اپنا مال و جان ضائع کرتے رہیں گے۔ جنگ کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتی۔ ہمیشہ پر امن ماحول میں ہی مسائل کا حل مشاورت اور سمجھوتوں سے ہوتا ہے۔

ہمیں وہ وجہ تلاش کرنی ہوگی جس کی بدولت ہم دہشت گردی کی دلدل میں دھنستے جا رہے ہیں۔ ہمیں ہنگامی طور پر وہ اقدام اٹھانے ہونگے جس سے موجودہ فضا

میں تبدیلی لائی جا سکے۔ دہشت گردی کے خاتمے کے لیے ضروری ہے کہ دہشت گردوں کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ اس سوچ کو ختم کیا جائے جو معصوم اور غریب لوگوں کو خودساختہ جنت کے خواب دکھا کر ان کے ہاتھوں میں اسلحہ اور جسم پر بم باندھ دیتی ہے۔ اس کے لیے تمام ارباب ذوق، دانشور، سیاسی و مذہبی راہنما، میڈیا اور تمام مکاتب فکر کو مثبت انداز میں اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ انہیں سب سے پہلے اس بات پر متفق ہونا ہوگا کہ آئندہ کے لیے کیا لائحہ عمل اختیار کیا جائے؟ اصلی دشمن کون ہے اس کا پتہ لگایا جائے اور اس کے عزائم کے بارے میں بھی عوام کو بتایا جائے۔ دشمنی کی وجہ کیا ہے اور اس کو کیسے ختم کرنا ہے؟ اسامہ بن لادن جیسے امریکی سپاہی کی ہلاکت پر بھی ہمارے ملک میں ایک طبقہ صرف اسے شہید کا درجہ دیتا ہے بلکہ اُس کی غائبانہ نماز جنازہ بھی کروا رہا ہے۔ کوئی یہ تو بتائے کہ اسامہ نے پاکستان کی عوام اور اسلام کے لیے کیا خدمات سرانجام دیں؟ امریکہ کے ساتھ اس جنگ میں اب تک کیا کھویا اور کیا پایا؟ کیا پاکستان کے عوام اس کے حامی ہیں؟ اس جنگ سے لوگوں کے بنیادی مسائل حل ہو رہے ہیں یا ملک معاشی بد حالی کے آخری سرے پر آ پہنچا ہے۔ دہشت گردی کی مذمت تو ایک سیاسی علامت بن گئی ہے۔ اس کو ختم کرنے کے لیے سب سے پہلے متحد ہونے کی ضرورت ہے اور ذاتی مفادات کو بالائے طاق رکھ کر ہر فیصلہ ملکی مفادات میں کیا جائے۔ اس جنگ سے باہر نکلا جائے جس کی وجہ سے پاکستان ہی نہیں پوری دنیا کی معیشت تباہ ہو رہی ہے۔ اب تو دہشت گردی بھی ایک انڈسٹری بن چکی ہے۔ جس میں پیسے کے بدلے گولہ بارود اور خودکش بمبار تک کا سودا ہوتا ہے۔ تباہی و بربادی کے اس لین دین میں مرنے اور مارنے والے صرف غریب لوگ ہی کیوں ہوتے ہیں؟ صرف چند لوگوں کی ذاتی مفادات کی غلط پالیسوں نے ہمارے ملک کو دنیا کی نظر میں دہشت گردوں کی آماجگاہ بنا دیا ہے۔ ابھی وقت ہے کہ ہم ماضی کی غلطیوں سے سبق سیکھیں اور سارے اختلافات بھول کر ملک کی سلامتی کے لیے امن کی پالیسی اپنائیں۔ جنگوں سے قومیں تباہ ہوتی ہیں اور امن میں ہی ترقی کرتی ہیں۔ ساحر لدھیانوی نے ٹھیک کہا تھا

جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے
جنگ کیا مسئلوں کا حل دے گی
آگ اور خون آج بخشے گی
بھوک اور احتیاج کل دے گی

روزنامہ "دن" لاہور 4 جون 2011ء
لندن 8 جولائی 2011ء

قابل غور

☆ دیانتدار بیوروکریٹ اور سیاستدان ملک کی تاریخ بناتے ہیں مگر آج ہم "تاریخ" بنتے نظر آرہے ہیں۔ ملک بیک وقت کئی اکھاڑوں میں کبھی نہ ختم ہونے والی نورا اور حقیقی کشتیاں لڑ رہا ہے۔

☆ اپنے ہاں تو "خودی" کے ساتھ ساتھ بڑا کچھ بیچا بلکہ لٹایا گیا ہے اور ابھی تک آبا و اجداد کی وارثت سمجھ کر بانٹا جا رہا ہے۔اس معاملے میں ہماری سخاوت نے خاتم طائی کو بھی شرمندہ ہونے پر مجبور کر دیا ہے اس بیچارے کے پاس کیا تھا ہم تو دینے پر آئیں تو آدھا ملک دے دیتے ہیں اور وہ بھی 90 ہزار مسلح اسیروں سمیت۔

☆ اب ہماری غریب عوام میں اتنا خون کہاں بچا ہے کہ اس کی پیاس بجھ سکے۔ پہلے ہی بوٹوں والے ڈریکولا ،نوٹوں والی جونکوں اور لوٹوں والے پسوؤں نے ان کا سارا خون چوس رکھا ہے۔

❁----❁----❁

ہم خودی کو بلند کرتے رہے!

حکیم خاندانی ہو تو نبض دیکھ کر بیماری بتا دیتا ہے، اچھا ڈاکٹر علامات اور رپورٹس سے بیماری کی تشخیص کرتا ہے، تجربہ کار مکینیکل انجینئر کو مشین کا mechanism دیکھ کر function معلوم پڑ جاتا ہے، ماہر موٹر مکینک گاڑی کے انجن کی آواز سے ہی بتا دیتا ہے کہ اس پر کیا قیامت گزر چکی ہے۔قابل جج دونوں پارٹیوں کے ثبوت دیکھ کر اور دلائل سن کر سچ اور جھوٹ علیحدہ علیحدہ کر کے اپنا فیصلہ سناتا ہے۔غرضیکہ ہر وہ شخص جو اپنے شعبے اور پیشے میں مہارت رکھتا ہے اسے اپنا لوہا منوانے میں کسی سند کی ضرورت نہیں ہوتی۔اُس کا کام ہی اُس کی سند اور کام سے لگن ہی اُس کی حقیقی ڈگری ہوتی ہے۔موجودہ ملکی حالات میں ہمارا کوئی ادارہ ایسا نہیں جس پر فخر کیا جا سکے۔یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہر ادارے کو چلانے والے یا تو پیشہ وارانہ صلاحیتوں سے عاری ہیں اور اگر ایسا نہیں تو کسی نے اُن کے ہاتھ باندھ رکھے ہیں۔بالخصوص جن کے ہاتھ میں ملک کی باگ دوڑ ہے۔یوں دکھائی دیتا ہے جیسے سیاسی بصیرت انہیں چھو کر بھی نہیں گزری، جسے وہ بصارت سے بھی محروم ہوں اور انہیں وطن عزیز میں ہر لحہ بدلتی صورت حال دکھائی نہ دے رہی ہو۔جو ماضی کی غلطیوں سے سبق نہ سیکھنے کا تہیہ کر چکے ہیں......حال میں بے حال اور مستقبل سے ناامید......!دیانتدار بیوروکریٹ اور سیاستدان ملک کی تاریخ بناتے ہیں مگر آج ہم "تاریخ" بنتے نظر آ رہے ہیں۔ملک بیک وقت کئی اکھاڑوں میں کبھی نہ ختم ہونے والی نورا اور حقیقی کشتیاں لڑ رہا ہے۔تعجب ہے کہ قدرتی وسائل سے مالا مال ہمارا زرخیز خطہ معاشی بدحالی کا شکار کیوں ہے؟ غیر معیاری اور طبقاتی نظام تعلیم نے علمی پستی کی طرف دھکیل رکھا ہے اور قوم بننے کے لیے ترستا ہوا ہجوم جہالت کے اندھیروں میں بھٹک رہا ہے۔لوڈشیڈنگ،دہشت گردی،ناانصافی، طبقاتی درجہ بندی، بے

روزگاری، صحت، سکیورٹی، بھوک، افلاس، مہنگائی، چوربازاری اور لوٹ مار جیسے مسائل سے بھرا پاکستان حیرت وحسرت سے اپنے راہبروں کا منہ تک رہا ہے۔ ویسے تو ہر مسئلے کا حل موجود ہوتا ہے مگر موجودہ حالات نے اتنا مایوس کردیا ہے کہ لوگ کسی معجزے کی منتظر دکھائی دیتے ہیں۔ ہم مسئلوں کی اس دلدل میں ایسے دھنستے جارہے ہیں کہ باہر نکلنے کی کوئی امید ہی دکھائی نہیں دے رہی۔ ہم تو پہلے سے ہی مسائل میں خودکفیل تھے۔ اب ایک اور مسئلہ، خودمختاری اور ملکی سالمیت کا بھی آن پڑا ہے۔ ہم ایک آزاد ملک میں رہتے ہوئے بھی خودکو، خودمختار، کہتے ہوئے جھجک محسوس کرتے ہیں۔ شاعرِ مشرق نے تو فرمایا تھا۔

خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

اپنے ہاں تو ''خودی'' کے ساتھ ساتھ بڑا کچھ بیچا بلکہ لٹایا گیا ہے اور ابھی تک آباواجداد کی وارثت سمجھ کر باٹا جارہا ہے۔ اس معاملے میں ہماری سخاوت نے خاتم طائی کو بھی شرمندہ ہونے پر مجبور کردیا ہے اس بیچارے کے پاس کیا تھا ہم تو دینے پر آئیں تو آدھا ملک دے دیتے ہیں اور وہ بھی 90 ہزار مسلح اسیروں سمیت۔ ایک عافیہ تو ایسے ہی منظر عام پر آ گئی تھی ورنہ ہم تو ہزاروں کو قربانی بلکہ صدقے کی بکری بنا کر ''نیم کوری ماتا'' کے چرنوں میں ڈال دیتے ہیں۔ شاید اس سے باقی قوم کی سر سے بلائل جائے اور ان کی جان بخشی ہوسکے۔ مگر ''سفید گھر'' میں رہنے والا ''سیاہ مکین'' تو جیسے ''پاک لہو'' کا عادی ہو گیا ہو اُس کی پیاس کسی طور بجھتی دکھائی نہیں دے رہی۔ اب ہماری غریب عوام میں اتنا خون کہاں بچا ہے کہ اس کی پیاس بجھ سکے۔ پہلے ہی بوٹوں والے ڈریکولا، نوٹوں والی جونکوں اور لوٹوں والے پسوؤں نے ان کا سارا خون چوس رکھا ہے۔ اس نیم مردہ نیم قوم کو ہوش کے انجکشن لگا کر جگانے کی اشد ضرورت ہے اور اگر خوش قسمتی سے ہوش آ گئی تو اُس کے بعد بھی غیرت مند خون کی چند بوتلیں لگانا پڑیں گی۔ اس مقصد کے لیے، ایمانداری کا ہسپتال بھی بنانا ہوگا۔ جس میں کبھی نہ بکنے والے سرجنوں کی ایک ٹیم ہو جو ضرورت پڑنے پر آپریشن بھی خود ہی کرے۔ مگر یہ سب ان شاہ خرچوں کے دور میں تو کبھی ممکن نہیں ہو سکتا۔ جن کا سارا دھیان ہی مقابلہ حسن کے جیتنے اور پھر اپنا

دورِ حکومت مکمل کرنے کی طرف ہے۔ یہ شاہی فقیروں کا مقابلہ حسن جو اصولاً تو پانچ سال بعد ہونا چاہیے مگر اکثر 5 سال میں 2 بار ہی ہو جاتا ہے۔ سب بڑی تیاری کے ساتھ اس مقابلے میں حصہ لیتے ہیں۔ کوئی سونے کے بٹن والی قمیض کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے تو کوئی سر پر نئے بال لگوا کر، کوئی ڈائمنڈ والی عینک کے ساتھ کیٹ واک کرتا دکھائی دیتا ہے تو کوئی ذاتی شیر کے ساتھ ریڈ کارپٹ کی شان بڑھاتا ہے۔ اگر ہیلی پیڈ، رن وے کا انتظام کر دیا جائے تو کئی اپنے ذاتی ہیلی کاپٹر اور طیارے پر لینڈ کرنے کے بھی خواہاں ہوتے ہیں۔ یہی نہیں ان کے جان نشین بھی جدید سپورٹس کاروں پر اپنے بڑوں کو کامیاب کروانے کے لیے میدان میں آجاتے ہیں۔ اس میں ہماری غریب عوام بھی حسب عادت حصہ ڈالتی ہے اور اپنا قیمتی ووٹ جس کی قیمت بارے انہیں آج تک علم نہیں ہو سکا ان کے حق میں استعمال کرکے اگلے پانچ سال کے لیے فقیر شاہی کو مینڈیٹ دے دیتی ہے۔ ان کے پاس مخصوص چہروں کے سوا کسی اور کو منتخب کرنے کی کوئی اور چوائس نہیں ہوتی۔ اس سلیکشن نما الیکشن میں تو کسی غیرت مند کا داخلہ ویسے ہی ممنوع ہوتا ہے۔ اگر کبھی جیوری کے فیصلے پر دھاندلی کا شور مچ جائے۔ تو اس کا بھی معقول انتظام ہے ہاں! ہمارے ہرفن مولا......!!! جو ہوا، خشکی اور پانی ہر جگہ مارچ کر سکتے ہیں۔ ان کو تو نہ عوام کے ووٹ کی ضرورت ہے نہ کسی جیوری کے فیصلے کی...... ہر فیصلہ خود ہی لکھ کر منوا لیتے ہیں۔ خود کو بلا مقابلہ ہی منتخب کر لیتے ہیں۔ اور ظلم یہ ہے کہ اگلے مقابلے کے لیے کوئی تاریخ بھی نہیں دیتے۔ ایک بار تاج سر پر سجالیں تو، 10۔11 سال تک کسی کی باری نہیں آتی۔ مگر آج سب سے اہم سوال یہ ہے کہ وطنِ عزیز ان ڈراموں کا مزید متحمل ہو سکتا ہے؟

یہ نظام چلانے والے جب خود سے بے خود ہو جائیں۔ تو پھر کیسی خودی......؟ جب مختار نامہ ہی کسی اور کے نام کا ہو تو ...... کہاں کی خودمختاری ......؟ شاید اقبال اور قائد کے نام پر حکومت کرنے والوں کا خیال تبدیل ہو چکا ہے اور اب وہ سمجھتے ہیں کہ

جھکنے والوں نے رفعتیں پائیں
ہم خودی کو بلند کرتے رہے

روزنامہ ''دن'' لاہور 8 جون 2011ء

دی نیشن لندن 17 جون 2011ء

قابل غور

☆ انہیں کٹھ پتلیوں کے متعلق قائداعظم نے فرمایا تھا کہ میری جیب میں چند کھوٹے سکے ہیں۔ مگر بدقسمتی سے ان کھوٹے سکوں کا سکہ آج تک ایسا چل رہا ہے کہ ان کی کھوٹ کے آگے آج تک کوئی اصلی سکہ رائج ہی نہیں ہو سکا۔

☆ اس بار سیاہ باب کے اس مردے کو خفیہ قبرستان میں لحد میں اتارا گیا تو کئی لوگوں کی قسمت کا ستارہ افق کی ان بلندیوں تک جا پہنچا جہاں پر ان کی نظر تک کی کبھی رسائی نہ تھی۔

☆ ہم بھی اس سیاہ باب کا اک حصہ بن کر اسی قبرستان میں دفن ہو جائیں گے اور کتبے نہ ہونے کی وجہ سے کسی محقق کے لیے تحقیق کی کوئی گنجائش بھی نہیں ہو گی۔

سیاہ ابواب کا گمنام قبرستان

آج کے سیاستدان، بیوروکریٹ اور عسکری قیادتیں عوام کو خواب دکھاتی ہیں اوران کے جانشین ان کو چکنا چور کرتے ہیں۔حالانکہ ہمارے ملک کا معرض وجود میں آنا بھی اک خواب تھا جو شاعر مشرق علامہ اقبال نے دیکھا جسے قائداعظم نے 14 اگست 1947ء کو شرمندہ تعبیر کیا۔اس میں بے پناہ لوگوں کی قربانیاں، بہت سے عظیم اور دیانتدار سیاسی رہنماؤں کی جنون کی حد تک لگن، کروڑوں لوگوں کی دعاؤں اور ہمت کے ساتھ خدا کا خاص فضل شامل حال تھا۔جس کی بدولت آج ہم سبز ہلالی پرچم کو لہرا کر آزاد مملکت میں رہنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔مگر کیا ہم واقعی آزاد ہیں؟ کہیں ہم بالواسطہ غلام تو نہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ گورے تو مجبوراً چلے گئے مگر جاتے ہوئے کچھ مسٹر براؤن چھوڑ گئے۔جن کی ڈور انھوں نے اپنے ہاتھ میں رکھی۔ان مسٹر براؤنز کو کٹھ پتلیاں بنا کر جب، جہاں اور جیسے چاہا نچایا اوران سے جو غلیظ کام لیے گئے ہیں وہ خود براہ راست شاید کبھی نہ کر سکتے۔

انہیں کٹھ پتلیوں کے متعلق قائداعظم نے فرمایا تھا کہ میری جیب میں چند کھوٹے سکے ہیں۔مگر بدقسمتی سے ان کھوٹے سکوں کا سکہ آج تک ایسا چل رہا ہے کہ ان کی کھوٹ کے آگے آج تک کوئی اصلی سکہ رائج ہی نہیں ہو سکا۔انہوں نے مکر وفریب کا ایسا گھناؤنا جال بُنا کہ عوام اس کی اسیر ہو کر رہ گئی۔جہاں سے ان بیچاروں کو راہ فرار حاصل کرنے کے لیے آج تک کسی مسیحا کی تلاش ہے۔نوزائیدہ پاکستان کو پہلا دھچکا اس وقت لگا جب قائداعظم اپنی ان تھک محنت سے لگائے پودے کا پھل کھائے بغیر اس دنیا سے بڑی ستم ظریفی سے رخصت ہو گئے۔موت کا دن تو مقرر ہوتا ہے مگر جن حالات میں انہوں نے دم توڑا، خطرے کی گھنٹی تو اسی وقت ہی بج گئی تھی۔مگر کٹھ پتلیوں

کے اس ناچ گانے کے شور میں وہ آہ وفغاں دب کر رہ گئی۔پھر قائد ملت لیاقت علی خان کی شہادت کا سانحہ!!! جس کی تحقیقات اور نتائج آج تک ہٹلر کی موت کی طرح سوالیہ نشان بن کر رہ گئے۔ابھی پہلے زخم بھرے نہ تھے کہ 1965ء کی جنگ نے معاشی طور پر اور گھائل کر دیا۔اس کے بعد تو وہ درد ملا کہ پرانے سارے درد اور زخم معمولی لگنے لگے۔1971ء میں سقوط ڈھاکہ ہوا......جس کے محرکات، وجوہات، ذمہ داران کو کبھی منظر عام پر نہ لایا گیا۔تاریخ کے اس سیاہ باب کو بڑی ڈھٹائی کے ساتھ پراسرار قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔جہاں پہلے سے ایسے کئی سیاہ باب مدفون تھے۔

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

اقبال نے اس شعر میں تو مومن سپاہی کا ذکر کر دیا اور شاید ہمارے کچھ جرنیل اپنے آپ کو سپاہی نہیں بلکہ صرف وڈا افسر اور جرنل ہی سمجھتے ہیں اسی لیے تو انہوں نے بے تیغ کیا مسلح ہو کر بھی ہتھیار ڈال دیئے اور 90ہزار مومن سپاہیوں کو بھی خون کے آنسو رونے پر مجبور کر دیا۔

پھر پاکستان کو ایٹمی طاقت بنانے کی بنیاد رکھنے اور عالم اسلام میں پاکستان کو خاص مقام دلوانے والے عوامی لیڈر کو بھی بڑی عیاری کے ساتھ راستے سے ہٹا دیا گیا۔جس کے لیے ایک مومن عسکری قیادت کو کام سونپا گیا۔اوجھڑی کیمپ اور سیاچن کے ابواب بھی بڑے پراسرار طریقے سے اس خفیہ قبرستان میں دفن کر دیئے گئے۔مرد "حق" کا انجام بھی ایسا ہوا کہ آج تک پتہ نہ چل سکا کہ جرنیلوں کی ٹیم اپنے کپتان سمیت صحرا میں کیسے ٹکڑوں میں بکھر گئی......!!

مرد حق ہوتا اگر تو وہ فضاء میں جلتا نہیں
آتش نمرود نے تو مرد مومن کا کچھ بگاڑا نہ تھا

سیاہ باب کے اس قبرستان میں ایک اور قبر کا اضافہ ہو گیا۔جس کا پوسٹ مارٹم اور DNA ٹیسٹ نہ کبھی ہو سکا اور نہ کبھی ہو گا۔جرنیلوں اور سیاسی لیڈروں کے دیئے

پرانے زخم ابھی بھرے نہ تھے کہ کارگل کے سانحہ نے عوام کے دل و دماغ کو ایک اور کاری ضرب لگائی اور حسب ماضی اس سیاہ باب کو بھی سیاسی اور عسکری قیادتوں نے اسی خفیہ قبرستان میں دفن کر دیا۔اور ہمیشہ کی طرح عوام کو اس مردے کا منہ بھی نہ دکھایا گیا۔بینظیر بھٹو کے ساتھ قائد ملت والی تاریخ پھر دہرائی گئی۔بد قسمتی سے جائے وقوع بھی وہی تھا۔بس طریقہ واردات ذرا جدید قسم کا تھا مگر نتیجہ وہی قدیم......!

اس بار سیاہ باب کے اس مردے کو خفیہ قبرستان میں لحد میں اتارا گیا تو کئی لوگوں کی قسمت کا ستارہ افق کی ان بلندیوں تک جا پہنچا جہاں پر ان کی نظر تک کی بھی رسائی نہ تھی۔اس کے علاوہ اس قبرستان میں اکبر بگٹی، لال مسجد، ڈرون حملے، دہشت گردی کے کئی سانحوں کی طرح کے اور بھی مردے مدفون ہیں۔اس قبرستان کی خاص بات یہ ہے کہ کسی قبر پر کوئی تختی یا کتبہ نہیں اور پتہ نہیں چل سکتا کہ کس قبر میں کون دفن ہے۔تا کہ آنے والے وقتوں میں قبر کشائی کر کے گڑھے مردے اکھاڑ کر کوئی نئے سرے سے تحقیق نہ شروع کر دے۔شاید یہی وجہ ہے کہ 3 سال کی تگ و دو میں بالآخر بھٹو مقتول کیس کی قبر مل سکی اور باقاعدہ قبر کشائی کے بعد گڑھے مردے اکھاڑ کر انصاف کے تقاضے پورے کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے یا......سیاسی محاذ میں اس کو تلوار اور ڈھال بنا کر حریفوں اور حلیفوں کو نئے تیر چلا کر گھائل کرنے کا پلان ہے؟؟؟ اس قبرستان میں 2 مئی کو ایک اور سیاہ باب دفن کیا گیا۔اس مرتبہ مردہ دفن تو ہوا مگر کورکن سارے گورے تھے۔اس لیے 12 دن بعد ہمارے سیاسی اور عسکری رہنماؤں نے مذمت کرنے اور قرارداد پیش کرنے کی ضرورت محسوس کی۔پھر ماضی کی طرح بیان بازی، بلند و بالا دعوے، متفقہ قرارداد، تحقیقاتی کمیشن، اور پھر کبھی منظر عام پر نہ آنے والی رپوٹ کا انتظار......!!! آج تک کبھی کچھ منظر عام پر نہ آیا ہے اور نہ آئے گا۔عوام کو اندھیرے میں رکھا گیا، رکھا جا رہا ہے اور رکھا جاتا رہے گا۔ابھی اس قبر کی مٹی خشک بھی نہیں ہوئی تھی کہ مہران بیس کا مردہ بھی اس قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔64 سال میں جس سبک رفتاری اور مستقل مزاجی سے سیاہ ابواب کے اس گمنام قبرستان میں جتنا کچھ دفن ہوا ہے

تو 100 سال میں تو اس کا نام گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں ضرور آئے گا۔

کاش! ہم کو اب ہی ہوش آ جائے اور آئندہ کبھی سیاہ باب کو دفن کرنے کی نوبت نہ آئے۔ ورنہ......! ہم بھی اس سیاہ باب کا اک حصہ بن کر اسی قبرستان میں دفن ہو جائیں گے اور کتبے نہ ہونے کی وجہ سے کسی محقق کے لیے تحقیق کی کوئی گنجائش بھی نہیں ہوگی۔

روزنامہ "دن" لاہور 18 جون 2011ء

دی نیشن لندن کیم جولائی 2011ء

قابلِ غور

☆ قیادت کے دعویدار یہ سب وہ لوگ ہیں جن کے بزرگوں نے "مسائلوں کی یہ دلدل" تیار کی اور پھر عوام کو اس میں دھکیل کر چنگیز اور ہلاکو کی طرح قہقہے لگاتے رہے۔

☆ ان کی نسلیں قومی زبان صرف اس لیے سیکھیں کہ آنے والے

وقت میں الفاظ کے مکروہ جال میں عوام کو مزید الجھا کران پر حکمرانی کی تاریخ اور ظلم کی سیاہ رات کو طول دے سکیں۔

☆ جس کے پہلے حصے میں کسی صنعتکار کا "ایک دن مزدور کے ساتھ" یا پھر "وڈیرے کا ایک دن کسان کے ساتھ" یا یوں بھی ہو سکتا ہے کہ "حکمران طبقے کے کسی فرد کا "ایک دن مصیبت زدہ کے ساتھ" اور دوسرے حصے میں عوام سے کسی فرد کا حکمران طبقے کی نمائندگی کرنے والے کسی فرد کے ساتھ ایک دن ہوتو انتہائی خوبصورت پروگرام ہو سکتا ہے۔

☆ انہیں کی طرز زندگی میں ایک شب و روز گزارنا پڑے تو ہو سکتا ہے کہ "ایک دن مزدور، کسان یا مصیبت زدہ کے ساتھ" گزار کر حکمران طبقہ آئندہ بجٹ کی شمشیر میان سے نکالتے وقت جلادانہ طبیعت میں رحم کا کوئی عنصر شامل کرلیں۔

❁---❁---❁

سہیل لون بنام سہیل وڑائچ

جون میں "لُو" اور "لوڈ شیڈنگ" سے ستائی عوام کی روحوں کو مزید گھائل کرنے شمشیر نما بجٹ بھی جلاد حکمرانوں کی میان سے باہر آ کر اپنا آخری کارگر وار کر کے قوم کو لہولہان کر گیا۔ پہلے تو یہ ظلم سال میں ایک بار ہی آتا تھا۔ جس کے بعد عوام "نئے زخم" کے لیے سال بھر میں اپنے آپ کو دوبارہ تیار کر لیتی تھی لیکن اب منی بجٹ کی نیزہ زنی غریب عوام کے نرم و نازک جسموں کو روزانہ چھیدتی دکھائی دیتی ہے۔ جس پر دہشت گردی کی نمک پاشی زخم کو نیا بجٹ آنے تک ہرا رکھتی ہے۔ ہر نئی حکومت مہنگائی، بے روزگاری اور عدم تحفظ کی دلدل میں گردن تک پھنسی عوام کو تحفے میں مزید "سنگ ظلمات" دے کر ان زندہ لاشوں کو "ڈرون" کرنے میں مصروف رہتی ہے۔ خود ساختہ مسائل کی اس دلدل میں غرق ہوتی ان زندہ لاشوں کو کیسے بچایا جا سکتا ہے؟ کون ہے جو ہاتھ بڑھائے اور عوام کو اس دلدل سے باہر نکالنے کی مسیحائی کا فریضہ سرانجام دے۔ موجودہ حالات میں عوام کے لیے ایسا "نجات دہندہ" تو کیا دکھائی دے گا۔ مجھے مختار مسعود کی بات یاد آ جاتی ہے "آواز دوست" میں لکھتے ہیں وہ زمانے گئے جب عیسیٰ مردے زندہ کیا کرتے تھے اور خضر رستہ دکھایا کرتے تھے اب جو زندہ رہنے دے وہ عیسیٰ ہے اور جو رستہ دے دے وہ خضر"۔ اس بات کو لکھے بھی دہائیاں بیت گئیں لیکن یہ ہمارے موجودہ معروضی حالات میں سو فیصد درست دکھائی دیتی ہے۔ قیادت کے دعویدار یہ سب وہ لوگ ہیں جن کے بزرگوں نے "مسائلوں کی یہ دلدل" تیار کی اور پھر عوام کو اس میں دھکیل کر چنگیز اور ہلاکو کی طرح قہقہے لگاتے رہے۔ اگر کسی نے اپنی جان بچانے کے لیے کچھ ہاتھ پاؤں چلانے کی کوشش کی تو ان ظالم حکمرانوں کے ٹولے نے اس کو اپنے مکر وفریب کی زنجیروں میں جکڑ کر ہمیشہ کے لیے اس دلدل میں "دفن" کر

دیا اور نہ ہی مزار بنا اور نہ جنازہ اٹھا۔ انہوں نے اپنے خلاف اٹھنے والا سر بھی کچلا دیا اور دوسروں کو "سبق" بھی دے دیا کہ اس دلدل میں آنکھیں، کان اور زبان بند رکھیں کہ حالات کے رحم و کرم پر اپنی موت کا تماشا آہستہ آہستہ خود بھی دیکھو اور دوسروں کو بھی دکھاؤ۔ ورنہ وقت سے پہلے ہی "علامتی موت" مار دیئے جاؤ گے۔ اب حالات اس جگہ پہنچ چکے ہیں جہاں اپنے مستقبل کو مکمل تباہی سے بچانے کے لیے عوام کو کوئی مثبت قدم اٹھانا اور کوئی حتمی فیصلہ جلد کرنا ہوگا۔ مگر افسوس کہ عوام اب تک یہی سمجھ رہے ہیں کہ مسائل کی اس دلدل سے باہر کھڑا چند بے حسوں کا ٹولہ ہی ان کو اس عذاب سے نکالے گا۔ اسی لیے تو وہ بار بار ان کو مسلط کر کے ظلم کرنے کا لائسنس جاری کر دیتے ہیں سو ان کو تو برداشت کرنا پڑے گا۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ جو لوگ خود تو شاہانہ طرز زندگی میں آنکھ کھولیں اور زندگی کی ہر آسائش اُن کے در پر سجدہ ریز ہو بلفظ دکھ سے آشنا نہ ہوں، جنہوں نے کبھی عزت نفس مجروح ہوتے نہ دیکھی ہو، جن کو آٹے، دال اور چینی کے بھاؤ تک کا علم نہ ہو۔ ان کی نسلیں قومی زبان صرف اس لیے سیکھیں کہ آنے والے وقت میں الفاظ کے مکروہ جال میں عوام کو مزید الجھا کر ان پر حکمرانی کی تاریخ اور ظلم کی سیاہ رات کو طول دے سکیں۔ حکم صادر کرنے والے کیا جانیں کہ عام آدمی کے کیا مسائل ہیں اور ان کے شب و روز کیسے گزرتے ہیں۔ جو زندگی کو گزارے کی طرح گزار رہے ہیں۔ جب ان کو درد ہی نہ ہوا ہو تو وہ اس درد کا احساس کیسے کر سکتے ہیں؟ ان مسائل کا حل کیسے نکال سکتے ہیں جن سے وہ کبھی دوچار ہی نہ ہوئے ہوں بلکہ وہ تو سمجھتے ہیں کہ عوام کو مسائل میں الجھا کر رکھنے میں ہی ان کی حکمرانی کی بقاء ہے۔ اسی لیے وہ دن بدن اپنے اور عوام کے درمیان معاشی، معاشرتی، سماجی اور اخلاقی خلیج بڑھاتے جا رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ کر "پہچاننے" کے لیے ضروری ہے کہ اس طبقاتی خلیج کو کسی طرح ختم یا کم کیا جائے۔ "آزاد میڈیا" کے اس دور میں اگر خلوص نیت سے عوام کے شعور کو بیدار کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ کام "ناممکن" ہرگز نہیں۔ بس ذرا جرات کی ضرورت ہے۔

کافی عرصے سے ایک نجی چینل پر ایک پروگرام "ایک دن ۔۔۔ کے ساتھ"

بڑی باقاعدگی سے نشر ہو رہا ہے۔ محترم سہیل وڑائچ صاحب اپنے مخصوص اور منفرد انداز میں پاکستان کے علاوہ دوسرے ممالک کی بھی ممتاز شخصیات کے ساتھ "ایک دن" گزار چکے ہیں۔ ویسے تو کہتے ہیں "چوپڑیاں تے نالے دو دو" ادھر تو معاملہ دو سے بھی آگے نظر آتا ہے۔ دولت، شہرت، عزت، تفریح اور نت نئے "بڑے لوگوں" کے ساتھ انواع و اقسام کے لوازمات ..... جس سے سہیل وڑائچ صاحب کی صحت بھی عوامی مسائل کی طرح تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے۔ اتنی دیر سے ایک ہی طرح کا پروگرام کرنے سے "بوریت" کا عنصر بھی پیدا ہونا شروع ہو گیا ہے۔ اس پروگرام کو "جدت اور تازگی" بخشنے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں کوئی ایسی تبدیلی لائی جائے کہ تفریح کے ساتھ ساتھ اصلاحی پہلو بھی اس پروگرام کا حصہ بنیں۔ یہ پروگرام عوام اور حکمران طبقے کے درمیان ایک "پل" کا کام کرے۔ دونوں کو ایک دوسرے کے مسائل اور طرز زندگی سے آگاہی ہو۔ بس اس پروگرام کو ایک دن کی بجائے 2 دنوں کا کرنا ہوگا۔ جس کے پہلے حصے میں کسی صنعتکار کا "ایک دن مزدور کے ساتھ" یا پھر وڈیرے کا "ایک دن کسان کے ساتھ" یا یوں بھی ہو سکتا ہے کہ حکمران طبقے کے کسی فرد کا "ایک دن مصیبت زدہ کے ساتھ" اور دوسرے حصے میں عوام سے کسی فرد کا حکمران طبقے کی نمائندگی کرنے والے کسی فرد کے ساتھ ایک دن ہو تو انتہائی خوبصورت پروگرام ہو سکتا ہے۔ اس طرح دونوں کو ایک دوسرے کے شب و روز میں پیش آنے والی مشکلات کا حقیقی اندازہ ہو جائیگا۔ لیکن شاید ہمیں ابھی بادشاہوں اور اُن کے طفیلیوں کے قصیدے لکھنے سے فرصت نہیں۔ پروگرام کے پہلے حصے میں ایک عام شہری کی زندگی کو جزئیات سمیت دکھایا جائے اور دوسرے حصے میں اُسی شہری کے ٹیکسوں پر پلنے والے مفت خوروں کی پُر آسائش زندگی کو عوام کے سامنے پیش کیا جائے اور آخر میں سہیل وڑائچ دونوں کی زندگیوں کا تقابلی موازنہ پیش کریں تو کیا اچھی بات ہے۔ یہ کام ہے تو قدرے مشکل مگر تھوڑی سی اخلاقی جرات اور قربانی مانگتا ہے۔ اس میں ہو سکتا ہے سہیل وڑائچ کو بھی "ایک دن مزدور، کسان اور مصیبت زدہ کے ساتھ" گزارتے وہ درد محسوس ہو جو ان کو بالادست طبقات کے

ساتھ ایک دن گزارتے ہوئے کبھی محسوس نہیں ہوا۔اگر اس پروگرام کا دورانیہ طویل اور براہ راست ہوتو یہ کسی طور "Big brother" سے کم مقبول نہ ہو بشرطیکہ اس کو "سنسر" سے پاک نہ کیا جائے۔ایک عام شہری کی" حکمران طبقے کی شاہانہ زندگی کا ایک دن" تجرباتی طور پر دیکھ کر آنکھیں کھلیں گی تو ضرور......مگر حیرت سے کھلی کی کھلی بھی رہ جائیں گی۔دوسری طرف حاکم طبقے کی آنکھیں عوامی مسائل کو طبعی طور پر محسوس کر کے دہشت سے پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔عام انسان کی زندگی کو ایک دن کے لیے تجرباتی طور پر محسوس کرنے کے دوران کسی قسم کا پروٹوکول نہیں ہونا چاہیے۔24 گھنٹے عام آدمی کی طرح ہر اس مشکل کا سامنا عملی طور پر کریں جو ایک غریب کا مقدر بنا دیا گیا ہے۔عوام کو دونوں کے تجربات براہ راست دیکھنے کو ملیں تو اس میں مزاح کے ساتھ تعمیری اور تفریحی دونوں پہلو بھی شامل ہو جائیں گے۔ ہماری قوم تو اس وقت ٹی وی چینلو پر ٹاک شوز دیکھ دیکھ کر انٹرٹیمنٹ کو ترس گئے ہیں۔سہیل وڑائچ صاحب اور ان کی ٹیم کو اگر اس میں میری معاونت کی ضرورت ہو تو بندہ ناچیز کارِ خیر میں حصہ ڈال سکتا ہے۔

ہمارے ملک پر چند مخصوص طبقات کا قبضہ ہے۔ جن میں سیاستدان، بیوروکریٹس، عسکری قیادتیں، جاگیردار، صنعتکار، وڈیرے، سرمایہ دار، ریاستی ملاں، گدی نشین اور اب کچھ عرصے سے میڈیا کے بھی چند لوگ شامل ہیں۔ہر کوئی اپنے مفاد کے لیے عوام کو روٹی، کپڑا اور مکان، اسلام، روشن خیالی اور ایسے کئی کھوکھلے نعرے دینے کے بعد عوام پر مسلط ہو کر ان کو بے وقوف بناتے جا رہے ہیں۔اگر کسی جاگیردار کو کسی مزارعے کے ساتھ، صنعتکار کو مزدور کے ساتھ، وڈیرے کو ہاری کے ساتھ، جرنیل کو سپاہی کے ساتھ، سیاستدان کو ایک عام ووٹر کے ساتھ، بیوروکریٹ کو کلرک کے ساتھ، سرمایہ دار کو کسی غریب کے ساتھ......انہیں کی طرز زندگی میں ایک شب و روز گزارنا پڑے تو ہو سکتا ہے کہ "ایک دن مزدور، کسان یا مصیبت زدہ کے ساتھ" گزار کر حکمران طبقہ آئندہ بجٹ کی شمشیر میان سے نکالتے وقت جلادانہ طبیعت میں رحم کا کوئی عنصر شامل کر لیں۔دوسری طرف عوام "ایک دن ــــ کے ساتھ" گزار کر آئندہ الیکشن میں اپنے ووٹ کا صحیح

استعمال کر کے مہنگائی، بے روزگاری، عدم تحفظ اور غیر یقینی کی اس دلدل سے نکالنے والے کسی "مسیحا" کو تلاش کرنے کے قابل ہو سکیں جس کی دعا ہی کی جا سکتی ہے۔

دی نیشن لندن 24 جون 2011ء

قابل غور

☆ ملک کے اندرونی معاملات کو پولیس اتنی کامیابی سے کنٹرول کرتی ہے کہ ریاست کو لاء اینڈ آرڈر کے لیے فوج کی ضرورت نہیں پڑتی۔

☆ ہٹلر کے دیس میں آج بھی نظم وضبط کا یہ عالم ہے کہ یورپ

کے ممالک اس کی تقلید بڑے شوق سے کرتے ہیں۔

☆ یہاں مرد اور عورت کی جوڑی میں ہی ڈیوٹی کے فرائض انجام دینے کا خاص انداز ہے۔اس میں ایک تو بوریت کا پہلو بھی کم ہو جاتا ہے ساتھ ضرورت پڑنے پر عورت کی عورت اور مرد کی مرد جامہ تلاشی بھی لے سکتا ہے۔

☆ پولیس کی ٹریننگ کے بعد ان کے پاس تعلیم کی اصل ڈگری ہو نہ ہو مگر ''بدتمیزی'' میں پی ایچ ڈی ضرور ہوتی ہے۔

☆ یہ معاملہ عدالت تک گیا جہاں میٹروپولیٹن پولیس کو مجرم قرار دیا گیا۔ ادارے کو ایک لاکھ پچھتر ہزار پاؤنڈ جرمانہ، تین لاکھ پچاسی ہزار پاؤنڈ لیگل خرچہ بھی ادارے کے ذمہ قرار دیا گیا۔ jeans charles de Menezes کے ورثاء کو بھاری معاوضہ بھی ادا کیا گیا۔

☆ اگر لاکھوں کی فوج میں کوئی فرد واحد کسی جرم کا مرتکب ہوتا ہے تو اس سے ساری فوج کو ذمہ دار ٹھہرانا درست بات نہیں۔

❁-----❁-----❁

قانون شکن محافظوں سے کیا سلوک کیا جائے......؟

جرمنی کو "پولیس کی ریاست" بھی کہا جاتا ہے۔جہاں پر پولیس کے اختیارات کا دائرہ کار برطانیہ اور یورپ کے دیگر ممالک کے مقابلے میں زیادہ وسیع ہے۔ایک پولیس آفیسر کی گواہی عام شہری سے دوہری قوت کی حامل ہوتی ہے۔ملک کے اندرونی معاملات کو پولیس اتنی کامیابی سے کنٹرول کرتی ہے کہ ریاست کو لاء اینڈ آرڈر کے لیے فوج کی ضرورت نہیں پڑتی۔عوام کے جان و مال کی حفاظت اور خدمت ان کا اولین فرض ہوتا ہے۔جس کو وہ بڑی دیانتداری سے نبھاتے ہیں۔ہٹلر کے دیس میں آج بھی نظم وضبط کا یہ عالم ہے کہ یورپ کے ممالک اس کی تقلید بڑے فخر سے کرتے ہیں۔ڈیڑھ دہائی ان کے درمیان رہ کر بہت سے ایسے اچھے واقعات کا تجربہ ہوا جن کو اپنے دیس میں دیکھنے کی حسرت ہی رہی۔ستمبر 1997ء کی اک شام تھی، میں کسی کام کی غرض سے گھر سے نکلا ابھی اپنے شہر کی حدود سے نکل کر ہائی وے پر گاڑی چلائی ہی تھی کہ میری کار کو پولیس کی گاڑی نے اوور ٹیک کر کے مجھے گاڑی سائیڈ پر پارک کرنے کا سگنل دیا۔جیسے ہی میں نے پولیس کی گاڑی کے پیچھے اپنی کار کھڑی کی۔دو پولیس آفیسرز باہر نکلے جن میں حسب معمول ایک مرد اور دوسری خاتون تھی۔یہاں مرد اور عورت کی جوڑی میں ہی ڈیوٹی کے فرائض انجام دینے کا خاص انداز ہے۔اس میں ایک تو بوریت کا پہلو بھی کم ہو جاتا ہے ساتھ ضرورت پڑنے پر عورت کی عورت اور مرد کی مرد جامہ تلاشی بھی لے سکتا ہے۔مجھے بڑی عزت سے سلام کرنے کے بعد انہوں نے لائسنس دکھانے کو کہا۔تب مجھے احساس ہوا کہ میں اپنا پرس ہی گھر بھول آیا ہوں۔میری تاریخ پیدائش اور نام پوچھ کر انہوں نے اپنے موبائل کمپیوٹر پر میرا ریکارڈ چیک کیا۔قانون کے مطابق گاڑی چلاتے وقت ڈرائیونگ لائسنس کا پاس ہونا لازمی تھا۔مگر میرا سابقہ ریکارڈ دیکھ کر

انہوں نے صرف وارننگ دی۔پھر انہوں نے مجھے روکنے کی وجہ بتائی کہ میری ڈرائیونگ سائیڈ والی ہیڈ لائٹ کام نہیں کر رہی تھی۔انہوں نے مجھ سے اضافی بلب کا پوچھا مگر میرے پاس نہ تھا۔انہوں نے کہا کہ تمہاری جان کی حفاظت کے لیے یہ ضروری ہے کہ تم اپنی پسنجر سیٹ کی طرف والی ہیڈ لائٹ کا بلب نکال کر ڈرائیونگ سیٹ والی ہیڈ لائٹ میں لگا لو۔اس سے میری گاڑی سامنے سے آنے والی ٹریفک کو اس طرح سے نظر آئے گی کہ حادثے کا اندیشہ کم سے کم ہو۔میں نے کہا کہ مجھے تو گاڑی کا بلب تبدیل کرنا نہیں آتا۔وہ دونوں مسکرا پڑے۔مجھے گاڑی کا بونٹ کھولنے کو کہا۔لڑکی نے ٹارچ سنبھالی اور مرد پولیس آفیسر نے بلب ایک طرف سے نکال کر دوسری طرف لگا دیا۔پھر مجھے گاڑی اپنی گاڑی کے پیچھے چلانے کو کہا۔جب ہم ایک پٹرول پمپ پہنچے تو انہوں نے مجھے ایک نیا بلب خریدنے کو کہا۔میں نے کہا کہ میں تو پرس گھر بھول آیا ہوں میرے پاس اس وقت تو پیسے یا بینک کارڈ نہیں۔مرد پولیس آفیسر نے اپنی جیب سے بلب خرید کر دیا۔اس کے بعد مجھے اپنے سامنے اس کو لگانے کو کہا تاکہ اگر مجھے مدد کی ضرورت ہو تو وہ میری مدد کر سکیں۔آخر میں اس نے اپنا نام اور اکاؤنٹ نمبر کی تفصیل مجھے دیکر 5.95 مارک اپنے اکاؤنٹ میں بھیجنے کو کہا۔میں نے شکریہ کہا تو اس نے کہا کہ اس میں شکریہ کس بات کا......؟ میں نے اپنی ڈیوٹی کی ہے۔عوام کے جان و مال کی حفاظت اور انسانیت کی خدمت کرنے کی ان کو تنخواہ ملتی ہے۔جہاں تک 5.95 مارک کا تعلق ہے وہ تم کل تک ادا کر دینا۔یہ کہہ کر وہ تو چلے گئے مگر میرے دل میں اپنا حسن سلوک ہمیشہ کے لیے نقش کر گئے۔ساتھ ہی مجھے اپنے ملک میں پولیس اور قانون نافذ کرنے والے ادارے یاد آ گئے۔جو عوام سے اپنی "خدمت" کروانا ہی فرض سمجھتے ہیں۔جو یونیفارم پہن کر ایسی زبان بولنا شروع کر دیتے ہیں کہ ایک شریف النفس ان سے ایسے دور بھاگتا ہے جیسے خالص برہمن "شودر اور ماس مچھی" سے......! پولیس کی ٹریننگ کے بعد ان کے پاس تعلیم کی اصل ڈگری ہو نہ ہو مگر "بدتمیزی" میں پی ایچ ڈی ضرور ہوتی ہے۔عوام کے جان و مال کے تحفظ کے لیے پولیس آج تک اپنا لوہا منوانے میں ناکام ہے۔مگر عوام کا

فوج اور رینجرز پر ہمیشہ سے بڑا ''مان'' ہے۔اگر کسی کے گھر میں کوئی 'فوجی' ہوتا تو سارا محلّہ اور رشتہ دار اس کا تعارف بڑے فخر سے کرواتے تھے۔مگر بد قسمتی سے ملکی حالات کچھ ایسے ہوتے جا رہے ہیں کہ عوامی تاثر ان کے متعلق بھی تبدیل ہو رہا ہے۔حالیہ دنوں میں یکے بعد دیگرے کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے ہیں جن میں قانون نافذ کرنے والے ہی قانون شکنی کرتے نظر آئے ہیں۔حساس اداروں پر دہشت گردی کے متعدد واقعات نے بھی عوام کے دلوں میں ''عدم تحفظ اور بے یقینی'' کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔خروٹ آباد اور کراچی کے واقعات سے یہ بات بھی ثابت ہونا شروع ہو گئی ہے کہ حساس اداروں کو جتنا زیادہ عوام اور پولیس کے ساتھ رکھا جائے گا یہ اپنا وقار کھونا شروع کر دیتے ہیں۔خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے......پولیس تو جعلی مقابلے میں معصوم لوگوں کی جان لینے میں مشہور ہے اب یہ رنگ حساس اداروں کو بھی چڑھتا جا رہا ہے۔پولیس اور حساس اداروں کا کام تو عوام کی جان و مال کی حفاظت کرنا ہے۔اگر یہی محافظ معصوم شہریوں کی جان لینا شروع کر دیں۔اس پر یہ ظلم کہ اپنے سیاہ کارنامے کو جھوٹ کی سفید چادر لپیٹ کر خود کو ہیرو ظاہر کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے۔کسی بھی مہذب معاشرے کا یہ شیوا نہیں ہوتا۔

07/07 لندن بم دھماکوں کے بعد برطانیہ جہاں پولیس کے اختیارات اتنے محدود تھے کہ وہ کسی شہری کو روک کر شناختی کارڈ دیکھنے کے مجاز نہ تھے۔ان کے اختیارات کو جرمن پولیس کی طرح تقویت دی گئی۔شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ ۲۲ جولائی 2005ء کو ایک معصوم برازیلین الیکٹریشن محض اس شبے کی بنیاد پر کہ اس کے قدوخال 07/07 کی دہشت گردی میں ملوث ''عثمان حسین'' نامی لڑکے سے ملتے تھے......سادہ کپڑوں میں ملبوس پولیس آفیسرز کی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔جب معاملے کی تحقیق ہوئی تو سی سی ٹی وی فوٹیج اور چشم دید گواہوں نے ثابت کیا کہ پولیس سے زیادتی ہوئی۔انہوں نے اس نوجوان کو اپنا تعارف نہ کروایا، مسلح ہونے کا نہ بتایا، گولی مارنے سے قبل وارننگ نہ دی، اس معاملے کو میڈیا اور عوام کی خاص طور پر ہمدردی حاصل تھی۔جس کا اثر

میٹروپولیٹن پولیس کمشنر سر آئن بلیئر نے اچھی طرح محسوس کیا۔انہوں نے مقتول کے ورثاء سے معافی مانگی۔یہ معاملہ عدالت تک گیا جہاں میٹروپولیٹن پولیس کو مجرم قرار دیا گیا۔ادارے کو ایک لاکھ پچھتر ہزار پاؤنڈ جرمانہ، تین لاکھ پچاسی ہزار پاؤنڈ لیگل خرچہ بھی ادارے کے ذمہ قرار دیا گیا۔jeans charles de Menezes کے ورثاء کو بھاری معاوضہ بھی ادا کیا گیا۔عدالت نے برازیلین نوجوان کو بے قصور قرار دیا۔اس واقعے کو unlawful killing قرار دیا۔حکومتی سطح پر بھی اس واقعے کی بھرپور مذمت کی گئی۔برازیل کی حکومت سے بھی دکھ اور ہمدردی کا اظہار کیا گیا اور ساتھ معافی بھی مانگی گئی۔میڈیا میں اس کو پولیس کی بربریت اور جھوٹا ڈرامہ کے ناموں سے منسوب کیا گیا۔

اسی طرح 2 اپریل 2009ء کو لندن کی G20 کانفرنس کے خلاف مظاہروں میں ایک خاتون نکولا فشر پولیس آفیسر سارجنٹ ڈلوری ٹوئی کے ڈنڈے کی زد میں آ گئی۔عدالت نے ٹوئی پر فرد جرم عائد کر کے ہرجانے کی رقم ادا کرنے کا کہا گیا۔اسی مظاہرے میں پولیس کانسٹیبل سائمن ہارڈووڈ نے ایک ۴۷ سالہ شخص ٹاملسن کو دھکا مار کر زمین پر دے مارا۔بد قسمتی سے ٹاملسن کچھ منٹوں میں دم توڑ گیا۔یہ سارا واقعہ بھی کیمرے کی آنکھ نے محفوظ کیا تھا۔میٹروپولیٹن پولیس کے ڈپٹی ہائی کمشنر روڈ فنس پیٹرک نے شدید مذمت کی اور دکھ و ندامت کا اظہار کرنے کے علاوہ ساری قوم سے معافی مانگی۔پولیس آفیسر پر بھی فرد جرم عائد کی گئی۔ورثاء کو ہرجانے کی رقم ادا کی گئی۔

ہمارے ہاں ایک تو اپنے فرض سے غفلت برتی جاتی ہے اس کے بعد اپنی بربریت کو چھپانے کے لیے من گھڑت کہانی بنا کر متاثرہ خاندان کے زخموں پر نمک پاشی کی جاتی ہے۔مہذب معاشرے میں اگر کسی فرد سے غلطی سرزد ہو جائے تو اس ادارے کا سربراہ قوم سے معافی مانگنے میں نہ دیر لگاتا ہے اور نہ ہی شرماتا ہے۔عدالت بھی بلا امتیاز انصاف کر کے اپنی خودمختاری اور آزادی کا مظاہرہ کرتی ہے۔

خروٹ آباد اور کراچی کے واقعات حالات کی رو میں بہہ کر عدالت تک جا پہنچے ہیں۔قوم نے تو چیف جسٹس سے بڑی امیدیں وابستہ کر لی تھیں۔اب دیکھیں کہ

عدالت کیا فیصلہ کرتی ہے؟ سیاہ قانون کی اس تاریکی میں انصاف کی مشعل کبھی تو جلے گی؟ ماضی میں بھی ایسا بہت بار ہو چکا ہے کہ چند دن کسی معاملے کا بڑا زور رہتا ہے پھر اس کو سدا کے لیے کھڈے لائن لگا دیا جاتا ہے۔ آج تک کبھی تاریخی فیصلہ سنا کر مثال قائم کرنے کی بھی کوشش نہیں کی گئی۔ پچھلے سال سیالکوٹ میں دو بھائیوں کو بربریت کا نشانہ بنایا گیا اور اسی طرح جھوٹا کیس بھی بنانے کی کوشش کی گئی۔ پھر میڈیا پر فوٹیج آ گئی۔ بڑا واویلا مچا...... پھر معاملہ منطقی انجام کو پہنچنے سے قبل ہی اندھے کنوئیں میں پھینک دیا گیا۔ اس طرح کے واقعات ہماری زندگی کا ایک لازمی جزو بن گئے ہیں۔ اس ریت کو ختم کرنے کے لیے کسی کو تو پہلا قدم اٹھانا ہو گا۔ اب سب کی نظریں عدالت پر ہیں......!!! مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ کسی فرد کی غفلت، کوتاہی، یا فرض سے بد دیانتی پورے ادارے کا جرم تصور کیا جائے۔ یہ وہی افواج پاکستان ہیں جو ملک و قوم کی حفاظت میں اپنی جانوں کے نذرانے پیش کرتے ہیں۔ اگر لاکھوں کی فوج میں کوئی فرد واحد کسی جرم کا مرتکب ہوتا ہے تو اس سے ساری فوج کو ذمہ دار ٹھہرانا درست بات نہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں بھی جہاں انسانی حقوق کا علم سب سے اونچا رکھا جاتا ہے وہاں بھی قانون نافذ کرنے والے اداروں سے کوتاہیاں ہو جاتی ہیں مگر عدالت ایسا فیصلہ کرتی ہے کہ اداروں پر عوام کا اعتماد بحال رہے۔ آج اگر ہم نے ان معاملات کو سنجیدگی سے نہ لیا تو ملک دشمن عناصر اپنے عزائم میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ جن کا منصوبہ ہی یہ ہے کہ افواج پاکستان اور عوام کے درمیان بد اعتمادی پیدا ہو جائے۔ پھر لیبیا والے حالات بنا کر یو۔ این۔ او کی ایک قرارداد پاس کروا کر پاکستان کے ایٹمی اثاثوں تک رسائی حاصل کی جائے۔ اس کے لیے ہم کو متحد ہو کر پہلے اندر کا دشمن ختم کرنا ہو گا۔

حقیقت میں افواج پاکستان ہی ہماری اصل طاقت ہیں اور ملک و قوم کی خاطر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے والوں کو لگتا ہے کسی ''گہری سازش'' میں دھکیل کر عوام الناس کی نظروں میں ان کا وقار ختم کیا جا رہا ہے۔ حالیہ چند واقعات کو اگر سنجیدگی سے دیکھا جائے تو محسوس ہو گا کہ بڑی پلاننگ سے بری، بحری، فضائیہ اور سی آئی اے کو

ٹارگٹ کر کے دنیا اور پاکستانی قوم کے آگے ان کا تشخص پامال کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اداروں پر عوامی اعتماد بحال کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ملک میں عدل وانصاف کا بول بالا ہو۔ کیونکہ کفر کی حکومت تو چل سکتی ہے مگر ناانصافی کی نہیں۔ انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ اگر قانون کا محافظ بھی قانون شکنی کرے تو اس کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے خواہ اس کا تعلق کسی بھی ادارے سے ہو۔

(دوسری قسط)

(1) روزنامہ ''دن'' لاہور یکم جولائی 2011ء

(2) روزنامہ ''دن'' لاہور 3 جولائی 2011ء

قابل غور

☆ جشن عید میلا دالنبی ہو یا جشن آزادی، عیدالفطر ہو یا عید قربان ہر موقع پر اپنے دیس میں منائے ہوئے تہوار لا شعوری طور پر آنکھوں کے سامنے پریوں کی طرح رقصاں ہو جاتے ہیں۔

☆ پاکستان کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ سوائے عمران خان کے آج تک کوئی کپتان عزت سے رخصت نہیں کیا گیا۔

☆ ہمیں اپنے ان کھلاڑیوں کو جنہوں نے اپنا عروج کا دور گزار لیا ہو اگر ان کو ٹیم میں مزید نہ رکھنا ہو تو ان کو ''قربانی کا بکرا'' بنا کر ذلیل نہ کیا جائے بلکہ ان کو یادگار الوداعی میچ کھلا کر شان سے رخصت کیا جائے۔

☆ بدقسمتی سے سچ کا ساتھ دینے سے لوگ ڈرتے ہیں۔شاہد آفریدی نے ایسا کیا جرم کر دیا کہ وہ ''نور نظر'' سے ''گھورنظر'' بن گیا؟

وی وی آئی پیز بکرے

پردیس میں دیس، دیسی چیزوں، دوست اور رشتہ داروں کی قدر کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔خاص طور پر دن دیہاڑ اور قومی تہواروں پر اپنے وطن سے دوری کا احساس کچھ اور ہی شدت اختیار کر جاتا ہے۔جشن عید میلاد النبی ہو یا جشن آزادی، عیدالفطر ہو یا عید قربان ہر موقع پر اپنے دیس میں مناتے ہوئے تہوار لاشعوری طور پر آنکھوں کے سامنے پریوں کی طرح رقصاں ہو جاتے ہیں۔

عیدالاضحیٰ پر بکرے کو گھر لا کر اس کی خوب خاطر کرنا.....اس کا سنگھار کر کے گلیوں میں لے کر گھومنا۔قربانی کے بکرے کا عام بکروں سے کیا موازنہ......یہ تو بڑا "وی وی آئی پی" بکرا ہوتا ہے۔عید کا دن آتے ہی ہم اس وی وی آئی پی کو مکمل پروٹوکول کے ساتھ مرچ مصالحے لگا کر ہضم کر جاتے ہیں۔قربانی کے ان بکروں کا حال بھی ہمارے ملک کے ہر دلعزیز کھیل کرکٹ کے کپتانوں جیسا ہی ہے۔کرکٹ بورڈ نے بھی جس کھلاڑی کی قربانی دینی ہوتی ہے اس کو کپتان بنا دیا جاتا ہے۔چند دن وی وی آئی پی پروٹوکول اور پھر اس کو اپنے ذاتی مفادات کی خاطر "قربان" کر دیا جاتا ہے۔جو اپاہج بنا رہے اس کی "باری" کبھی نہیں آتی اور جو زیادہ بہ بہ کرے اس کو فوری طور پر "ڈسپلن کی چھری" کے نیچے لا کر میڈیا اور عوام کے آگے تڑپنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔پی سی بی کے چیئرمین اعجاز بٹ صاحب کی صحت اور حجم دیکھ کر تو یہی دکھائی دیتا ہے کہ ان کا ہر دن عید قربان اور ہر رات شب برات ہوتی ہو گی۔شاید یہ گوشت کی گرمی ہے کہ ان کو کبھی ٹھنڈے دماغ سے سوچنے ہی نہیں دیتی اور مرغن لذیز غذائیں کھا کھا کر ان کی آنکھوں پر چربی چڑھ گئی ہے۔جبھی تو عوام کی آواز سنائی دیتی ہے اور نہ میڈیا کا واویلا......!نہ ہی ان کو بین الاقوامی سطح پر پاکستان کی گرتی ہوئی ساکھ کا خیال ہوتا

ہے۔زرداری صاحب نے تو ان کو کرکٹ بورڈ کا چیئرمین بنایا تھا مگر دنیا کرکٹ میں اُن کو "Cheer Man" کے طور پر پہچانا جاتا ہے۔سی ٹرن کے ماہر بٹ صاحب کا دور بڑا یادگار ہے۔انہوں نے ایسے کارنامے انجام دیئے ہیں جس سے بیرونی ممالک کے کرکٹ بورڈ کے کلیدی عہدیدار نے ان کو مسخرہ تک کہہ دیا۔ان کی رکنیت معطل کرنے کی سفارش بھی کی گئی۔پاکستان کرکٹ ٹیم کے دورہ انگلستان کے بعد ان کو اپنے بیان کی پاداش میں معافی مانگنی پڑی۔اس میں خاص بات یہ تھی کہ معافی نامہ بھی برطانیہ کے بورڈ نے اپنی مرضی کے الفاظ میں لکھوایا تھا۔اپنے کھلاڑیوں کا دفاع کرنے کی بجائے یہ خود ہی ان کو انتقامی کارروائی کا نشانہ بناتے ہیں۔بورڈ کے عہدیدار اپنی روایت کو بڑی مستقل مزاجی سے برقرار رکھے ہوئے ہیں اور کھلاڑیوں بالخصوص کپتانوں کو "کھڈے لائن" لگانے میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔تعجب اس بات پر ہے کہ سابقہ کھلاڑی بھی اس مکروہ کام میں حصہ دار بن رہے ہیں۔کوچ وقار یونس کو شاید اپنی ریٹائرمنٹ کا دن بھول گیا ہے کہ کن حالات میں "بنانا سوئنگ کے سلطان" کو کرکٹ سے خیر باد ہونا پڑا تھا؟ جہاں تک ٹیم منیجر انتخاب عالم کے انتظامی صلاحیتوں کا تعلق ہے تو وہ پچھلے چند دورں میں سب پر عیاں ہو چکی ہیں۔

ہمارے ملک میں سب سے مشکل کام سچ بولنا اور اُس کا ساتھ دینا مشکل ترین کام ہے۔بد قسمتی سے سچ کا ساتھ دینے سے لوگ ڈرتے ہیں۔شاہد آفریدی نے ایسا کیا جرم کر دیا کہ وہ "نور نظر" سے "گھور نظر" بن گیا؟ معاشی بد حالی سے چور ہمارے ملک میں "کرکٹ بورڈ" ہی ایسا ادارہ بچا ہے جس کے پاس کچھ پیسہ ہے۔اس پر بھی چند لوگ اپنی ہوس بھری نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔اپنے مفادات کی لالچ میں وہ اپنے منصب اور فرض سے بھی غافل ہو گئے ہیں۔کرکٹ بورڈ کو یہ سوچنا چاہیے کہ جن سپر سٹارز کھلاڑیوں کی کارکردگی کی بدولت ان کی روزی روٹی چل رہی ہے ان کی عزت اور حقوق کا بھی مناسب خیال رکھا جائے۔اگر کھلاڑی ہیں تو بورڈ ہے.....اگر کھلاڑی ہی نہ ہوں گے تو بٹ صاحب خود تو میدان میں اترنے سے رہے.....! پاکستان کی تاریخ اس

بات کی گواہ ہے کہ سوائے عمران خان کے آج تک کوئی کپتان عزت سے رخصت نہیں کیا گیا۔ کچھ سپر سٹارز کو تو الوداعی میچ کھلانے کی بھی زحمت نہ دی گئی۔ یہ بات تو خاص طور پر کوچ وقار یونس کو اچھی طرح یاد ہوگی۔ ہمارے ملک میں پہلے ہی کوئی کھیلنے کو راضی نہیں۔ اب نت نئے "شوشے" ہماری جگ ہنسائی کا سبب بنتے دکھائی دے رہے ہیں۔ آئی سی سی کو درخواست بھی دی گئی ہے کہ کرکٹ سیاسی اثر و رسوخ سے بالاتر کیا جائے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ ہمارے ملک میں کون سا ایسا کام ہے جس میں سیاسی اثر و رسوخ شامل نہ ہو......؟ گلی کا تھڑا، محلے کی مسجد، تھانہ، کچہری، تعلیمی ادارے، غرضیکہ کوئی بھی جگہ ایسی نہیں جہاں سیاست کا اثر و رسوخ کارفرما نہ ہو۔ ہمارے ہاں کسی مقام تک پہنچنے اور اس پر قائم رہنے کے لیے سیاسی اثر و رسوخ کا بڑا عمل دخل ہے۔ ٹیم میں آنا اور اس میں جگہ برقرار رکھنا بھی سیاسی اثر و رسوخ کی مرہون منت ہے نہ کہ کھلاڑیوں کی کارکردگی۔ اگر کھلاڑی کی کارکردگی کو معیار بنایا جاتا تو محمد یوسف کو پلیئر آف دی ایئر کا ایوارڈ ملا۔ اس کا صلہ اس کو یہ دیا گیا کہ بورڈ والوں نے اس کو "قربانی کا بکرا" بنا کر کب کا کھڈے لائن لگا دیا ہے۔ کرکٹ وہ واحد کھیل ہے جس میں عوام سب اختلافات بھول کر یکجا ہو جاتی ہے۔ ورلڈ کپ اس کا منہ بولتا ثبوت ہم سب دیکھ چکے ہیں۔ تو کیا ایسے کھیل کو بھی سیاست کا کھیل بنا کر اس کا ستیاناس کر دیا جائے گا؟ اس عوامی کھیل میں حالیہ تنازعے کا فیصلہ عوام نے ایک بار پھر بٹ صاحب کے حق میں نہیں دیا۔ میڈیا اور عوامی دباؤ کو دیکھ کر سیاسی قوتیں بھی متحرک ہو گئیں اور معاملہ عدالت سے واپس لے لیا گیا۔ کچھ دو اور کچھ لو کی پالیسی پر عمل درآمد ہوا مگر سب سے آخر میں اگر کچھ ہوا تو وہ صرف ملک کی بدنامی تھی۔ یہی بات اگر چار دیواری میں طے ہو جاتی تو حالات مختلف ہوتے۔ آئندہ ایسے واقعات رونما نہ ہوں اس کے لیے اب سنجیدگی سے سوچنا ہو گا۔ آئے دن قربانی کے بکرے بنانے کا رواج ختم کیا جانا چاہیے۔ کرکٹ بورڈ کو چلانے کے لیے دیانتدار اور پیشہ ور افراد کا انتخاب کیا جانا چاہیے۔ عروج اور زوال زندگی کے ہر شعبے کا حصہ ہیں۔ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے ہمیں اپنے ان کھلاڑیوں کو جنہوں

نے اپنے عروج کا دور گزار لیا ہو اگر ان کو ٹیم میں مزید نہ رکھنا ہو تو ان کو "قربانی کا بکرا" بنا کر ذلیل نہ کیا جائے بلکہ ان کو یادگار الوداعی میچ کھلا کر شان سے رخصت کیا جائے۔ کھلاڑیوں کو بھی کسی قسم کا بیان دینے سے پہلے یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ وہ بین الاقوامی سطح پر پاکستان کے سفیر ہیں اور ان کے منہ سے نکلا ہوا ایک لفظ ملک کی بدنامی کا باعث بن سکتا ہے۔

دنیا کا کوئی نظام بغیر اصول اور قانون کے نہیں چل سکتا۔ جس طرح کائنات کا نظام قدرتی اصولوں اور قوانین پر چلتا ہے اسی طرح انسان بھی گھر، ادارے اور ملک چلانے کے لیے قانون اور اصول وضع کرتے ہیں۔ جن پر عمل پیرا ہو کر گھر، ملک اور ادارے کے نظام کو احسن طریقے سے چلایا جا سکتا ہے۔ وہ گھر، ادارے اور ملک کامیاب رہتے ہیں جو اپنے بنائے ہوئے قوانین کو سب پر یکساں لاگو کریں۔ انصاف کی بنیاد ہی بلا امتیاز فیصلے پر ہوتی ہے۔ پی سی بی بھی اک ادارہ ہے جس کے اپنے اصول اور ضابطے ہیں۔ مگر اس میں سزا ہمیشہ کھلاڑیوں کو ہی کیوں ہوتی ہے؟ کیا چیئرمین صاحب نے آج تک کوئی غلطی نہیں کی؟! اگر ان سے یا بورڈ کے باقی عہدیداروں سے غلطی سرزد ہوئی ہے تو ان کو کبھی سزا یا جرمانہ ہوا؟! اگر ٹیم منیجر اور کوچ سے غلطی ہو تو ان کو بھی تو سزا ہونی چاہیے۔ مگر محسوس ہوتا ہے یہ سب عہدیدار قانون سے بالاتر ہیں۔ تمام قوانین اور ضابطوں کا اطلاق صرف کھلاڑیوں پر ہی ہوتا ہے۔ پاکستانی کرکٹ میں مزید نظم و ضبط لانے کے لیے کھلاڑیوں، کوچز، منیجر اور بورڈ کے تمام عہدیداروں کو قوانین اور ضابطوں کی پاسداری کرنی ہوگی۔ صرف کھلاڑی اور خاص طور پر کپتان کو ہی "وی وی آئی پی قربانی کا بکرا" نہیں بنانا چاہیے۔

روزنامہ "دن" لاہور 9 جولائی 2011ء

دی نیشن لندن 29 جولائی 2011ء

قابل غور

☆ ماپ تول کے میزان سے قوم کے مجموعی اخلاقی رویے کا پتا بھی چلتا ہے اور جو قومیں کم تولتی اور کم ماپتی ہیں اُن کے بارے میں یہ رائے قائم کرنے کیلئے زیادہ عقل کی ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ دوسری قوموں کا حق مارنے میں بھی تاخیر نہیں کریں گی۔

☆ یہاں صحت کا قومی ادارہ NHS بھی سگریٹ نوشوں کے لیے رمضان کی خصوصی پیشکش کا اعلان کرتا ہے کہ وہ لوگ جو رمضان میں سگریٹ نوشی ترک کرنے کے خواہاں ہوں ان کو علاج و معالج میں خصوصی رعائت دی جاتی ہے۔ تا کہ رمضان میں ان کو پریشانی نہ ہو

☆ جیسے عید قربان پر آپس میں ہی گوشت کا تبادلہ کر کے عید منانے کا رواج بڑھتا جا رہا ہے۔ اسی طرح رمضان میں ایک مخصوص طبقہ آپس میں ہی فائیو سٹار ہوٹلوں میں افطار پارٹیوں کا سلسلہ شروع کرتا ہے جو عید ملن پارٹی تک جا ری رہتا ہے

☆ سیاسی پہلوان افطار پارٹی پر انواع و اقسام کے لوازمات کے ساتھ پنجہ آزمائی کر کے روزے کو چت کرتے نظر آتے ہیں

اشاعت خاص

رمضان المبارک

سورہ شوریٰ میں ہے کہ خدا نے اس کتاب (قرآن شریف) کو حق کے ساتھ نازل کیا اور اس کے ساتھ میزان بھی اتاری۔ اس سے یہ سمجھنا انتہائی آسان ہے کہ اللہ کے نزدیک میزان کی اہمیت کیا ہو سکتی ہے۔ سورہ انعام میں مسلمانوں کو تائید کی گئی ہے کہ تم ماپ اور تول پورا پورا دو اور اس کے بعد رسول پاکؐ سے فرمایا کہ تم لوگوں سے کہہ دو کہ یہ ہے میرا سیدھا راستہ۔

تم راستے کی پیروی کرو یعنی ماپ اور تول پورا پورا دینا خدا کا حکم اور اس کے سچے رسولؐ کا راستہ ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو لوگ ماپ یا تول میں کمی کرتے ہیں وہ خدا کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور رسول اللہؐ کے راستے کو چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ اللہ کی طرف سے جتنے رسول آئے اُن کا فریضہ یہ تھا کہ وہ ان خرابیوں کو دور کریں جو لوگوں میں عام ہوں اور انہیں خدا کے بتائے ہوئے رستے پر لگائیں۔ حضرت شعیب علیہ السلام جس قوم کی طرف آئے اُس کی سب سے بڑی خرابی یہی تھی کہ وہ کم تولتے اور کم ماپتے تھے۔ ماپ تول کے میزان سے قوم کے مجموعی اخلاقی رویے کا پتا بھی چلتا ہے اور جو قوم کم تولتی اور کم ماپتی ہیں۔ اُن کے بارے میں یہ رائے قائم کرنے کے لئے زیادہ عقل کی ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ دوسری قوموں کا حق مارنے میں بھی تاخیر نہیں کریں گی۔ رمضان المبارک کی آمد کے ساتھ ہی روزمرّہ کے تمام معاملات میں ایک خاص تبدیلی دیکھنے کو ملتی ہے۔ جس میں سونے، جاگنے، کھانے، پینے کے اوقات معمول سے ہٹ کر ہوتے ہیں۔ اس ماہ میں صرف طبعی تبدیلی نہیں بلکہ روحانی تبدیلی بھی واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ اس ماہ میں سحر و افطار کے علاوہ

عبادات بھی بڑے اہتمام سے کی جاتی ہیں۔ ہر مسلمان اس مہینے کا انتظار شدت سے کرتا ہے۔ جس میں کچھ تو رحمت، بخشش اور مغفرت کے حصول کے لیے پہلے سے بھی زیادہ شدت سے خدا تعالیٰ کے آگے سجدہ ریز ہونے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرتے ہیں۔ بعض لوگ اس کو مفادات کے حصول کو بنیاد بنا کر اس مہینے کا انتظار کرتے ہیں۔ وہ ذخیرہ اندوزی کے تندور میں غریبوں کے خون، پسینے اور مجبوریوں کا ایندھن جلا کر اس کو لالچ کی ہوا دے کر ہوس کی آگ کو اتنا تیز کر دیتے ہیں کہ اس سے نکلنے والی مہنگائی کی چنگاریاں سارے ملک میں پھیل جاتی ہیں۔ جس سے کبھی بھی غریب عوام کا دامن محفوظ نہیں رہتا۔ حیران کن بات یہ ہے کہ دولت کے یہ پجاری بھی اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ بڑے فخر سے اسلامی جمہوریہ پاکستان کا اعلیٰ شہری ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ رمضان کی برکات اور فضیلتوں کو بھول کر صرف مادیت کے حصول میں سرگرداں ہو جاتے ہیں۔

ماہِ رمضان کا اثر پوری دنیا میں نظر آتا ہے۔ جہاں مسلم ممالک ماہ رمضان کا استقبال بڑے عقیدت اور جذبے سے کرتے ہیں وہاں بہت سے ایسے ممالک جن میں مسلم اقلیت میں ہیں مگر وہاں بھی رمضان کے مہینے کو بڑی عزت اور شان سے خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ یہاں پر بسنے والے اقلیتی مسلمانوں کو ماہِ رمضان میں مختلف اضافی سہولیات دے کر اس امر کو یقینی بنانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ صوم و صلوٰۃ میں کسی کو دشواری پیش نہ آئے۔ کھانے پینے خاص طور پر ایشین پروڈکٹس پر رمضان کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ اس ضمن میں برطانیہ نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ماہِ رمضان کی آمد کا اعلان عملی طور پر اشیائے خورد و نوش پر خصوصی پیشکش اور سہولیات دے کر کیا ہے۔ ماہِ شعبان کے پہلے عشرے میں ہی بازاروں اور بڑے سُپر سٹورز پر خصوصی آفرز کے سائن بورڈز نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ رمضان کے خصوصی پیکیج اور رعایت کا اعلان اخباروں میں اشتہاروں اور کمپنی کی اپنی ویب سائٹ پر بھی کیا جاتا ہے۔ سُپر سٹورز میں داخل ہوں تو رمضان کی خصوصی آفرز کے بورڈ آویزاں کیے جاتے ہیں جن پر "رمضان مبارک" لکھا ہوا ہوتا ہے۔ ان سُپر سٹورز میں TESCO اور ASDA

MORRISONS قابلِ ذکر ہیں۔ یہ سب خالصتا ولائتی سٹورز ہیں جن کی زنجیر پورے برطانیہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں پر ہر نسل اور مذاہب کے لوگ آباد ہیں جن سے مساوی سلوک کرنا یہاں کا قانون بھی ہے اور عوام کا طرۂ امتیاز بھی ہے۔ تمام مذہبی اور ثقافتی سرگرمیاں بڑی آزادی اور شان سے منانا سب کا حق ہے۔ ادارے اور حکومت اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ کسی کو بھی مذہبی یا ثقافتی رسومات ادا کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔

کرسمس، ایسٹر، دیوالی، بیساکھی اور عیدوں پر مختلف کمپنیاں خصوصی پیکیج کا اجراء کرتی ہیں۔ تاکہ لوگ اپنے تہوار کسی معاشی دباؤ کے بغیر احسن طریقے سے منا سکیں۔ رمضان کو شروع ہونے میں 3 ہفتے ہیں مگر ابھی سے بڑے بڑے سُپر اسٹورز میں دیسی اشیائے خوردونوش پر رمضان کی خصوصی رعائت دے کر یہاں کے لوگوں نے مسلمانوں سے یکجہتی کا عملی ثبوت دیا ہے۔ اس میں رعائت کا تناسب 20% سے 50% تک ہے۔

اس کے علاوہ چائے کی پتی، رس، باکر خانیاں، مرچ مصالحے وغیرہ بھی رعائتی نرخ پر دستیاب ہیں۔ عید کے آنے تک ان میں اور بھی کمی واقع ہوگی۔ یہ تمام اشیاء کی کوالٹی کا معیار بھی اعلی۔ یعنی کہ اس میں 2 نمبر کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ تو ہمارے غریب عوام کے مقدر میں ہے کہ اپنے ملک میں پیدا ہونے والی اشیاء کے حصول کے لیے بھی ان کو ذلیل ہونا پڑتا ہے۔ ایک نمبر کی چیز تو ہماری غریب عوام کی دسترس سے باہر ہے

سوچنے کی بات ہے کہ یہ اشیاء اگر برطانیہ میں پیدا ہوتیں تو کس حد تک رعائت دیتے!!! جہاں تک ان کی اپنی لوکل پروڈکٹس کا تعلق ہے تو اس میں انہوں نے نرخ اتنے مناسب مقرر کیے ہیں کی بنیادی ضرورت کی اشیاء ہر طبقہ با آسانی خرید سکتا ہے۔ جس کی اگر یہاں مثال دی جائے تو اپنے حکمران طبقے سے عوام بدظن ہو سکتی ہے۔
اس کے علاوہ بھی انہوں نے کئی رعایات رمضان میں دی ہیں۔

رمضان کے مہینے میں سگریٹ نوشی کرنے والوں کو بڑی تنگی ہوتی ہے۔ روزے کے دوران کھانے پینے سے زیادہ سگریٹ کی طلب گراں گزرتی ہے ایسے میں یہاں صحت کا قومی ادارہ NHS نے بھی سگریٹ نوشوں کے لیے رمضان کی خصوصی پیشکش کا اعلان کیا ہے کہ وہ لوگ جو رمضان میں سگریٹ نوشی ترک کرنے کے خواہاں ہیں ان کی علاج میں خصوصی رعائت دی جائے گی۔ تاکہ رمضان میں ان کو پریشانی نہ ہو۔ اسی طرح لوکل ایئرلائن نے عمرہ کے لیے خصوصی آفرز لگائی ہیں۔ تاکہ لوگ آسانی سے عمرے کی سعادت حاصل کر سکیں۔ یہاں پر کام کے دوران مسلمانوں کو سحر و افطار کے لیے مناسب وقت دیا جاتا ہے۔ تمام سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری بڑی کمپنیوں میں نماز پڑھنے کا بھی مناسب انتظام ہوتا ہے۔ خصوصی رعائتوں کا یہ سلسلہ برطانیہ اور یورپ کے دیگر ممالک میں چلتا ہی رہتا ہے جس سے ان کی انسانی حقوق کی پاسداری ظاہر ہوتی ہے 16 سال سے کم اور 60 سال سے زائد عمر کے افراد کو بھی خصوصی مراعات اور رعایات حاصل ہوتی ہیں۔ اپنے شہر میں سفر فری اور دوسرے شہر جانے کے لیے آدھا کرایہ۔ جب تعلیمی سال شروع ہوتا ہے تو کتابوں کاپیوں پر خصوصی رعائت دی جاتی ہے۔ تاکہ ماں باپ اور طالبعلموں پر بوجھ نہ پڑ سکے۔ اس کے برعکس اگر ہم اپنے ملک میں دیکھیں تو ہم کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے جہاں پر مجبوری کا فائدہ نہ اٹھایا جائے۔ رمضان کے مہینے سے قبل ہی مصنوعی قلت پیدا کر کے قیمتوں کو دگنا کر دیا جاتا ہے۔ رمضان کا چاند نظر آتے ہی بجلی عید کا چاند بن جاتی ہے۔ ملاوٹ اور بے ایمانی عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ ہر کوئی ایک دوسرے سے عیدی بنانے کے چکر میں نظر آتا ہے۔ غریب عوام تو سارا سال ہی فاقہ کشی کر کے روزے کی حالت میں رہتے ہیں۔ رمضان میں 2 وقت کھانے کو ممکن یا یقینی بنانے کے لیے ریاست، بڑی کمپنیوں اور مخیر حضرات نے بھی کبھی کوئی مثبت قدم نہیں اُٹھایا۔ جیسے عید قربان پر آپس میں ہی گوشت کا تبادلہ کر کے عید منانے کا رواج بڑھتا جا رہا ہے۔ اسی طرح رمضان میں ایک مخصوص طبقہ آپس میں ہی فائیو سٹار ہوٹلوں میں افطار پارٹیوں کا سلسلہ شروع کرتا ہے جو

عیدملن پارٹی تک جاری رہتا ہے۔کسی وقت بڑے ہوٹلوں میں رمضان کا مہینہ مندا ہوتا تھا۔اب افطار پارٹیوں کا فائیوسٹار ہوٹلوں میں کرنا ایک status symbol بن گیا ہے۔ہوٹل والوں کی ماہ رمضان میں ہر رات چاند رات ہوتی ہے۔روزے کا اصل مقصد تو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنے نفس کو مارنا ہوتا ہے۔مخصوص اوقات میں کھانے پینے سے اپنے آپ کو روکنے کا مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی بھوکے کی بھوک میں درد کا احساس ہو سکے۔جو وہ بھوک پیاس میں محسوس کرتا ہے۔مگر ادھر تو معاملہ ہی عجیب ہے۔سیاسی پہلوان افطار پارٹی پر انواع واقسام کے لوازمات کے ساتھ پنجہ آزمائی کر کے روزے کو چت کرتے نظر آتے ہیں۔اب تو افطار پارٹی کا فیشن اتنا عام ہو گیا ہے کہ بیروزگار بھی بڑی تیاری کے ساتھ اس میں شامل ہوتے ہیں اور اپنی باری آنے پر بڑے فخر سے اس کا اہتمام کرتے ہیں۔وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ غریب عوام کس حال میں ہیں۔

ہمارے سیاسی قائدین نے حکومت بنانی ہو یا توڑنی۔۔۔۔الائنس بنانا ہو یا توڑنا ہو۔ملکہ کے شہر میں میٹنگ کرنے کا مزہ اور نشہ ان کو بہت آتا ہے۔جلا وطنی خود ساختہ ہو یا بالواسطہ زیادہ تر کی پناہ گاہ لندن ہی ہوتی ہے۔علاج معالجہ بھی جسمانی ہو یا سیاسی سب یہاں شفایاب ہونے آتے ہیں۔یہاں آکر ان کو بجلی کا شارٹ فال تو نظر آجاتا ہے جو کسی اور کبھی نظر نہیں آیا مگر ان کو یہاں نظام نظر کیوں نہیں آتا؟

ان کو یہاں کی ریاست کا اپنی عوام سے مساوی سلوک نظر کیوں نہیں آتا؟ جہاں نسل، رنگ، زبان اور مذہب کو بالائے طاق رکھ کر سب کے حقوق کی پاسداری کی جاتی ہے۔کیا وہ نہیں دیکھتے کہ یہاں اقلیتی مسلمانوں کو بھی رمضان المبارک میں مکمل تعاون کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔

یہ بات درست ہے کہ اگر ظلم ہو رہا ہے اور وہ حاکم کے علم میں ہے تو وہ ظالم ہے اور کہ اگر ظلم ہو رہا ہے اور وہ حاکم کے علم میں نہیں تو وہ غافل ہے۔ظالم اور غافل بھی بھی حکمرانی کی اہلیت نہیں رکھتے اور جلد یا بدیر عوام اُن کے محلات پر دھاوا بول دیتی ہے

اور یہ عوامی قہر ہی ہوتا ہے جو خدائی قہر بن کر ایسے حکمرانوں پر نازل ہوتا ہے۔جو حکمران اپنی رعایا سے اچھا سلوک نہ کریں ان کے حقوق کا خیال نہ رکھیں تو ایسے حکمرانوں اور انکی عوام سے دنیا میں کوئی بھی اچھا سلوک نہیں کرے گا۔المیہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں مسلمان تو ہر طرف ہیں مگر اسلامی اصول نظر نہیں آتے۔ادھر مسلمان تو بہت کم ہیں مگر اسلامی اصولوں کی سنہری چادر نے سارے برطانیہ اور یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔کاش۔۔۔۔۔!!! یہ بابرکت مہینہ اپنے فضلوں اور برکتوں سے ہمیں ان غاصب حکمرانوں سے نجات دے۔

نام پروڈکٹ	مقدار	عام قیمت	رمضان کی خصوصی پیشکش
دال چنا	2 کلو 2 سو گرام	3.99پاؤنڈ	1.99پاؤنڈ
کالا چنا	2 کلوگرام	3.99پاؤنڈ	1.84پاؤنڈ
ثابت مسور	2 کلوگرام	3.99پاؤنڈ	2.39پاؤنڈ
سن فلاور کوکنگ آئل	5لٹر	6پاؤنڈ	5پاؤنڈ
آٹا	10 کلوگرام	5پاؤنڈ	4پاؤنڈ
پستہ	چھلا ہوا300 گرام	3پاؤنڈ	2.50پاؤنڈ
میوہ	800 گرام	4.50پاؤنڈ	3پاؤنڈ
روح افزا/روز سیرپ	1بوتل	2.99پاؤنڈ	1.73پاؤنڈ
دیسی گھی	2 کلوگرام	9.50پاؤنڈ	7.50پاؤنڈ
بادام چھلکے کے بغیر	1 کلوگرام	6.50پاؤنڈ	5.50پاؤنڈ
باسمتی چاول	10 کلوگرام	10.99پاؤنڈ	9پاؤنڈ
چینی	1 کلو	0.89پاؤنڈ	0.79پاؤنڈ
کھجور	1 کلو پیکٹ	4.99پاؤنڈ	3.99پاؤنڈ
بیسن	1 کلوگرام	1.99پاؤنڈ	1.49پاؤنڈ

اچار	1بوتل	خریدنے پر	ایک بوتل فری
مصالحہ جات	1پیکٹ	خریدنے پر	ایک پیکٹ فری
مشروبات	1پیک	خریدنے پر	ایک پیک فری
خربوزہ	1 کلوگرام	1.97پاؤنڈ	1پاؤنڈ
گرما	1 کلوگرام	1.97پاؤنڈ	1پاؤنڈ
آڑو	1پیک	3.29پاؤنڈ	1پاؤنڈ
سٹرابیری	1پیک	3.99پاؤنڈ	1.99پاؤنڈ
سبزیاں	1 کلوگرام	2.99پاؤنڈ	1.90پاؤنڈ فی

روزنامہ ”دن“ لاہور 13جولائی 2011ء

قابل غور

☆ امریکہ دراصل مغربی یورپ کو کمیونزم کی دیوہیکل ویل کے منہ میں جانے سے بچانا چاہتا تھا اگر مغربی یورپ کمیونزم کے زیر اثر آجاتا تو براعظم امریکہ کی طرف اُس کی پیش قدمی اتنی ہی یقینی تھی جتنی کہ اس ٹڈی دل کی ہوتی ہے جو صحرائے عرب سے ہوتا ہوا براعظم پاک و ہند اور وسطی

چین میں داخل ہو جاتا ہے

☆ صدیوں سے غیر ایشیائی باشندوں نے ایشیا کی محنت پر گزارہ کیا ہے اور غریب سے امیر ہو گئے۔ ''سورج سے محروم ، ریشم سے محروم اور گرم مصالحوں سے محروم بحر اوقیانوس کے معاشرے'' کی مشرق کی دولت کو ہڑپ کر جانے کی بے پناہ ہوس نے ہمیں کنگال کر دیا ہے

☆ 80ء کی دہائی میں ضیاء الحق کے دور میں سوویت یونین کی جارحیت کے خلاف افغانستان میں مجاہدین کی مدد کرنے کے سلسلے میں بھی اس امداد کا تسلسل بڑی باقاعدگی اور خوش دلی سے جاری رہا اور یہ امریکہ کا سب سے بڑا مفاد تھا جو پاکستان نے پورا کر دیا

☆ جنگ عظیم دوم کے دوران ہی سرد جنگ کا آغاز ہوا جس سے یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ امریکہ اپنے اتحادیوں کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھتا ہے

اشاعت خاص

امریکی امداد کے بھنور میں پھنسی پاکستانی ناؤ!!!

''اقتصادی امداد حقیقت میں دوسری جنگ عظیم کے بعد منظر عام پر آئی۔ جب امریکہ یورپ کے ملبے کو امریکہ کی بے پناہ امداد کے ذریعے ایک نئی صنعتی طاقت بنانے کے درپے تھا اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوا۔ امریکہ دوسری جنگ عظیم کا نا مزد ملزم ہونے کے باوجود ہر طرح کی سزا اور تباہی سے محفوظ رہا۔ یورپ کی تعمیر نو کا مقصد امریکہ نے نہ تو انسانی ہمدردی کے بنیاد پر کیا اور نہ ہی اُسے مذہبی حوالے سے کوئی ایسا لگاؤ اپنے ہم مذہبوں سے تھا۔ امریکہ نہ تو یورپ میں نئے چرچ بنانے کا تمنائی تھا اور نہ ہی وہ فنون لطیفہ کے نئے ادارے بنانا چاہتا تھا۔ امریکہ دراصل مغربی یورپ کو کمیونزم کے دیو ہیکل ویل کے منہ میں جانے سے بچانا چاہتا تھا اگر مغربی یورپ کمیونزم کے زیر اثر آجاتا تو براعظم امریکہ کی طرف اُس کی پیش قدمی اتنی ہی یقینی تھی جتنی کہ اس ٹڈی دل کی ہوتی ہے جو صحرائے عرب سے ہوتا ہوا براعظم پاک و ہند اور وسطی چین میں داخل ہو جاتا ہے۔ امداد کا ایک مخصوص مقصد ہوتا ہے اور یہ مقصد خیرات نہیں ہوتا بلکہ باہمی خود حفاظتی ہے۔ دوسروں کو استبدادیت سے بچانا خود اپنی حفاظت ہوتا ہے۔ تعمیر نو کے بعد یورپ سے کمیونزم کا خطرہ ٹل گیا۔ غالباً ایشیا اور افریقہ کے ملکوں کی امداد اس سے بھی زیادہ ضروری ہے تا کہ وہ اپنی آزادی برقرار رکھ سکیں۔ بلاشبہ دوسری جنگ عظیم میں یورپ کو بہت نقصان اٹھانا پڑا تھا لیکن ایشیا اور افریقہ کو ایسے مسائل کا سامنا رہا ہے جو جنگوں کے نتائج میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ ایشیائی ممالک بھی پچھلی جنگوں میں روندے گئے لیکن جنگ کی تباہ کاریوں سے ایشیا اور افریقا کو جو مادی نقصان اٹھانا پڑا تھا، اس سے بھی بدتر وہ مستقل غربت ہے جو دو براعظموں کے لوگ نسلاً برداشت کرتے چلے آرہے ہیں۔ حتیٰ کہ ایشیا اور غربت ایک دوسرے کے مترادف بن گئے۔ ہماری زمینیں

زرخیز ہیں لیکن ہمارے عوام غریب ہیں۔بیماری ہمارا ورثہ ہے اور بچوں کی آہ بکا ایشیا کی آواز ہے۔مراعات یافتہ طبقے کے مہین پردے پیچھے غمگین انسانیت کا مصیبت زدہ سمندر ہے۔کیا یہ پہلے سے مقدر شدہ قانون اور ایشیا کا نا قابلِ تغیر مقدر ہے؟اس بات میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ انسانوں کا اجتماعی ضمیر عرصہ دراز سے ایسے حالات کو برداشت کرتا چلا آیا ہے اور کرتا رہے گا۔ایشیائی قیادت کا نعرہ دائمی افلاس کے دھبے کو دھونا ہے۔اس عظیم ترین چیلنج پر قابو پانے کیلئے ہر شخص کو کمر بستہ ہو جانا چاہیے انفرادی سطح پر تمام تر قربانیاں مسائل کو چھو بھی نہیں سکتیں۔صدیوں سے غیر ایشیائی باشندوں نے ایشیا کی محنت پر گزارہ کیا ہے اور غریب سے امیر ہو گئے۔"سورج سے محروم، ریشم سے محروم اور گرم مصالحوں سے محروم بحر اوقیانوس کے معاشرے" کی مشرق کی دولت کو ہڑپ کرجانے کی بے پناہ ہوس نے ہمیں کنگال کردیا ہے۔یہ مسئلہ ان کا بھی اتنا ہی ہے جتنا ہمارا ہے۔انہیں کم از کم جزوی طور پر ایشیا کو وہ سب کچھ واپس کردینا چاہیے جو اس کی ملکیت تھا۔غیر ملکی امداد معقول اور رفاقای وجوہات کی بناء پر دی جاتی ہے۔جو حکومتیں دوسرے ملکوں کو امداد دیتی ہیں، وہ اس پالیسی کی قدر و قیمت اور ضرورت کو سمجھتی ہیں۔یہ جانتے ہوئے کہ امداد جدید دور کی حکمت عملی ہے کی ایک ناگزیر خصوصیت ہے، وہ اپنے عوام سے ضروری قربانیوں کا مطالبہ کرنے پر مجبور ہیں تاکہ انہیں مزید قربانیاں نہ دینی پڑیں۔یہ حکومتیں وقتاً فوقتاً اپنے عوام کے سامنے امداد کے فلسفے اور اسے جاری رکھنے کی ضرورت کی وضاحت کرتے رہتی ہیں۔اس کے باوجود کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو امداد کو خیرات کہنے پر مصر ہیں۔امداد پانے والے ممالک امداد پا کر ممنون ہوتے ہیں اور کسی نہ کسی صورت میں وہ اس کا ضرورت سے زیادہ لحاظ بھی کرتے ہیں۔بد قسمتی سے وہ لوگ جو امداد کو خیرات کہتے ہیں مسئلے کے اس پہلو پر کم ہی توجہ کرتے ہیں۔یہ بات کسی قوم کی، خواہ وہ کتنی ہی غریب کیوں نہ ہو، عزت نفس کے خلاف ہے وہ دولت مند اقوام کے دروازوں پر ہاتھ میں کشول گدائی لیے ہوئے پھرتی رہیں بلاشبہ امداد کا اگر یہی واحد تصور ہوتا اور کوئی دوطرفہ مفاد نہ ہوتا تو یہ ناممکن تھا کہ کوئی قوم طویل عرصہ تک اس قسم کے

حالات کو برداشت کرتی۔"لہٰذا بارے مندرجہ بالا خیالات پاکستان کے سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے ہیں لیکن اس تحریر اور موجودہ معروض کے درمیان تقریباً 50 سالوں سے زائد کا طویل عرصہ حائل ہے۔ذوالفقار علی بھٹو نے جس عہد میں یہ تجزیہ لکھا اُس وقت دنیا دائیں اور بائیں دو بڑے بلاکوں میں تقسیم تھی جیسا کہ ذوالفقار علی بھٹو نے خود ہی لکھا ہے کہ کمیونزم کے خطرے نے امریکہ کو یورپ کی ازسرِ نو تعمیر پر مجبور کیا جبکہ روس جو اُس کا اتحادی تھا اور دوسری جنگ عظیم میں تباہ و برباد ہو چکا تھا اُس کے اتحادیوں نے اُس کی مدد کرنے کے بجائے جاپان کے شہروں پر ایٹم بم گرا کر اُسے دھمکا دیا کہ جنگ کے خاتمے کے بعد صرف امریکہ ہی دنیا کی اکلوتی سپر پاور ہوگی۔جنگ عظیم دوم کے دوران ہی سرد جنگ کا آغاز ہوا جس سے یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ امریکہ اپنے اتحادیوں کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھتا ہے۔اُسی سرد جنگ کے نتیجے میں دنیا واضح طور پر دو بلاکوں میں تقسیم ہوگئی اور پھر امریکی امداد کے جال نے دنیا کو غلامی کے نئے تصور سے روشناس کروا دیا۔پاکستان کے معرض وجود میں آتے ہی ہمارے پاس دو آپشن تھے کہ ہم امریکہ سے دوستی بڑھائیں یا پھر روس کے ساتھ تعلقات رکھیں۔ 1950ء میں پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان روس کا طے شدہ دورہ منسوخ کرکے امریکہ چلے گئے اور اُس دن کے بعد سے پاکستان نے کبھی سکھ کا سانس نہیں لیا۔پاکستان ایک کے بعد ایک بحران کا شکار ہوتا رہا لیکن پاکستان کا دوست اور غمخوار امریکہ برے وقت میں کبھی بھی اُس کی مدد کو نہ پہنچا۔کمسن پاکستان کو صرف 4 سال کی عمر میں شاطر بوڑھے امریکہ کے ساتھ غلامی کا طوق گلے میں ڈال کر بیاہ دیا گیا۔یہ رشتہ مجبوری میں کیا گیا یا خوشی سے مگر مقصد ترقی اور خوشحالی ہی ہوگا۔یہ علیحدہ بات ہے اس رشتے میں عوام کی رضامندی پسند یا رائے لینا مناسب نہ سمجھا گیا اور یہ روش آج بھی قائم ہے کہ حکمران عوام سے ووٹ تو لیتے ہیں لیکن عوامی خواہشات کا احترام نہیں کرتے۔عوام کی رائے کسی بھی بڑے قومی معاملے میں بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ مگر ہمارا ایک مخصوص طبقہ آج بھی اس ملک کے سیاہ سفید کا اپنے آپ کو ہی مالک سمجھتا

ہے۔ ساٹھ سال سے زائد عرصہ میں اس رشتے میں کئی بار نمک حرامی، بے وفائی اور غداری کی دڑاریں پڑیں۔ "ظل پناہ" امریکہ کئی بار جلال میں آیا۔حقہ پانی بند کیا، علیحدگی ہوئی،اورنوبت طلاق تک بھی آئی۔پھر "بندی" کو جھکنے اور مزید جھکنے کا کہا گیا ......جھکتے جھکتے آخر لیٹ ہی گئے۔ آخر محبت اور جنگ میں سب جائز ہے ناں! ظل پناہ کو عشق ہو نہ ہو ادھر تو عشق کا یہ عالم ہے کہ یار کو راضی کرنے اور خوش رکھنے کے لیے افغانستان کی سخت چٹیلی پہاڑیاں ہوں یا پاکستان کے سرسبز پہاڑ ہر جگہ سر جھکنے کو تیار ہیں۔اگر شیریں کی خاطر فرہاد پہاڑ کھود سکتا تھا تو کیا ہم "مجازی خدا" کو راضی کرنے اور خوش رکھنے کے لیے سوات اور وزیرستان کے پہاڑوں کو نہیں توڑ سکتے؟

لیلیٰ کے عشق میں قیس دربدر ٹھوکریں اور لوگوں سے پتھر کھا سکتا تھا تو کیا ہم "جہاں پناہ" کو سکون دینے کے لیے اپنے اوپر ڈرون اور بموں کی بارش نہیں کروا سکتے؟ مہینوال کے پیار میں سوہنی کچے گھڑے پر تیر سکتی تھی تو کیا ہم اپنے "سر کے سائیں" کی خوشنودی کے لیے "کچے لوٹوں" پر بھروسہ نہیں کر سکتے؟ آخر ہم نے "وڈے سائیں" سے رشتہ بھی تو نبھانا ہے ناں!......طلاق تو بڑی دور کی بات ہے ہم تو علیحدگی بھی برداشت نہیں کر سکتے ہمیں تو "حضورِ اعلیٰ" کی ناراضگی سے ڈر لگتا ہے۔کیونکہ ان سے ناراضگی بڑی مہنگی پڑتی ہے۔ہم تو مفاہمت پہ یقین رکھتے ہیں۔دوستی اور رشتے کو تقویت دینے کے لیے ہم کسی بھی حد تک بھی جا سکتے ہیں۔یہ بات الگ ہے کہ اس رشتے میں توازن ہو نہ ہو......!ہم تو اس رشتے کو سدا نبھانے کے لیے تیار ہیں چاہے ہمارا کچھ رہے نہ رہے۔مگر کچھ "غیرت مندوں" کے خون نے جوش مارنا شروع کر دیا ہے۔جو یہ کہہ رہے ہیں کہ قبل اس کے "سرکارِ اعلیٰ" طلاق دے اس سے خود ہی "خلع" لے لو۔کیونکہ اس کی "منکوحہ" ہو کر نہ کوئی فائدہ ہوا ہے اور نہ ہی اس کی "مطلقہ" ہو کر کوئی فائدہ ہو گا۔ہاں "خلع" کے جرات مند فیصلے سے مرعوب ہو کر شاید کوئی ہمسایہ رشتہ پکا کر لے۔اس میں ہو سکتا ہے ہمیں "وڈے سائیں" کے حق مہر سے ہمیشہ کے لیے محروم ہونا پڑے۔ویسے بھی سوچیں تو کیا فرق پڑتا ہے؟ منہ دکھائی سے لے کر آج تک اس

"منکوحہ" کو جو جیب خرچ ملتا رہا ہے اس میں تو یہ بیچاری اپنی صحت، تعلیم اور میک اپ پر آدھا بھی خرچ کر لیتی تو آج معاشی حسن اتنا ہوتا کہ اس طرح کے کئی "آقا" رشتہ جوڑنے کے لیے ہاتھ باندھ کر قطار میں کھڑے ہوتے۔بدقسمتی سے یہ جیب خرچ بھی ان دلالوں کے جیبوں کی زینت بنتا رہا جو کہتے تو اسے "دھرتی ماں" ہیں۔مگر "سفید مکان کے مرداول" کو "مائی باپ" کہتے اور سمجھتے رہے۔شاید یہ مال کھانے کی مجبوری تھی جس نے ان کو......باپ بنانے پر آمادہ کیا!!!!

منکوحہ بن کر ظلم، بربریت، جارحیت اور ناروا سلوک سے اپنی سالمیت اور خود مختاری کو داؤ پر لگائے رکھنا ہے۔یا......غلامی کی زنجیر کو ذرا ڈھیلا کرنے کی پاداش میں طلاق لینی ہے......یا کبھی نہ خوش ہونے والے اس " سرتاج " سے بے تاج ہو کر "خلع" لینی ہے۔اس فیصلے میں اب بہت تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ہمیں غفلت کی اس نیند سے بیدار ہونا پڑے گا اور ملک وقوم کے وسیع تر مفادات کے لیے ٹھوس اور جرات مندانہ فیصلے کرنے ہونگے۔

امریکہ نے اپنی روایات دو دہراتے ہوئے ایک بار پھر 800 ملین ڈالر کی امداد روک دی ہے۔جس کے بعد کور کمانڈرز کے 140ویں اجلاس میں یہ ایک ولولہ انگیز اور جرات مندانہ اعلان بھی کیا گیا کہ کسی کی مدد کے بغیر اپنے وسائل سے جنگ لڑیں گے۔اس فیصلے پر اگر خلوص نیت سے عمل کیا جائے تو ساری قوم کی دعائیں اور نیک جذبات پاک فوج کے ساتھ ہونگے۔اس سے پاک فوج کا اعتماد اتنا بلند ہو جائے گا کہ وہ ناقابل تسخیر ہو سکتے ہیں۔جہاں تک امداد کا تعلق ہے تو کوئی گھر یا ملک ساری زندگی امداد پر نہیں چل سکتا۔ایک نہ ایک دن اس کو اپنے وسائل کے ساتھ پاؤں پر کھڑا ہو کر دنیا کے ساتھ عزت سے سر اٹھا کر قدم سے قدم ملا کر چلنا پڑتا ہے۔کیوں نا آج سے ہی ہم یہ عہد کر لیں کہ ہم اپنے وسائل کو بروئے کار لا کر محنت دیانتداری کے بل بوتے پر دنیا میں اپنا نام روشن کریں۔اگر جرمنی، جاپان اور کوریا پانچ دہائیوں میں اپنے آپ کو مستحکم کر سکتے ہیں تو ہم میں بھی اتنا ٹیلنٹ موجود ہے کہ ہم بھی عزت سے جی اور

مرسکیں۔عزت اور وقار سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ہم امداد اور قرضے کی بیساکھیوں کو خود توڑ دیں۔کام ہے ذرا مشکل کیونکہ اتنی پرانی عادت ایک دم سے چھوڑنا بھی بڑی جرات مانگتا ہے۔مگر تاریخ گواہ ہے کہ قومیں امداد اور قرضوں سے کبھی عروج حاصل نہیں کر پاتیں۔ہمیں بھی کھلے دل سے اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا۔

امریکی امداد کا یہ مدوجزر بہت پرانا ہے۔کئی بار امداد بند کی گئی، معطل کی گئی اور روکنے کی دھمکیاں دی گئیں۔جب امریکی امداد روکی گئی تو عوام کا طرز زندگی وہی رہا جو امداد کی بحالی کے دوران تھا!! بس فرق ایک مخصوص طبقے کو پڑتا ہے جو براہ راست اس امداد سے فیض یاب ہوتے ہیں۔امریکی امداد کا اگر جائزہ لیا جائے تو اس میں ان ادوار میں AID پاکستان کو AIDS کی طرح چپکی نظر آتی ہے جن میں حاکم اعلیٰ فرد واحد یعنی کوئی نہ کوئی ڈکٹیٹر تھا۔ان میں ایوب خان، ضیاءالحق اور پرویز مشرف کے نام قابل ذکر ہیں۔جنھوں نے "شہوتِ اقتدار" کے نشے کو پورا کرنے کے لیے اپنے منصب اعلیٰ کو بھی طول دیا۔اس میں ان کو امریکی آشیرباد بھی حاصل تھا۔اس کے برعکس جمہوریت کے علمبردار امریکہ نے ہماری جمہوری حکومتوں کے ادوار میں اکثر اس AID کا گلہ گھونٹنے کی کوشش کی ہے۔جس میں ذوالفقار علی بھٹو اور نواز شریف کے نام سب سے نمایاں ہیں۔اس وقت بھی جمہوری حکومت ہے جب امریکی انتظامیہ نے یہ اعلان کیا ہے کہ وہ ایک تہائی سے زائد فوجی مدد کے زمرے میں ملنے والی امداد کو فوری طور پر روک رہے ہیں۔جس میں حساس اداروں میں استعمال ہونے والے فوجی ساز و سامان ,دفاعی آلات ,پرزہ جات اور سیکیورٹی پر ہونے والے اخراجات شامل ہیں۔پاکستان کے لیے امریکی امداد کی ایک طویل سیاسی تاریخ ہے۔ماضی میں بھی ایسا کئی بار ہو چکا ہے۔بیرونی امداد کا یہ سلسلہ 1948ء سے شروع ہوا۔جب پہلی بار معاشی ترقی کے لیے برائے نام امداد دی گئی۔پہلی بار باقاعدہ طور پر امریکی مدد 1952ء میں لیاقت علی خان کے قتل کے بعد پاکستان کو دی گئی۔اقتصادی سرگرمیوں کے فروغ کے لیے 1962ء سب سے زیادہ

2.3 بلین ڈالر کی ریکارڈ امریکی مدد دی گئی۔1965ء اور 1971ء کی پاک بھارت جنگوں کے دوران اور جنگوں کے فوراً بعد بھی ڈرامائی طور پر امریکی امداد کا یہ سلسلہ روک دیا گیا تھا اور اس کی وجوہات بتانے کی زحمت بھی امریکہ نے کبھی نہیں کی یقیناً یہ اُس کا اختیاری معاملہ تھا لیکن حیرت انگیز طور پر 1970ء کی دہائی میں اس میں بتدریج کمی کی گئی جبکہ پاکستان کو اُس وقت امریکی امداد کی شدید ضرورت بھی تھی۔ذوالفقار علی بھٹو کے عہد میں امریکی امداد رکی رہی شاید اُسی کی وجہ ذوالفقار علی بھٹو کے روس اور چین سے تعلقات تھے۔80ء کی دہائی میں ضیاءالحق کے دور میں سوویت یونین کی جارحیت کے خلاف افغانستان میں مجاہدین کی مدد کرنے کے سلسلے میں بھی اس امداد کا تسلسل بڑی باقاعدگی اور خوش دلی سے جاری رہا اور یہ امریکہ کا سب سے بڑا مفاد تھا جو پاکستان نے پورا کردیا۔1989ء میں امریکی صدر ریگن اور روسی صدر گورباچوف نے ہاتھ ملا کر سرد جنگ کے خاتمے کا اعلان کردیا اور امریکہ افغانستان سے اپنی دکان بڑھا گیا اور پھر اُس نے نائن الیون سے پہلے تک کبھی افغانستان اور پاکستان کی کوئی خیر خبر نہ لی البتہ بھارتی ایٹمی دھماکوں کے بعد جب پاکستان نے ایٹمی دھماکے کیے تو امریکہ نے پاکستان پر ناصرف پابندیاں عائد کردیں بلکہ اُس کی ہر طرح کی امداد بھی تقریباً بند کردی۔1998ء میں امداد کا یہ سلسلہ پاکستان کے جوہری پروگرام کے منظر عام پر لانے کی پاداش میں تاریخ کی کم ترین سطح تک چلا گیا۔نائن الیون کے بعد امریکہ کو ایک بار پھر پاکستان کی ضرورت درپیش تھی سو 2002ء میں امریکی امداد کی برکات شروع ہوگئیں۔جو 2009ء اور 2010ء میں پاکستان کو دہشت گردی کی جنگ میں فرنٹ لائن کا حلیف بننے کے انعام کے طور پر دیئے گئے۔2010ء میں 2.5 بلین ڈالر فوجی امداد کی صورت میں ادا کیے گئے جبکہ 1.2 بلین ڈالر دہشت گردی کے خلاف جنگ میں حمایت کرنے اور اتحادی بننے کی وجہ سے دیا گیا۔امریکی قرضوں کی تاریخ کے چارٹ کو غور سے دیکھا جائے اور تو اُس کی خارجہ پالیسی کے بہت سے تاریک پہلو روشن ہو جاتے ہیں۔جب ہمیں ضرورت پڑی امریکہ نے کبھی ہمیں امداد نہیں دی لیکن اپنے مفادات کی تکمیل کیلئے اُس

نے ہمیں امداد دے کر اپنے کام کروائے اور پاکستان کے وہ ناعاقبت اندیش حکمران جنہوں نے امریکی مفادات کی تکمیل کیلئے امداد لی اور ناصرف پاکستانی عوام کو مقروض کردیا بلکہ وہی امداد امریکہ کے کام آئی۔جنرل ضیاءالحق کے دور میں ملنے والی امداد اب ہم سود کے ساتھ غیر محسوس طریقے سے امریکہ کو واپس کر رہے ہیں لیکن شاید ایسی واپسی کا کوئی حساب کتاب اور کھاتہ نہیں ہوتا۔امریکی دوستی بجا لیکن امریکی امداد سے کنارکشی اختیار نہ کی تو شاید ہم اللہ تعالیٰ کے اس عطیہ کو بھی نہ سنبھال سکیں جو ہر لمحے امریکی قرضے کی دلدل میں پھنستا جا رہا ہے۔دانشوروں کا ایک گروہ سقوط ڈھاکہ سے پہلے بھی یہ منفی پروپیگنڈا کرتا رہا ہے کہ پاکستان قیامت تک کے لیے قائم رہنے کیلئے بنا ہے لیکن پھر پاکستان ٹوٹ گیا اور انہیں دانشوروں کے دیئے ہوئے انڈوں میں سے نکلنے والے بچوں نے یہ درس رٹا شروع کر دیا۔اللہ تعالیٰ کا کھلا فیصلہ ہے کہ جو قوم اپنی حالت خود نہیں بدلتی اللہ بھی اُس کی حالت نہیں بدلتا۔

چارٹ امریکی امداد

سال	اقتصادی بیرونی مدد	اقتصادی امریکی مدد	فوجی امداد	اتحادی سپورٹ فنڈ
----------	ملین ڈالر	ملین ڈالر	ملین ڈالر	ملین ڈالر
1948ء	0.77	0.00	0.00	0.00
1949ء	0.00	0.00	0.00	0.00
1950ء	0.00	0.00	0.00	0.00
1951ء	2.89	0.00	0.00	0.00
1952ء	74.25	73.55	0.00	0.00
1953ء	748.29	286.23	0.00	----------
1954ء	156.95	152.24	0.00	----------
1955ء	733.15	477.18	266.00	----------

1956ء	1065.67	700.89	1086.50	----------
1957ء	1079.65	619.90	437.59	----------
1958ء	968.22	589.59	533.13	----------
1959ء	1367.93	985.25	366.81	----------
1960ء	1689.84	1181.35	230.39	----------
1961ء	989.53	780.04	260.47	----------
1962ء	2334.65	1446.28	549.02	----------
1963ء	2066.77	1063.68	292.31	----------
1964ء	2222.66	1334.16	187.55	----------
1965ء	1928.90	1041.58	77.38	----------
1966ء	816.28	691.28	8.40	----------
1967ء	1213.36	719.38	26.33	----------
1968ء	1501.68	672.50	25.98	----------
1969ء	541.76	504.31	0.50	----------
1970ء	968.32	570.93	0.87	----------
1971ء	474.25	31.21	0.73	0.00
1972ء	692.87	261.87	0.42	0.00
1973ء	715.35	387.63	1.24	0.00
1974ء	381.97	219.13	0.95	0.00
1975ء	614.34	326.02	0.92	0.00
1976ء	644.10	336.78	1.28	0.00
1977ء	319.16	209.40	0.92	0.00
1978ء	214.92	55.49	1.52	0.00

0.00	1.20	23.31	128.81	1979ء
0.00	0.00	0.00	137.53	1980ء
0.00	0.00	0.00	264.16	1981ء
0.00	0.00	200.07	400.60	1982ء
0.00	499.77	383.29	583.18	1983ء
0.00	555.90	415.84	568.05	1984ء
0.00	583.53	447.53	607.26	1985ء
0.00	545.82	460.91	623.56	1986ء
0.00	534.54	469.53	599.07	1987ء
0.00	430.69	635.00	769.14	1988ء
0.00	367.06	421.27	599.72	1989ء
0.00	283.44	422.37	584.07	1990ء
0.00	0.00	141.78	149.59	1991ء
0.00	7.20	0.57	27.14	1992ء
0.00	0.00	7.98	74.19	1993ء
0.00	0.00	0.00	68.43	1994ء
0.00	0.00	10.10	23.13	1995ء
0.00	0.00	0.00	22.79	1996ء
0.00	0.00	0.00	57.17	1997ء
0.00	0.00	0.00	36.32	1998ء
0.00	0.22	6.72	102.14	1999ء
0.00	0.00	0.00	45.72	2000ء
0.00	0.00	0.54	228.02	2001ء

1386.06	1739.70	744.74	937.34	2002ء
1450.98	1760.23	284.81	377.93	2003ء
794.11	891.39	316.56	406.12	2004ء
1050.15	1397.06	374.04	490.42	2005ء
916.13	1246.10	488.46	689.43	2006ء
755.74	1079.72	498.91	688.62	2007ء
1014.90	1378.32	392.05	614.48	2008ء
685.00	1114.26	1076.25	1353.65	2009ء
1220.50	2524.61	1529.53	1867.13	2010ء

روزنامہ ”ڈان“ 18 جولائی 2011ء

قابل غور

☆ میری کامیابی میں دو فضلوں کا بڑا ہاتھ ہے۔

☆ اور شکر ہے کہ میرا شوق ہی میرا ذریعہ معاش بن گیا۔

☆ ایک ہندو عورت نے چھت سے میرے اوپر اینٹ پھینکی،

میں بال بال بچ گیا۔ اگر لگ جاتی تو شاید------!

☆ میری کلاس میں یہی کچھ ہوتا تھا جواب مشاعرے میں ہوتا ہے حتیٰ کہ ٹیچر بھی میری کلاس میں آ کر بیٹھ جاتے تھے۔

☆ میں نے کہا کہ حقہ ٹھوس ہے اس کے اندر مائع ہے اور اس کی نلی سے گیس نکلتی ہے۔

☆ یہ بات سن کر دلیپ نے کہا کہ یہ شخص کسی دلیپ کمار سے کم نہیں۔

☆ میں ایک دفعہ سویڈن گیا وہاں میں نے پوچھا کہ آپ لوگ وظیفہ دیتے ہیں، یہ کس نے شروع کیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ یہ ہم نے نہیں حضرت عمرؓ نے شروع کیا تھا۔ اس جواب نے مجھے حیران کر دیا۔

☆ اگر آپ صرف چھوٹے موٹے شاعر کو ہی پڑھیں گے تو دماغ میں وسعت نہیں آتی۔

❁-----❁-----❁

پاکستان کے مایہ ناز شاعر
پروفیسر انور مسعود کا خصوصی انٹرویو

جناب انور مسعود صاحب کا شمار دور حاضر کے ان نامور شعراء میں ہوتا ہے جن کے نام سے دنیا میں کہیں بھی میلہ لگ جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ میلہ لوٹنے کی صلاحیت سے بھی خوب نوازا ہے۔ فروری 2011ء میں وہ انگلینڈ تشریف لائے۔ میں ان کا خاص طور پر مشکور ہوں کہ انہوں نے میری دعوت پر یہاں آ کر میری حوصلہ افزائی کی اور میرے شعری مجموعہ "خواب آنکھوں میں ٹوٹ جاتے ہیں" کی تقریب رونمائی میں بطور مہمان خصوصی شامل ہوئے۔ میری کتاب پر اپنی رائے دی جو میرے لیے کسی انمول تحفے سے کم نہیں۔ میں خوش قسمت ہوں کہ انہوں نے اپنے گلستان ادب سے چند پھول مجھ پر نچھاور کئے جن کی مہک میں آج تک محسوس کرتا ہے۔ ملک کی اس عظیم ادبی شخصیت کی چند دن مہمان نوازی کا موقع ملا اور ایک بات جو انہوں نے ہمارے گھر میں داخل ہوتے ہی کہی کہ "میں بہت ہی آسان سا مہمان ہوں" اور اس بات میں واقعی صداقت ہے۔ وہ دیکھنے میں جتنے سادہ ہیں عملاً اس سے بھی سادہ اور عاجز انسان ہیں۔ میں نے اُن کی آمد کو غنیمت جانتے ہوئے قارئین کے لیے ایک مختصر انٹرویو کیا جو حاضر خدمت ہے۔

سوال: آپکی شاعری میں مزاح کا عنصر بڑا نمایاں ہے۔ کیا مزاح آپکے مزاج میں بچپن سے ہی تھا؟

☆ میں سکول میں بڑا شرارتی تھا۔ کند ذہن شرارت نہیں کر سکتا۔ چپ رہنے والے فلاسفر ٹائپ ہوتے ہیں۔ ایک بار مجھے میرے استاد نے شرارت کی وجہ سے کلاس سے باہر جانے کو کہہ دیا۔ میں سارا پیریڈ باہر کھڑا رہا۔ جب پیریڈ

ختم ہوا تو استاد کلاس سے نکل کر جا رہے تھے تو باہر مجھ پر نظر پڑی تو میں نے انہیں کہا کہ سر لوگ تو غلط کام کی وجہ سے اندر کئے جاتے ہیں اور آپ نے مجھے باہر نکال دیا۔ میری اس بات پر وہ مسکرا دیے اور فوراً کہا کہ کل سے میرے پیریڈ میں کلاس میں آ جانا۔

سوال: کہتے ہیں کہ ہر کامیاب انسان کے پیچھے کسی خاتون کا ہاتھ ہوتا ہے۔ آپکی کامیابی میں کس کا ہاتھ ہے؟

☆ میری کامیابی میں دو فضلوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ ایک چوہدری فضل حسین جو مجھے سائنس سے آرٹس میں لائے، دوسرے میرے استاد فضل صاحب جنہوں نے میرے فن کو دیکھا اور میری راہنمائی کی۔

سوال: کیا شاعر کو بھی استاد کی ضرورت ہوتی ہے؟

☆ شاعر کو بھی استاد کی ضرورت ہوتی ہے مگر کسی میں یہ خصوصیت ہونا لازمی ہے۔ جیسے لکڑی کسی لوہار کو دے دی جائے اور بولا جائے کہ اس کی تلوار بنا دو۔

سوال: ہمارے ملک میں اکثر والدین اپنے بچوں کو ڈاکٹر یا انجینئر بنانا چاہتے ہیں۔ جب آپ نے میڈیکل سے آرٹس میں داخلہ لیا تو گھر والوں کا کیا رویہ تھا؟

☆ جب میں نے میڈیکل کو چھوڑ کر آرٹس میں داخلہ لیا تو گھر والوں نے میری کوئی مخالفت نہ کی اور اب میں نے اپنے بچوں کو بھی ان کی مرضی کے مطابق مضامین پڑھنے اور شعبہ اختیار کرنے کی پوری آزادی دے رکھی ہے۔

سوال: گھر سے باہر آپ کس کو سب سے زیادہ یاد کرتے ہیں؟

☆ گھر میں افراد جواد، عمار، عاقب، عدیلہ، لینا، عاطرہ ہیں اور جب گھر سے باہر ہوتا ہوں تو سب سے زیادہ یاد مجھ کو میرا پوتا "داور" آتا ہے۔

سوال: آپ نے سکول کالج کا زمانہ کہاں اور کیسے گزارہ؟

☆ میرا بچپن لاہور میں گزرا۔ وَن پورہ، مصری شاہ مجھے کبھی نہیں بھولتا۔

برانڈرتھ روڈ پر میرا سکول تھا۔ میں نے پوری زندگی میں سکول، کالج یا یونیورسٹی سے کبھی چھٹی نہ کی تھی اور میرا ریکارڈ تھا کہ کبھی کوئی پیریڈ مس نہ کیا۔پڑھائی سے میرا عشق ہی مجھ کو تدریسی پیشے میں لے گیا۔اور شکر ہے کہ میرا شوق ہی میرا ذریعہ معاش بن گیا۔

سوال: کوئی ایسا واقعہ جو کبھی نہیں بھولا؟

☆ ایک واقعہ جو کبھی نہیں بھول سکتا۔ 1947ء میں فسادات ہو رہے تھے۔ میں لاہور رام گلی سے گزر رہا تھا کہ ایک ہندو عورت نے چھت سے میرے اوپر اینٹ پھینکی، میں بال بال بچ گیا۔اگر لگ جاتی تو شاید......!

سوال: شاعری کب اور کیسے شروع کی؟

☆ مزاح شروع سے ہی میرے مزاج میں شامل تھا اور بچپن سے ہی مزاحیہ ماہیے کہتا تھا۔کالج کے زمانے میں مزاحیہ شاعری سے آغاز ہوا۔ایک سکول میں پڑھاتا تھا جہاں میں نے ایک اور ماسٹر عارف کو دیکھا اس نے دو سال تک اپنی خاکی جنز کی پینٹ نہیں دھلائی اور روزانہ ہی پہن کر سکول میں پڑھانے آ جاتا تھا۔پتلون پر کہیں سویاں، دودھ اور کہیں دہی کے نشان۔وہ تھا بھی ہیڈ ماسٹر۔ایک دن سب ٹیچروں نے ساتھ والے گاؤں جس کا نام قطبے دا کوٹ تھا، جانے کا پروگرام بنایا، بڑا خوبصورت گاؤں تھا۔گجرات کے پاس۔ماسٹر عارف بھی اپنی خاکی پتلون میں ساتھ تھا۔میں نے ادھر ہی ایک ماہیا لکھا اور سب کو سنایا۔یہ ابتدائی کوشش تھی۔

شیشی وچ سینٹ ماہیا
قطبے دے کوٹ نالوں چنگی عارفے دی پینٹ ماہیا

سوال: آپکی سنجیدہ شاعری بھی اپنا مقام رکھتی ہے۔خاص طور پر ''امبڑی''......یہ آپ نے کب اور کیسے لکھی؟

☆ اپنی نظم ''امبڑی'' میں نے کنجاہ (گجرات) میں لکھی۔یہ سچا واقعہ تھا اور اس

میں جو فشی ہے، میں خود ہی تھا۔

سوال: کونسی زبانیں پڑھائی ہیں؟

☆ اردو اور فارسی دونوں پڑھائی ہیں۔پینتیس سال لیکچر اردو میں دینے کی وجہ سے پنجابی میں بات کرنا ذرا مشکل سی ہو جاتی ہے۔شاید عادت بن چکی ہے۔

سوال: تدریسی ذمہ داریاں کہاں کہاں سرانجام دیں؟

☆ گورنمنٹ کالجوں میں پڑھایا، ڈیرہ غازی خان، بہاولنگر، کوہ مری اور پھر راولپنڈی سے ریٹائرڈ ہوا۔بیس سال راولپنڈی میں پڑھایا۔

سوال: جب آپ پڑھاتے تھے تو آپ کے شاگرد کیسا محسوس کرتے تھے؟

☆ میرے شاگرد بڑا انجوائے کرتے تھے۔میری کلاس میں یہی کچھ ہوتا تھا جو اب مشاعرے میں ہوتا ہے۔حتیٰ کہ ٹیچر بھی میری کلاس میں آ کر بیٹھ جاتے تھے۔میرا پیریڈ ساتواں ہوتا تھا تو بچے کہتے تھے کہ ہم جو چھ پیریڈ میں بور ہوئے، ساتویں میں فریش ہو گئے۔

سوال: آپ کا سب سے یادگار شاگرد؟

☆ ایک شاگرد جو کبھی نہیں بھول سکا۔اس کا نام لال دین ہے، جب وہ پہلے دن کلاس میں آیا تو اس کو میں نے کہا کہ تم نے پنجاب میں ایف اے میں فرسٹ آنا ہے اور واقعی اس نے ایف اے میں پنجاب میں ٹاپ کیا۔

سوال: آپ نے اپنے پیشے کو خوب انجوائے کیا؟

☆ ہاں! میں نے پڑھنے اور پڑھانے میں خوب مزہ کیا۔میرے اندر ایک ٹیچر تھا اور شروع سے دل کرتا تھا کہ پڑھاؤں۔ایک مرتبہ آٹھویں کلاس کو پڑھا رہا تھا۔مادے کی تین حالتیں۔ایک لڑکا فاضل کھڑا ہو گیا اور پوچھا کہ سر کوئی ایسی چیز بتائیں جس میں بیک وقت ٹھوس، مائع اور گیس تینوں موجود ہوں۔میں نے پوچھا تمہارا والد حقہ پیتا ہے اس نے کہا جی سر وہ تو میں بھی

پیتا ہوں۔ میں نے کہا کہ حقہ ٹھوس ہے اس کے اندر مائع ہے اور اس کی نلی سے گیس نکلتی ہے۔

سوال: عمل تدریس میں آپکو بھی شرارتی شاگردوں سے پالا پڑا ہو گا۔ کسی شرارتی شاگرد کا واقعہ جو آپ کو اکثر یاد آتا ہو؟

☆ ایک لڑکی کو انگریزی اتنی اچھی نہیں آتی تھی۔ ایک دفعہ اس نے ''T'' لکھ کے پوچھا کہ یہ کیا ہے پھر اس کے بعد ''TEA'' لکھ دیا اور بولی کہ یہ اب بھی ''ٹی'' ہے۔ کیوں؟ میں نے اردو کا حرف ''د'' لکھ دیا اور پوچھا کہ یہ کیا ہے پھر ''دال'' لکھ دیا اور اسے کہا کہ ایسے ہی ہے۔

سوال: آپ کا بچپن کیسے گزرا؟

☆ میرا بچپن بہت غربی میں گزرا ہے شاید ہی کسی نے اتنی غربی دیکھی ہو۔ ایم۔ اے کے بعد بھی آٹھ آنے روزانہ کا کام کرتا تھا جس کے لیے مجھے کتنے میل پیدل جانا پڑتا تھا مگر میں نے کبھی ہمت نہ ہاری۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے آج تمام خواہشیں پوری ہو گئیں ہیں۔

سوال: آپ کی طبیعت میں غصہ نظر نہیں آتا۔ اس میں کیا راز ہے؟

☆ غصہ اب بالکل نہیں آتا۔ غصہ تب آتا ہے جب خون گرم ہو اور غصہ کرنے سے تکلیف بڑھتی ہے کسی معاملے کا حل غصہ نہیں بلکہ یہ معاملے کو بگاڑتا ہے۔ مجھے بڑوں نے یہ بھی سکھایا ہے کہ انا للہ پڑھا کرو، غصہ پر کنٹرول رہتا ہے اور گم شدہ چیز بھی مل جاتی ہے۔

سوال: آپ کے چاہنے والے ساری دنیا میں ہیں۔ جب آپ پاکستان کے باہر اپنے پرستاروں کو دیکھتے ہیں تو کیا محسوس کرتے ہیں؟

☆ بے شک بہت اچھا لگتا ہے۔ اس بات کی بھی خوشی ہوتی ہے کہ اپنے دیس سے دور جا کر بھی لوگ اپنی زبان کے قدر دان ہیں۔ گجرات میں یونس فین والے میرے چچا تھے اور S.A فین والے میرے بزرگوں میں سے تھے۔

ایس۔ اے۔ سے مراد سلطان علی ہے اور سلطان علی صاحب میرے ابا جان کو کہتے تھے کہ انور کو کہو فیکٹری میں آئے، کام کرے۔ مگر آج دیکھو اللہ کے فضل سے میرے فین (گوشت پوست والے) پوری دنیا میں پھیلے ہیں۔ شکر الحمدللہ۔

سوال: اگر آپ شاعر اور پروفیسر نہ بنتے تو اور کونسا شعبہ اختیار کرتے؟

☆ میں دلیپ کمار کا فین ہوں اور وہ بھی میرا فین ہے۔ ایک مرتبہ دلیپ کمار پشاور آیا۔ میرے ایک دوست نے اس کی دعوت کی تھی اور وہاں ایک سٹال لگایا جس کے اوپر لکھا تھا ''اج کی پکایئے؟'' اور اس سٹال کے اندر ہر وہ چیز پکائی ہوئی تھی جو میری نظم میں ہے۔ انہوں نے مجھے اس پروگرام کا کمپیئر بنایا۔ وہاں میں نے اداکاری کے بارے میں یہ بات کی کہ اداکار کو تو پتہ ہوتا ہے کہ اس نے کیا کرنا ہے کیونکہ اس کے پاس اسکرپٹ ہوتا ہے۔ جو اداکار کو معلوم ہے وہ اسے ایسے پیش کرے کہ گویا اسے معلوم نہیں ''یہ اداکاری'' ہے۔ کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا کہ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے۔ یہ بات سن کر دلیپ نے کہا کہ یہ شخص کسی دلیپ کمار سے کم نہیں۔ میں نے ایک نظم پیش کی جس میں بتایا کہ اداکاری کسے کہتے ہیں۔ مجھے خطاطی اور اداکاری کا بڑا شوق تھا۔ اگر شاعر اور پروفیسر نہ ہوتا تو ایک اداکار ہوتا۔ شکر ہے کہ میرا شوق ہی میرا ذریعہ معاش بنا۔

سوال: آپ کافی بار برطانیہ تشریف لائے۔ کوئی خاص واقعہ جس کا آپ ذکر کرنا پسند کریں؟

☆ ایک دفعہ لندن آیا اور چار مختلف ٹیکسیوں میں سفر کیا مگر کسی ایک نے بھی کرایہ نہ لیا۔ جب ایک سکھ نے مجھ سے پیسے نہ لیے تو میں نے کہا کہ سردار جی آپ پیسے کیوں نہیں لے رہے؟ اس نے کہا رات کو بی بی سی پر آپ کو انٹرویو دیتے دیکھا۔ بس اس لیے کرایہ نہیں لیا۔

سوال: آپ نے کونسا ایوارڈ پا کر سب سے زیادہ خوشی محسوس کی؟

☆ مجھے کافی ایوارڈز ملے۔صدارتی ایوارڈ ملا، میری کتابوں کو ایوارڈز ملے۔لیکن ایک ایوارڈ جو مجھے سب سے بڑا ملا، وہ یہ ہے کہ میں عمرہ کر رہا تھا کہ ایک شخص مجھے دیکھے جا رہا تھا۔تھوڑی دیر بعد میرے پاس آیا اور کہا کہ آپ یہیں ہیں، میں تو ابھی آپ کے نام کا عمرہ کر کے بیٹھا ہوں۔اس کی خوشی میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔

سوال: حالیہ دورہ برطانیہ میں کوئی یادگار لمحے؟

☆ ایک دفعہ بریڈفورڈ گیا، وہاں کرکٹ کلب نے فنکشن کرایا۔انہوں نے پوچھا کہ کرکٹ کے بارے میں کیا جانتے ہو۔میں نے کہا جی کچھ نہیں۔بس یہی پتہ ہے ایک Ball ہوتا ہے، Wickets ہوتی ہیں، Bat ہوتا ہے اور بال ٹمپرنگ ہوتی ہے۔پھر یہ قطعہ پڑھا

کیمرے کی پہنچ دور تلک ہے بھائی
کیوں اسے آپ نے محدود سمجھ رکھا ہے
کہیں وکٹوں کو بھی گنے نہ سمجھ لیجئے گا
گیند کو آپ نے امرود سمجھ رکھا ہے

سوال: پاکستان سے باہر آپ کو کبھی کسی بات نے حیران کر دیا ہو؟

☆ یورپین نے وہ چیزیں اپنائی ہیں جو ہم صرف کہتے ہیں۔میں ایک دفعہ سویڈن گیا وہاں میں نے پوچھا کہ آپ لوگ وظیفہ دیتے ہیں، یہ کس نے شروع کیا تھا۔انہوں نے کہا کہ یہ ہم نے نہیں حضرت عمرؓ نے شروع کیا تھا۔اس جواب نے مجھے حیران کر دیا۔

سوال: بیرون ممالک دوروں پر پاکستانی فنکاروں کو آپ کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

☆ راحت علی خان کے ساتھ جو انڈین ایئرپورٹ پر ہوا۔اسی طرح مہدی حسن کے ساتھ بھی ایئرپورٹ پر واقعہ ہو چکا ہے۔پاکستانیوں کو خاص طور پر محتاط

رہنے کی ضرورت ہے۔

سوال: آپ کا من پسند کھانا؟

☆ پسندیدہ کھانے میں سبزیاں اور دالیں ہیں۔گوشت وغیرہ بہت کم کھاتا ہوں اور دوپہر کے کھانے میں صرف سلاد اور کچھ پھل۔

سوال: نوجوان شعراء کو آپ کیا نصیحت کریں گے؟

☆ اچھا شاعر بننے کے لیے ضروری ہے کہ نامور اور عظیم شعراء کی تصانیف کا بھرپور مطالعہ کیا جائے۔اگر آپ صرف چھوٹے موٹے شاعر کو ہی پڑھیں گے تو دماغ میں وسعت نہیں آتی۔

سوال: آپ کے پسندیدہ شاعر کون ہیں؟

☆ کسی ایک کا نام لینا تو ممکن نہیں۔میرے پسندیدہ شاعروں میں ڈاکٹر اقبال، فیض احمد فیض اور میاں محمد بخش ہیں۔دوست شاعروں میں احمد فراز سے بڑا قلبی لگاؤ تھا۔ہم نے کئی بار اکٹھے شعر بھی کہے ہیں۔مثلاً ایک مصرعہ انہوں نے کہہ دیا اور اگلا میں نے۔بنیان والی نظم پانچ منٹ میں لکھی اور جب احمد فراز کو سنائی تو اس نے کہا کہ انور میری ایک بات مانو گے، میں نے پوچھا کہ کیا؟ انہوں نے کہا کہ یہ نظم ایک بار پھر سے سناؤ۔

سوال: آپ کو اپنی کونسی نظم، غزل یا قطعہ سب سے زیادہ پسند ہے؟

☆ میرے لیے یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ میری کونسی نظم، غزل یا قطعہ مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی ماں سے پوچھیں کہ تم کو کونسا بچہ پسند ہے۔ہاں مگر "امبڑی" میں یہ بات ہے کہ وہ میں جب بھی پڑھتا ہوں تو وہ سچا واقعہ میری آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے کیونکہ وہ منشی میں خود ہی تھا اور ہر بار وہ نظم میں دل سے ہی سناتا ہوں۔یہی وجہ ہے کہ اکثر آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔اس نظم کے پڑھنے کے بعد میں پھر کچھ اور نہیں سناتا۔

سوال: آپ نے بہت سے ممالک کا دورہ کیا۔کونسا ملک سب سے اچھا لگا؟

☆ میں نے دنیا میں بڑے ملکوں کے دورے کئے اور ہر جگہ مجھے بڑا پیار اور پذیرائی ملی۔ پاکستان کے بعد مجھے سویڈن اور کینیڈا اچھے لگے۔

سوال: پاکستان کے موجودہ حالات کو دیکھ کر آپ اس کا مستقبل کیسا دیکھتے ہیں؟

☆ پاکستان کا مستقبل بڑا تابناک ہے اور میں پر امید ہوں کہ جس دھرتی پر ہر قسم کا عطیہ قدرت، موٹروے، ایٹمی پلانٹ، محنتی لوگ، جذبے والی قوم ہے تو پاکستان میں اچھا وقت ضرور آئے گا۔ انشاء اللہ، اصل دہشت گردی تو امریکہ نے پھیلائی ہے جو تیل پر قبضہ کرنے کے لیے افغانستان تک آ گیا ہے۔ بس ہمیں ایک دیانتدار لیڈر کی ضرورت ہے۔ موجودہ دور میں تو عمران خان میں ہی صرف دیانتداری نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ تو مجھے کوئی بھی لیڈر دیانتدار نہیں لگتا۔

یہ شرط ہے کہ کوئی غور سے پڑھے انور
ہر ایک آنکھ میں لکھا ہوا ہے نام میرا

دی نیشن لندن 21 جولائی 2011ء

قابل غور

☆ برطانیہ نے بش انتظامیہ کے ساتھ اپنی وفاداری کا معیار دوسروں سے زیادہ دکھانے کے لیے خاموشی کا دورانیہ بھی دوگنا یعنی دو منٹ کر دیا تھا۔

☆ ترقی یافتہ ممالک کا سوگ منانے کا یہ طریقہ ہمارے قائدین کو شاید کچھ زیادہ ہی اچھا لگا کہ انہوں نے خاموشی

سے کئی کئی گھنٹے بجلی بند کر کہ اپنی عوام کو دہشت گردی کی جنگ میں ہلاک ہونے والوں کے سوگ میں شامل کر لیا جس کو لوڈشیڈنگ کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔

☆ اگر مہذب دنیا کے اس اصول کو وطنِ عزیز پر لاگو کر دیا جائے تو آپ خود ہی گن لیں کہ ہم کتنے سالوں سے حالتِ سوگ میں ہیں۔

☆ لیکن حیرت انگیز بات ہے کہ وزیر اعلیٰ پنجاب سرفراز شاہ کے قاتلوں کو سزا دلوانے کی بات تو کرتے ہیں مگر پنجاب کی بے لگام پولیس بارے اُن کا رویہ ایک شفیق باپ جیسا ہے۔

❁-----❁-----❁

لوڈشیڈنگ کا جن کون قابو کرے گا؟

نائن الیون کے سانحہ کی پہلی برسی پر دنیا کے کافی ممالک نے امریکی عوام سے یکجہتی در امریکی حکومت سے ہمدردی کے طور پر عین اسی وقت پر اک منٹ کے لیے خاموشی اختیار کی۔ برطانیہ نے بش انتظامیہ کے ساتھ اپنی وفاداری کا معیار دوسروں سے زیادہ دکھانے کے لیے خاموشی کا دورانیہ بھی دوگنا یعنی دو منٹ کر دیا تھا۔ اس ایک منٹ کے علامتی سوگ میں یورپ اور برطانیہ کے علاوہ وہ ممالک بھی شامل تھے جو آج دہشت گردی کی نام نہاد جنگ میں امریکہ کے حلیف ہیں۔

میں اس دن جرمنی میں اپنی کلاس میں تھا۔ ہمارے استاد محترم نے مقررہ وقت سے پہلے ہم کو بتایا کہ ہم ایک منٹ تک خاموش اور ساکت بیٹھیں گے۔ ایک منٹ کے لیے بجلی بھی غائب ہو گئی تا کہ سب لوگ اس سوگ میں شامل ہو سکیں۔ ایک منٹ کے لیے تمام ٹرینیں، ٹرامز، زیر زمین گاڑیاں، سڑک پر ساری ٹریفک بھی رک گئی فیکٹریوں میں بھی بجلی بند ہونے سے ساری مشینیں رک گئیں۔ حساس جگہوں، ہسپتالوں اور مخصوص پلانٹس کی حامل فیکٹریاں کو اس سے مستثناء رکھا گیا۔ بجلی کے بغیر ایک منٹ کا تجربہ ان کے لیے بڑا انوکھا تھا۔ ترقی یافتہ ممالک کا سوگ منانے کا یہ طریقہ ہمارے قائدین کو شاید کچھ زیادہ ہی اچھا لگا کہ انہوں نے خاموشی سے کئی کئی گھنٹے بجلی بند کر کے اپنی عوام کو دہشت گردی کی جنگ میں ہلاک ہونے والوں کے سوگ میں شامل کر لیا جس کو لوڈشیڈنگ کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ جس کا دورانیہ بجلی کے بل کی طرح روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔

لوڈشیڈنگ انگریزی زبان کا وہ ٹیکنیکل لفظ ہے جس سے ہمارا بچہ بچہ اچھی طرح واقف ہے۔ دوسری طرف انگریزوں کی ایک کثیر تعداد اس لفظ سے نا آشنا ہے کیونکہ ان کو آج تک اس سے کبھی واسطہ ہی نہیں پڑا۔ یہاں کی مکینیکل زندگی کا دارومدار ہی بجلی پر ہوتا ہے۔ 1997ء کی بات ہے کہ میرے ساتھ کام کرنے والی ایک

جرمن لڑکی کام پر تقریباً 3 گھنٹے تاخیر سے آئی مینجر کو اس نے دیر سے آنے کی وجہ یہ بتائی کہ وہ جس بلڈنگ میں رہتی ہے اس کے تمام فلیٹس کی بجلی تکنیکی وجوہات کی بنا پر صبح کے وقت بند تھی۔ جس کی وجہ سے الیکٹریکل ٹائم پیس نے جگانے کا الارم نہ بجایا۔ دیر سے آنکھ کھولی پھر بجلی کی عدم دستیابی کی وجہ سے گرم پانی سے محروم رہی۔ کچن میں ناشتہ بھی نہ بنا سکی کیونکہ کچن میں چولہا، مائکرو ویو، کیٹل وغیرہ سب کچھ بجلی سے ہی چلتا تھا۔ لہٰذا باہر cafe سے ناشتہ کرنا پڑا۔ اسی وجہ سے ڈیوٹی سے دیر ہو گئی۔ ساری بات سن کر مینجر نے بڑے افسوس کا اظہار کیا کہ اس کو اتنی تکلیف کا سامنا کرنے کے بعد کام پر آنا پڑا۔ مینجر نے اس کو آدھا گھنٹہ اضافی بریک دی تاکہ وہ تازہ دم ہو کر کام شروع کرے اور 3 گھنٹوں کی تنخواہ بھی نہ کاٹی۔ ایک طرف تو ایسی دنیا ہے جہاں بجلی بند کر کے "علامتی سوگ" مناتے ہیں اور اگر مہذب دنیا کے اس اصول کو وطنِ عزیز پر لاگو کر دیا جائے تو آپ خود ہی گن لیں کہ ہم کتنے سالوں سے حالتِ سوگ میں ہیں۔ حکومتیں بدل گئیں، آمریتیں دفن ہوئیں اور جمہورتیں جس کی خواہش ہر عوام کرتی ہے اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ عوام کی پیشانی پر چمک رہی ہے لیکن مقدر کا اندھیرا ہے کہ کسی سے بھی ختم نہیں ہو رہا۔ اگر تکنیکی وجوہات کی بنا پر کبھی کسی کو بجلی کی بندش کا سامنا کرنا پڑ جائے تو متاثرہ افراد کو چند گھنٹے مشکل میں گزارنے پر بڑی ہمدردی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ایک ہم ہیں جہاں بجلی کی آنکھ مچولی سے نوزائیدہ بھی آشنا ہے۔ کیونکہ دنیا میں آنکھ کھولتے ہی غریب کے بچے کو پہلی تکلیف لوڈشیڈنگ کی وجہ سے پہنچتی ہے۔ پہلے تو بجلی بند ہوتی تھی تو گھروں میں گیس سے جلنے والے لیمپ روشنی دیتے تھے۔ اب تو گیس کی لوڈشیڈنگ شروع ہو گئی ہے جس سے سخت گرمی میں بھی گھروں کے چولہے ٹھنڈے ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ فوج میں جب کبھی دشمن ملک کا جاسوس ہاتھ لگ جاتا تو اس سے راز اگلوانے کے لیے تشدد کا ایک خاص حربہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو سونے نہ دیا جائے۔ چند دن مسلسل جاگنے کے بعد مضبوط سے مضبوط اعصاب بھی جواب دے جاتے کیونکہ یہ وہ اذیت ہے جو دماغ، جسم اور اعصاب کو مفلوج کر دیتی ہے۔ آج ہماری غریب عوام ایسے ہی کرب سے گزر رہی ہے۔ جہاں وہ کبھی چین کی نیند سو نہیں سکتے۔ ہماری غریب عوام کا حوصلہ

قابلِ دید ہے جو اتنی سختیاں بڑے صبر سے برداشت کرتے ہیں۔ ان کا حوصلہ مزید بڑھانے کے لیے سیاسی قائدین کہہ دیتے ہیں کہ بجلی کا شارٹ فال برطانیہ میں بھی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ سرکاری دورے پر جہاں آ کر ٹھہرتے ہوں یا جہاں ان کی نسل پروان چڑھ رہی ہے وہاں پر لوڈشیڈنگ ہوتی ہو مگر ہمیں تو ادھر ایسی کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ ادھر تو زندگی کا سارا دارومدار ہی بجلی پر ہے۔ اگر چند گھنٹے بجلی نہ ہو تو سارا نظام ہی درہم برہم ہو جائے گا۔ ہمارے ملک میں لوڈشیڈنگ سے ستائی عوام کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ یو پی ایس اور جنریٹر بھی جہیز کا اہم جز و بنتے جا رہے ہیں۔ مگر جنریٹر بیچارہ بھی تب چلے گا جب ڈیزل اور پٹرول ہو گا۔ اُدھر تو پٹرول پمپ پر لمبی قطاریں خطرے کی گھنٹی بجا رہی ہوتی ہیں۔ UPS کو چارج کرنے کے لیے بھی بجلی کا ہونا شرط ہے۔ اب بجلی اور گیس کی لوڈشیڈنگ سے ستائی ہوئی غریب عوام سڑکوں پر سراپا احتجاج بن کر اپنے مخصوص قومی سٹائل میں ٹائروں کو آگ لگا کر دھویں سے اپنا ہی منہ کالا کرتی ہے۔ فضاء کو آلودہ دیکھ کر جب پولیس والے جائے وقوع پر پہنچ کر ان پر لاٹھی چارج کرتے ہیں تو ان کو بچانے والا بھی کوئی نہیں آتا۔ میانوالی میں تو دو شہری پولیس کی گولیوں کا نشانہ بن گئے لیکن حیرت انگیز بات ہے کہ وزیرِ اعلیٰ پنجاب سرفراز شاہ کے قاتلوں کو سزا دلوانے کی بات تو کرتے ہیں مگر پنجاب کی بے لگام پولیس بارے اُن کا رویہ ایک شفیق باپ جیسا ہے۔ آخر غریب عوام جائے تو کہاں جائے؟ لوڈشیڈنگ اور مہنگائی کی احتجاجی ریلی میں تو کوئی سیاستدان شامل ہو کر اظہارِ یکجہتی نہیں کرتا۔ وکلاء کی تحریک میں وہ سب گرم موسم کی پروا کیے بغیر سرگرم تھے۔ اس میں ان کے سیاسی مقاصد تھے جو انہوں نے حاصل کر لیے مگر غریب عوام جب اپنی حالتِ زار کا رونا سڑکوں پر آ کر روتی ہے تو ان کے آنسو بھی صاف کرنے کوئی نہیں آتا۔ ان کے ساتھ چلچلاتی دھوپ میں کون جلے؟ جہاں سورج آگ برس رہا ہے۔ اس آگ میں بڑی توانائی ہے۔ بشرطیکہ اس کو صحیح طریقے سے استعمال کیا جائے۔ یورپ میں جہاں سورج غریب کے گھر خوشی کی طرح کبھی کبھی دیدار کرواتا ہے۔ تپش کی شدت بھی اتنی نہیں ہوتی۔ پھر بھی شمسی توانائی کو یہاں بھرپور طریقے سے استعمال کیا جاتا ہے۔ جرمنی کی بیشتر کار پارکنگ ٹکٹ مشین اب شمسی توانائی

سے چل رہی ہیں۔اب تو فٹ پاتھوں پر جو لوگ چلتے ہیں ان کے پاؤں کی رگڑ سے پیدا ہونے والی توانائی کو بھی استعمال کرنے کا سوچا جا رہا ہے۔ہوا کو بھی ضائع نہ کیا جائے اس فارمولے پر عمل کرتے ہوئے پن بجلی کا بھی رجحان عام ہے۔ایٹم اور ہائیڈرو تھرمل پاور ہاؤس سے بھی کام لیا جا رہا ہے۔بجلی کی لوڈشیڈنگ ادھر ہوتی تو کبھی صنعتی انقلاب نہ آتا۔

ہمارے پاس سارا سال تیز دھوپ، ہواؤں کے جھونکے، پانی اتنا کہ غریب کا اکثر اس میں سب کچھ بہہ جاتا ہے۔جس کی فوٹیج دکھا کر ہمارے شاہی فقیر اپنے کشکول امدادی رقوم سے بڑھتے ہیں۔ایٹمی قوت کے ہم بھی دعویدار ہیں۔اگر ہم محدود وسائل میں ایٹمی طاقت بن سکتے ہیں تو توانائی کا یہ بحران کیوں ختم نہیں کر سکتے؟؟سب سے پہلے تو ہنگامی بنیادوں پر 35% چوری ہونے والی بجلی کو روکنے کے لیے اقدامات کرنے ہوں گے۔اس کے لیے ضروری ہے کہ چور کو چوکیداری سے علیحدہ کیا جائے۔یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کوئی ایماندار اور نڈر تھانیدار نہ ہو۔

گھاس کھا ایٹم بم بنانے والا جذبہ اگر دوبارہ زندہ ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم توانائی کے اس بحران سے باہر نہ نکل سکیں۔لوڈشیڈنگ کی وجہ سے انڈسٹریز تباہ ہو رہی ہیں، جس سے بے روزگاری میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے جو لوگوں کو جرائم کی طرف راغب کرتی ہے۔ملک میں معاشی استحکام لوڈشیڈنگ کے خاتمے کے بغیر ممکن نہیں۔افسوس اس بات کا ہے کہ ابھی تک ہمیں اپنی حکومتوں سے ایسی کوئی کوشش بھی دیکھنے کو نہیں ملی۔اب تو ہمارے لیڈروں میں مولوی، گدی نشین شاہ جی، مولانا حضرات، علماء اور عامل بھی شامل ہیں۔دیکھنا ہے کہ کون لوڈشیڈنگ کے اس جن کو قابو کرے گا۔

روزنامہ "دن" لاہور 19 جولائی 2011ء

دی نیشن لندن 5 اگست 2011ء

❁-----❁-----❁

قابل غور

☆ جنرل ضیاء الحق نے جہاں ہماری سماجی قدروں کو بدلنے کے لیے ایک مخصوص مذہبی فکر متعارف کروائی وہاں اُس نے ہر شے کو بکنے والی چیز بنا کر مادیت کے سمندر کے اتھاہ گہرائیوں میں پھینک دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک قلیل وقت نے ہمارے صدیوں پرانے مضبوط ڈھانچے کو

جڑ سے ہلا کر رکھ دیا۔

☆ مغربی معاشرے میں عورتوں اور مردوں کے حقوق و فرائض میں توازن نہیں ہوتا۔حقوق کے پلڑے میں عورتوں کی قسمت اور فرائض کے پلڑے میں مردوں کا مقدر سجایا جاتا ہے۔

☆ مغربی معاشرہ اس حوالے سے بالکل مختلف ہے جہاں ایک جوڑے کے آسمان پر دس دس جوڑے بنے دکھائی دیتے ہیں۔جب سے ہم مغرب زدہ ہونا شروع ہوئے ہیں درحقیقت آفت زدہ ہونا شروع ہو گئے ہیں۔

☆ ہماری سب سے بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ ہمارے حصے میں اچھے لوگوں کی آخری نسل کی خدمت کرنے کا عظیم فریضہ آیا ہے کیونکہ اس کے بعد کی نسل ہم ہیں اور ہم اتنا تو ضرور جانتے ہیں کہ ہم کتنے اچھے ہیں۔

❁----❁----❁

پرانے ماں باپ اور نئے اولڈ ہاؤس

تقریباً ڈیڑھ دہائی قبل جرمنی کے ایک مقامی اخبار کا مطالعہ کرتے ہوئے میری نظر ایک اشتہار پر رک گئی۔متن پڑھ کر بڑا تجسس ہوا۔ دیئے گئے ٹیلیفون نمبر کو ڈائل کیا اور ملاقات کا وقت لے کر میں نے اُس بتائے گئے گھر کے دروازے کی اطلاعی گھنٹی بجائی۔دروازے پر نصب سپیکر فون پر میں نے اپنا نام بتایا تو دروازہ کھول دیا گیا۔ساتھ ہی مجھ کو بتایا گیا کہ میں مجھے پہلی منزل پر پہنچنا ہوگا۔ایک بزرگ خاتون نے مسکراتے ہوئے دروازہ کھول کر میرا پرتپاک استقبال کرتے ہوئے اندر آنے کی دعوت دی اور ہم ڈرائنگ روم کے وسط میں صوفے پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔جہاں میز پر پانی اور جوس وغیرہ پہلے سے موجود تھا۔انہوں نے اپنا نام Fuchs(فوکس)اور عمر 76سال بتائی۔معلوم پڑا کہ وہ ریٹائرڈ ٹیچر اور سوشل ورکر تھیں۔خاوند فوت ہو چکا ہے اور بچے اپنے اپنے گھروں رہتے ہیں۔جس فلیٹ میں وہ رہائش پزیر تھیں وہ اُن کی ذاتی ملکیت تھا۔اُن کی بچے سال میں ایک دو بار آ کر مل جاتے تھے۔تا کہ کسی ہنگامی صورت میں ترکے کا بٹوارہ فوری ہو سکے۔اماں جی کا اپنے نواسے،نواسی،اور پوتے سے پیار کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے گھر میں لاتعداد تحائف رکھے ہوتے تھے تا کہ وہ جب کبھی بھی ملنے آئیں تو خالی ہاتھ نہ جائیں۔وہ تنہائی کا شکار ہو چکی تھیں اور اسی مقصد کے لیے انہوں نے اخبار میں اشتہار دیا تھا کہ ”انتہائی آسان پارٹ ٹائم جاب“ یعنی ہفتے میں 3بار دو گھنٹے کے لیے اُن کے گھر جا کر اُن سے باتیں کرنا۔تنخواہ کے علاوہ چائے،کافی اور مشروبات سے تواضع بھی پیکج میں شامل تھا......!میں نے انہیں بتایا کہ میں چونکہ دوسرے شہر میں رہتا ہوں اس کام کے لیے کوئی مقامی زیادہ موزوں ہوگا۔میں نے اُن سے فون پر بات چیت کرتے رہنے کا وعدہ ضرور کیا۔انہوں نے بتایا کہ اس سے پہلے بھی ایک

ایشین اس کام کے لیے آتا تھا۔ جواب کسی دوسرے شہر میں کام ملنے کی وجہ سے شفٹ ہوگیا ہے۔ Fuchs (فوکس) نے اُس ایشین کی بڑی تعریف کی اور بتایا کہ وہ پاکستانی تھا۔ جو اُن کی عزت اور احترام اُن کے اپنے بچوں سے زیادہ کرتا تھا۔ اس وجہ سے وہ ہمارے لوگوں سے بہت متاثر تھیں کہ ہم لوگ رشتوں کی قدر کرتے ہیں۔ ہماری سماجی قدروں میں اُن کو سب سے زیادہ ہمارا مضبوط فیملی سسٹم پسند تھا۔ جس میں فیملی کے بزرگ کا گھر سے باہر، محلے، گلیوں اور بازاروں میں بھی اپنا ایک مقام ہوتا ہے۔ جہاں ہر کوئی ان کو پیار اور عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ گھر میں بزرگوں کا وجود باعث برکت سمجھا جاتا ہے۔ یورپی معاشرے کے بہت سے اچھے پہلو ہیں مگر یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ اکثر بزرگ اپنی اولاد کی آواز سننے اور اور ان کا چہرہ دیکھنے کو ترس جاتے ہیں۔ تنہائی کا ناگ جب ڈستا ہے تو کسی غیر کی صحبت چاہے وہ معاوضہ دے کر ہی کیوں نہ حاصل کرنے پڑے "تریاق" کا کام کرتی ہے۔ میں اُن سے مل کر آ گیا اور اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت تصور کیا کہ میں نے اس معاشرے میں جنم لیا جہاں بزرگوں کے فیصلوں کے آگے سر تسلیم خم کرنے کا رواج تھا، زندگی کے اہم فیصلوں میں ان کی رائے اور مشورے کو سب سے زیادہ اہمیت اور برکت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ بغیر کسی طمع کے ان کو بوجھ سمجھنے کی بجائے ان کی خدمت کرنا باعث مسرت تصور کیا جاتا تھا۔ اپنی نسلوں کو ان کی شفقت سے فیض یاب کرانا بڑی قسمت کی بات مانا جاتا تھا۔ مگر جنرل ضیاء الحق نے جہاں ہماری سماجی قدروں کو بدلنے کے لیے ایک مخصوص مذہبی فکر متعارف کروائی وہاں اُس نے ہر شے کو بکنے والی چیز بنا کر مادیت کے سمندر کے اتھاہ گہرائیوں میں پھینک دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک قلیل وقت نے ہمارے صدیوں پرانے مضبوط ڈھانچے کو جڑ سے ہلا کر رکھ دیا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ کسی تند و تیز بے لگام طوفان نے سب کچھ الٹ پلٹ کا رکھ دیا ہے۔ بدقسمتی سے ہم دوسرے معاشروں سے وہ چیزیں اپنا رہے ہیں جو یقیناً نئی تو ہیں لیکن ہمارے معروض میں اُن کے لیے گنجائش نہیں پائی جاتی۔ دوسروں کی بری رسموں اور عادات کو برق رفتاری سے اپنائے جا رہے ہیں اور اپنی

اچھائیوں کو جو کبھی ہمارا طرہ امتیاز، اور ہمارا خاصا تھیں یوں چھوڑتے جا رہے ہیں جیسے کسی چور کو یک لخت ولائیت مل جائے تو وہ چوری چھوڑ دے۔ اگر تقلید کرنی ہی ہے تو مغربی معاشرے کے بہت سے روشن پہلو بھی ہیں۔ جن کو اپنا کر ہم اپنے معاشرہ مزید سنوار سکتے ہیں۔ ہمارے بزرگوں کی شادیوں کے کامیاب ہونے کا راز "برداشت" اور "اطاعت" میں پنہاں تھا، جواب جنسِ نایاب ہو چکی ہیں۔ جس کی وجہ سے طلاق کی شرح میں مہنگائی اور بے روزگاری کی طرح اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس ناپسندیدہ حلال فعل میں اکثر قربانی کے بکرے معصوم بچے ہی بنتے ہیں جو عمر بھر ماں باپ کو اکٹھے دیکھنے کی خواہش میں زندگی بسر کر دیتے ہیں۔ طلاق کی یہ روایت بھی مغربی تقلید کا ایک پہلو ہے۔ مغربی معاشرے میں عورتوں اور مردوں کے حقوق و فرائض میں توازن نہیں ہوتا۔ حقوق کے پلڑے میں عورتوں کی قسمت اور فرائض کے پلڑے میں مردوں کا مقدر سجایا جاتا ہے۔ جو شادیوں کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ بنتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں کبھی شادی کا بندھن مرتے دم تک ہر حال میں نبھانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ ہم اگر اپنے بزرگوں کو دیکھیں تو ان کی جوڑی کی رفاقت دیکھ کر واقعتاً یقین ہو جاتا ہے کہ جوڑے کبھی آسمان پر ہی بنتے ہوں گے لیکن مغربی معاشرہ اس حوالے سے بالکل مختلف ہے جہاں ایک جوڑے کے آسمان پر دس دس جوڑے بنے دکھائی دیتے ہیں۔ جب سے ہم مغرب زدہ ہونا شروع ہوئے ہیں درحقیقت آفت زدہ ہونا شروع ہو گئے ہیں۔

مغرب اور مشرق کی تہذیب میں سب سے بڑا فرق ہی مضبوط فیملی سسٹم کا تھا۔ جو ہمارے ہاں گھر کے سربراہ سے شروع ہو کر گلی محلّہ کے بزرگوں سے ہوتا ہوا علاقے کے بزرگوں کی پنچائیت تک جا پہنچتا تھا اور تمام ثالثی فیصلے خوش اسلوبی سے حل کر لیے جاتے تھے۔ ہمارے معاشرے میں کبھی بزرگوں کو گھر سے نکال کر علیحدہ یا اکیلا رکھنے کا تصور خدا کے حضور گناہ اور سماجی طور پر بدترین بدنامی کی وجہ بن جاتا تھا۔ مگر آج مغربی لعنت "اولڈ ہاؤس" دوسری لاتعداد لعنتوں کی طرح ہمارے معاشرے میں بھی نظر آنا شروع ہو گئے ہیں۔ ہمارے بزرگوں کی اکثریت کے پاس تو اتنے وسائل

بھی نہیں کہ وہ میڈم Fuchs (فوکس) کی طرح معاوضہ دے کر کسی کو گھر بلا کر زخمِ تنہائی پر خریدی ہوئی باتوں کا مرہم ہی رکھ سکیں۔ حالات ایسے ہیں کہ اگر کوئی صاحب حیثیت تنہائی کا ستایا ہوا بزرگ اخبار میں ایسا اشتہار دینے کی جرات کرے تو اسکو اُس کی تنہائی سمیت ہمیشہ کے لیے ختم کرنے والوں کا تانتا بندھ جائے۔ اپنے بزرگوں سے ناروا سلوک کرنے والوں کو یہ بات ہمیشہ مدنظر رکھنی چاہئے کہ وہ بھی آنے والے کل کے بزرگ ہیں، کمزور اور ناتواں۔ وہ یہ کام جن کے روشن مستقبل کے لیے سرانجام دے رہے ہیں وہ بھی سب کچھ کن انکھیوں سے دیکھ رہے ہیں اور آنے والے دنوں میں وہی ان کو تنہائی کی تاریکی میں ڈبوئیں گے جہاں ان کی آہ و بقاء سننے والا بھی کوئی نہ ہو گا۔ بزرگوں کو صرف ''اے ٹی ایم مشین'' ہی نہیں سمجھنا چاہیے کہ جس سے اگر پیسہ آنا بند ہو جائیں تو......!!! آج ہمارے ملک میں بھی فادر ڈے اور مدر ڈے منایا جاتا ہے۔ حالانکہ ہمارے معاشرے میں تو ہر دن اور رات والدین کا ہی ہوتا تھا۔ ہمیں تخلیق کرنے میں خالق کائنات نے ماں باپ کو وسیلہ بنایا ہے۔ ماں تو وہ ہستی ہے جو اپنے بچے کو اس وقت سے پیار کرنا شروع کر دیتی ہے جب اسے پہلی بار بچے کے وجود کا احساس اپنے وجود میں محسوس ہوتا ہے۔ بچے کے دل کی دھڑکن سب سے پہلے ماں ہی محسوس کرتی ہے۔ پیدائش کے مراحل کی ساری تکالیف اپنے بچے کا پہلا دیدار کر کے بھول جاتی ہے۔ دنیا میں آنے سے پہلے اور کئی ماہ بعد تک بچہ اپنی ماں کے جسم سے خوراک حاصل کرتا ہے۔ باپ اپنا پیٹ کاٹ کر اپنی خواہشوں کا گلہ گھونٹ کر شب و روز محنت کر کے بچے کے ناز نخرے اٹھاتا ہے۔ جب بھی ماں باپ بوڑھے ہو جائیں تو ان کی جگہ ''اولڈ ہاؤس'' نہیں بلکہ دلوں میں ہونی چاہیے۔ بزرگ اس شجر کی مانند ہوتے ہیں جو خود دھوپ کی گرمی برداشت کرتا ہے مگر دوسروں کو ٹھنڈا سایہ اور میٹھا پھل دیتا ہے۔ جس طرح ایک پتا شاخ سے گر کر اپنی جڑوں کی طرف آتا ہے اسی طرح ہم نے بھی اپنے اصل کو لوٹنا ہے۔ کئی دولتمند گھر میں جدت لانے کی غرض سے اپنے بزرگوں کو بھی پرانی چیز سمجھ کر گھر سے نکال دیتے ہیں۔ کچھ افلاس کے ہاتھوں مجبور ہو کر ان کو اضافی بوجھ

سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ ہر دو صورتوں میں یہ انتہائی شرمناک اور قابلِ نفرت فعل ہے مگر افسوس کہ ہم ریاکاری کے ابلیس یا بھوک کے خوف سے اس گناہ کے مرتکب ہو جاتے ہیں، جس کی تلافی ممکن نہیں۔ اس کا احساس تب ہوتا ہے جب وہ کبھی نہ ملنے کے لیے بچھڑ جائیں۔ اس وقت اپنی ہی لگائی ہوئی کسک کی آگ میں جلنا مقدر ہوگا۔ ہماری سب سے بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ ہمارے حصے میں اچھے لوگوں کی آخری نسل کی خدمت کرنے کا عظیم فریضہ آیا ہے کیونکہ اس کے بعد کی نسل ہم ہیں اور ہم اتنے تو ضرور جانتے ہیں کہ ہم کتنے اچھے ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ اولڈ ہاؤس مغرب میں پرانے ماں باپ کے لیے ہوتے ہیں لیکن اپنے مذہب، کلچر، مٹی اور اخلاقیات میں واحد یہی تو ایک شے ہے جو ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ زیادہ قابلِ احترام اور قابلِ عزت ہو جاتی ہے۔ بھلا ماں باپ بھی کبھی پرانے ہوتے ہیں؟

(1) روزنامہ ''دن'' لاہور 11 اگست 2011ء (حصہ اوّل)

(2) روزنامہ ''دن'' لاہور 12 اگست 2011ء (حصہ دوم)

دی نیشن لندن 12 اگست 2011ء

قابل غور

☆ جب کسی قوم کا برسرِ اقتدار گروہ ملک کے بیشتر وسائل پر قبضہ کر لیتا ہے تو دیگر طبقات میں بے چینی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ حاکم گروہ کے ساتھ متصادم ہو جاتے ہیں

☆ زوال سے مراد کسی بھی قوم کی وہ حالت ہے جب وہ

شکست کی منزل سے گزرنے کے بعد پستی کی اس سطح پر پہنچ جائے جہاں وہ اپنے وجود کے لیے دوسری قوموں کی محتاج ہو جائے

☆ کھلاڑی اچھا نہ کھیلے تو چاہے وہ گواسکر کا بیٹا ہو یا عبدالقادر کا ٹیم میں نہیں ٹک سکتا...... بیٹا وحید مراد کا ہو یا سلطان راہی کا اگر شائقین کو متاثر نہ کر سکے گا تو اس کو بھی کوئی اور کام ڈھونڈنا پڑتا ہے مگر سیاست میں ایسا نہیں ہوتا بس شجرہ نسب سیاسی ہو باقی اہلیت کی پروا کون کرتا ہے؟

☆ بقول کانٹ حضرت مسیح نے زمین پر خدائی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی مگر ان کے مقصد کو غلط سمجھا گیا اور ہم پر خدا کی بجائے پادری کی حکومت قائم ہو گئی

پاکستان کب تک موروثی سیاست کے گرداب میں پھنسا رہے گا؟

سیاستدان اپنے نااہل بچوں کو سیاست میں لانے کی شعوری کوشش کرتے ہیں

عظیم فلسفی اور مورخ ابن خلدون کے نزدیک جس طرح انسان بچپن، جوانی اور ضعیفی کے مدارج سے گزرتا ہے۔اسی طرح قومیں بھی ان مراحل سے گزرتی ہیں اور یہ مدارج عموماً تین نسلوں میں طے ہو جاتے ہیں۔قوموں کے عروج کے بعد قوموں کی ضعیفی یا زوال لازمی ہے لیکن اس کی وجہ ذہنی انتشار بھی ہے اور معاشی کشمکش بھی۔قوموں کے عروج، سالمیت اور فلاح کی بنیاد "عصبیت" پر رکھی گئی ہے۔عصبیت سے مراد وہ قوت ہے جو کسی قوم میں محبت، یگانگت اور یک جہتی کے شدید احساسات پیدا کر کے اسے منظم رکھتی ہے۔اس عصبیت کو قائم رکھنے میں مذہب اور دیگر فکری اور تہذیبی عناصر اہم کردار ادا کرتے ہیں۔تاہم کچھ معاشی اسباب ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی وجہ سے قوم کی عصبیت متاثر ہوتی ہے۔جب کسی قوم کا برسر اقتدار گروہ ملک کے بیشتر وسائل پر قبضہ کر لیتا ہے تو دیگر طبقات میں بے چینی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ حاکم گروہ کے ساتھ متصادم ہو جاتے ہیں۔اس طرح محنت کش طبقے کی عصبیت حاکم گروہ کی عصبیت سے ٹکرا جاتی ہے۔دونوں کے درمیان عدم تعاون شروع ہو جاتا ہے۔یوں بحیثیت مجموعی قوم کی عصبیت یا دوسرے الفاظ میں قوم کی سالمیت پر شدید ضرب پڑتی ہے۔جس کا نتیجہ قوم کی شکست اور زوال کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔اگر ہم تاریخ کے مختلف ادوار کا جائزہ لیں تو ابن خلدون کے اس نظریے میں صداقت نظر آتی ہے۔برصغیر میں مغلیہ سلطنت نے بھی یہ تینوں ادوار دیکھے۔امیر تیمور، ظہیر الدین بابر کے ابتدائی ادوار کو بچپن اور اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کے ادوار کو جوانی سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جس میں مغلوں کا عروج

تھا۔اس کے بعد اورنگ زیب عالمگیر کے دور سے زوال آنا شروع ہو گیا۔یعنی اس قوم کا بڑھاپا شروع ہو گیا۔زوال سے مراد کسی بھی قوم کی وہ حالت ہے جب وہ شکست کی منزل سے گزرنے کے بعد پستی کی اس سطح پر پہنچ جائے جہاں وہ اپنے وجود کے لیے دوسری قوموں کی محتاج ہو جائے اور اس کی خودارادیت بہت کم رہ جائے۔بیشتر اہم فیصلے کرنے میں دیگر اقوام سے حکم و ہدایت حاصل کرنے کے لیے مجبور ہو۔معاشی، سیاسی اور سماجی حیثیت سے دوسری قوموں کی دست نگر ہو اور اس طرح تخلیقی، علمی اور فنی صلاحیتوں سے تقریباً محروم ہو جائے۔اس سطح پر روحانی اور اخلاقی اقدار کا ذکر کرنا لاحاصل ہے۔کیونکہ ایک زوال رسیدہ قوم، جو اپنی اخلاقی اقدار کی امانت کو زیادہ عرصے تک محفوظ نہیں رکھ سکتی۔اگر ہم ان نشانیوں پر غور کریں تو یہ سب پاکستانی قوم میں موجود ہیں جو سبک رفتاری سے پستی کے منازل طے کرتی ہوئی زوال پذیر ہو رہی ہے۔بدقسمتی سے ہم نے تو عروج سے پہلے ہی زوال میں قدم رکھ دیا ہے۔اسی خطے میں مغلوں نے ایک عرصہ راج کیا تھا۔انکے زوال کی جو وجوہات بنیں ان میں سب سے بڑی وجہ معاشی بد حالی تھی۔جو اندرونی اور بیرونی جنگوں کی وجہ سے ظہور میں آئی۔اندرونی جنگیں اکثر اقتدار کے حصول کے لیے لڑی گئیں کیونکہ انہوں نے جانشین مقرر کرنے کے لیے کوئی واضح قانون نہیں بنایا تھا۔اورنگ زیب عالمگیر کے بعد جانشین کمزور سے کمزور تر ہوتے گئے۔مگر اقتدار کی فاختہ ہمیشہ مخصوص خاندان کے سر پر بیٹھی۔اسی موروثیت کی وجہ سے کچھ اندرونی طاقتوں کا ظہور ہوا اور ساتھ بیرونی طاقتوں کی مداخلت بھی شروع ہو گئی۔افواج بھی اخلاقی پستی کا شکار تھیں جس کی وجہ سے ان کی عظیم سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔اس سونے چڑیا کو فرنگی پنجرے میں قید کر دیا گیا جس کو آزاد کروانے کے لیے ہمارے بڑوں نے جان کی قربانیاں دیں۔بدقسمتی سے گورے تو اس چڑیا کو آزاد کر گئے مگر جاتے ہوئے کچھ مسٹر براون چھوڑ گئے۔جو آج تک اس کے پر نوچ رہے ہیں۔چند خاندانوں پر مشتمل مسٹر براونز کا یہ ٹولہ قیام پاکستان سے آج تک کسی نہ کسی طریقے سے غریب عوام کا استحصال کر رہا ہے۔اپنے پاؤں مضبوط کرنے کے لیے

مخلص اور دیانتدار لوگوں کو ایوانوں سے فارغ کیا اس کے لیے اگر کسی کو قتل بھی کرنا پڑا تو دریغ نہ کیا اور ضرورت پڑنے پر اپنی طرح کی سوچ رکھنے والوں کو اپنے گروہ میں شامل کیا گیا۔ کبھی غریب عوام کو جمہوریت کے نام سے لوٹا گیا۔ کبھی کوئی بوٹوں والا عوام کو ٹوپی پہنا کر اپنی طلسمی چھڑی گھماتا رہا۔ کبھی اسلام کے نام سے، بیوقوف بنایا گیا۔ کبھی روشن خیالی کا جھانسہ دیا گیا تو کبھی مفاہمت کے نام کو بدنام کیا گیا۔ مگر اندر سے یہ سب ایک ہی ایجنڈے پر کام کرتے رہے۔ مغلیہ شہزادوں کی طرح خود تو عیاشی کی زندگی بسر کرتے ہیں اور اقتدار کے ایوانوں میں رہنا اپنا حق سمجھتے ہیں چاہے وہ اس کے اہل ہوں نہ ہوں!! مغل شہنشاہ کم از کم جمہوریت کا نعرہ نہیں لگاتے تھے۔ ادھر تو حالت یہ ہے کہ ڈکٹیٹر بھی اپنے آپ کو جمہوریت کا علمبردار کہتا ہے۔ جب تک صحافت کی قلم ایوان بالا میں بیٹھے لوگوں کی منشاء کی روشنائی سے چلتی رہی لوگوں کو سارے حقائق کا علم نہ تھا۔ آج کیمرے کی آنکھ کے آگے حقیقت بتانے والی زبان بھی ہے جو عوام کو موجودہ حالات سے باخبر رکھنے میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ اب عوام کا کام ہے کہ بار بار کے چلے ہوئے کارتوس پر بھروسہ کرتا ہے یا کسی اور کو موقع دیتا ہے۔ اس موروثی سیاست نے آج تک پاکستان کو کیا دیا ہے؟ دو ٹکڑے تو کر دیا اور باقی کو یہ مل کر کھا رہے ہیں......!!!

اب میاں محمد نواز شریف پھر سے پارٹی کے بلامقابلہ صدر منتخب ہو گئے ہیں۔

بلاول زرداری بھی بلاول بھٹو بن کر الیکشن لڑنے اور اپنی باری لینے کا انتظار کر رہا ہے۔ ادھر تو زرداری سے بھٹو بنا پڑا مگر کچھ تو ایسے ہیں جن کو اپنے نام کے ساتھ شریف، الٰہی، گیلانی، مخدوم وغیرہ لگا دیکھ کر ہی اپنے آپ کو حاکم اعلیٰ تصور کرنا شروع کر دیا ہے۔ اگر ان موروثی سیاستدانوں سے اس زمرے میں بات کی جائے تو وہ دنیا کے دوسرے ممالک کی مثالیں دینا شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ کبھی کسی ملک کو موروثی سیاست نے ترقی کے زینے پر نہیں چڑھایا۔ بھارت میں بھی گاندھی خاندان کے بعد ہی ترقی کرنا شروع کی ہے۔ زندگی کے دوسرے شعبہ جات میں بھی موروثیت کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔ مثلاً سپورٹس، فن لطیفہ اور فوج وغیرہ میں بھی یہ سلسلہ چلتا ہے۔ مگر

اس میں جانشین کا ٹیلنٹ اس کو اس مقام پر فائز رکھتا ہے۔ اگر کھلاڑی اچھا نہ کھیلے تو چاہے وہ گواسکر کا بیٹا ہو یا عبدالقادر کا ٹیم میں نہیں ٹک سکتا...... بیٹا وحید مراد کا ہو یا سلطان راہی کا اگر شائقین کو متاثر نہ کر سکے گا تو اس کو بھی کوئی اور کام ڈھونڈنا پڑتا ہے مگر سیاست میں ایسا نہیں ہوتا بس شجرہ نسب سیاسی ہو باقی اہلیت کی پروا کون کرتا ہے؟ ملکی معاملات تو ویسے بھی زوال پذیر قوم کے کوئی اور ہی چلاتا ہے تو اپنی باری لینے میں کیا حرج ہے؟ کپڑا پاشاں ایں مالکاں دا تے توبی دی کی جائی اے چھو......! اب اس میں قصوروار عوام ہی ہے جو سب کچھ جان کر بھی جان بچانا نہیں چاہتے۔ اسی لیے تو یہ موروثی سیاست دان کھلے عام کہتے ہیں کہ ہم کو جنھوں نے اپنے اوپر مسلط کیا ہے ان کو اب برداشت کرنا ہوگا۔

تاریخ آہستہ آہستہ ظلم اور استحصال سے عدل و مساوات کی جانب بڑھ رہی ہے۔ انسان میں بعض پوشیدہ صلاحیتیں موجود ہیں جو رفتہ رفتہ ظاہر ہو رہی ہیں۔ انسان کو عدل و انصاف کی ضرورت کا احساس زیادہ ہو رہا ہے۔ سب انسان ذہنی نشو و نما کے اعتبار سے برابر نہیں لیکن ہر انسان کو اس کی صلاحیتوں کو نشو و نما دینے کا موقع مساوی طور پر ملنا چاہئے۔ یہ صلاحیتیں، جن کی بنیاد اخلاقی ہے، زیادہ سے زیادہ اجاگر ہو رہی ہیں۔ تاریخ کا رخ اسی سمت میں ہے۔ انسان زیادہ سے زیادہ روادار اور جمہوریت پسند ہوتا جا رہا ہے۔ مشہور فلاسفر کانٹ نے اس ترقی پسند نظریے کی تائید کی تھی۔ اس کے مطابق اس عمل کو جاری رکھنے کے لیے کچھ لوازمات پر زور دیا۔ اس نے کہا مذہب انسان کے لیے رحمت بن کر آیا ہے۔ بقول کانٹ حضرت مسیح نے زمین پر خدائی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی مگر ان کے مقصد کو غلط سمجھا گیا اور ہم پر خدا کی بجائے پادری کی حکومت قائم ہو گئی۔ آج اگر ہم اپنا جائزہ لیں تو کیا ہماری عوام کو اپنی صلاحیتوں کی مساوی نشو و نما کا مساوی موقع دیا جا رہا ہے؟ کیا کسی غریب میں سیاسی بصیرت نہیں ہو سکتی؟ کیا ایک عام شہری اقتدار کی ایوانوں میں آ کر ملکی معاملات کو سنوارنے میں مددگار ثابت نہیں ہو سکتا؟ اس ملک میں تو سیاست بھی ایک نشہ بن گیا ہے جو نسل در نسل منتقل

ہوتا جارہا ہے۔اب تو کمپیوٹرائزڈ جانشینوں کا یہ عالم ہے ان کو قومی زبان تو درکنار قومی ترانہ بھی نہیں آتا۔ایم کیو ایم نے اس موروثی سیاست کے غبارے سے ہوا نکالنے کی کوشش کی ہے۔اگر اسی طرح عمران خان اور دیگر بھی موروثی سیاست کے اس قلعے کا تالہ توڑنے میں کامیاب ہو گئے تو ملک میں ایک انقلابی تبدیلی آ سکتی ہے۔جیسے مغلیہ سلطنت کے زوال کا باعث اندرونی اور بیرونی طاقتیں بنیں تھیں اسی طرح اس موروثی سیاست کا بھی خاتمہ ممکن ہے۔سوچنے کی یہ بات ہے اس نے آج تک ہم کو کیا دیا ؟ ملک کو بلوغت سے سیدھا بڑھاپے میں دھکیل دیا۔ہر دور پہلے سے بدتر لگتا ہے۔۔۔۔۔!!!

اس میں چند مخصوص خاندانوں کا ہی عمل دخل رہا ہے اور آئندہ کے لیے بھی ان کی منصوبہ بندی جاری ہے۔ان میں سے کچھ درج ذیل ہیں۔

خاندان بھٹو۔۔۔۔پیر بخش بھٹو، ڈوڈا خان بھٹو، خدا بخش بھٹو، امیر بخش بھٹو، الٰہی بخش بھٹو، غلام مرتضیٰ بھٹو، رسول بخش بھٹو، سر شاہنواز بھٹو، ذوالفقار علی بھٹو، سردار وحید بخش بھٹو، ممتاز بھٹو، نصرت بھٹو، بینظیر بھٹو، مرتضیٰ بھٹو، شاہنواز بھٹو، فاطمہ بھٹو، امیر بخش بھٹو، غنویٰ بھٹو۔

خاندان سومرو۔۔۔۔خان بہادر اللہ بخش سومرو، سردار محمد عثمان سومرو، الٰہی بخش سومرو، رحیم بخش سومرو، محمد میاں سومرو، بیگم سعیدہ سومرو، محمد خان سومرو، عبدالوحید سومرو، افتخار سومرو، سردار جنید احمد سومرو، ثناءاللہ سومرو،

چوہدری آف گجرات۔۔۔۔چوہدری ظہور الٰہی، چوہدری شجاعت حسین، چوہدری وجاہت حسین، پرویز الٰہی، مونس الٰہی، چوہدری شفاعت حسین،

خاندان جتوئی ۔۔۔۔خان بہادر امام بخش جتوئی، میر عابد جتوئی، غلام مصطفےٰ جتوئی، مسرور جتوئی، عبدالحمید خان جتوئی، لیاقت علی خان جتوئی، عبدالقیوم جتوئی، ابراہیم جتوئی

خاندان تالپور۔۔۔۔علی احمد تالپور، میر رسول بخش تالپور، میر حیدر تالپور،

خاندان گبول۔۔۔۔سردار خان بہادر اللہ بخش گبول، عبدالستار گبول، نبیل گبول

خاندان سردار آف ایبٹ آباد۔۔۔۔سردار زین محمد خان، سردار اسلم خان، سردار محمد اسلم، سردار گل زمان، سردار حیدر زمان، سردار گل خطاب خان، سردار یعقوب، سردار ادریس، سردار غلام نبی خاندان

مروت۔۔۔۔حبیب اللہ خان مروت، خان محمد عظیم مروت، محمد یوسف خان مروت، عبید اللہ جان ، انور کمال خان مروت، محمد سلیم خان مروت، اختر منیر خان مروت، طارق ہمایوں خان مروت، عابد نواز مروت، خان منصور کمال خان مروت، اسداللہ خان مروت، ثناءاللہ خان مروت، محمد اکرم خان مروت، ایوب خان مروت، فریداللہ خان مروت، ڈاکٹر طارق سلیم مروت، عارف اللہ خان مروت، عبدالرشید خان مروت، آصف کمال مروت، رؤف کمال مروت، محمد یوسف خان مروت، خان غلام داود خان مروت، ابراہیم کمال خان مروت، اشتیاق احمد خان مروت، وارث کمال خان مروت، سلمان سلیم مروت

خاندان حیات۔۔۔۔نواب محمد حیات خان، نواب اسلم حیات خان، نواب مظفر علی خان، نواب غلاب خان، نواب غلام خان، سردار مسعود حیات، سردار سر لیاقت حیات خان، سردار سکندر حیات خان، جنرل احسان حیات،

خاندان جونیجو۔۔۔۔جان محمد جونیجو، خان بہادر محمد حیات جونیجو، محمد رسول جونیجو، محمد خان جونیجو، جام صادق علی، سرفراز علی جونیجو، چکر علی خان جونیجو، شاہنواز خان جونیجو، روشن جونیجو

خاندان پٹھان۔۔۔۔صاحبزادہ رضا خان قصوری، خضر حیات خان قصوری، شاہد محمد خان سواتی

خاندان راؤ۔۔۔۔۔راؤ انیل الرحمان، راؤ عبدل قوی خان، راؤ جہاں زیب، راؤ محمد اسلم خان، راؤ محمد افضل رحمانی، راؤ محمد حسن، راؤ اجمل خان، راؤ سکندر اقبال، راؤ عاطف، راؤ محمد قیصر علی خان، راؤ محمد صفدر خان، راؤ محمد جلال علی خان، راؤ محمد طاہر علی خان، راؤ محمد محسن علی خان، راؤ جمیل اختر، راؤ خالد خان، راؤ فیاض خان، راؤ محمد ہاشم خان، راؤ محمد جمیل ہاشم خان، راؤ شقاعت علی خان چوہان، راؤ شبیر بلو خان

خاندان ضیاءالحق۔۔۔۔۔محمد ضیاءالحق، اعجاز الحق، انوار الحق

خاندان نون۔۔۔۔۔خالد ملک ٹوانہ، ملک عامر علی نون، ملک عدنان حیات نون، ملک اکبر حیات نون، ملک امجد علی نون، ملک انور علی نون، ملک اسد علی نون، ملک اظہر حیات نون، ملک عطا نون، ملک فتح محمد نون، ملک صاحب خان نون، ملک احمد خان نون، ملک فیروز خان نون، ملک حکیم خان نون، ملک حامد علی نون، ملک منظور حیات نون، ملک مظہر حیات نون، ملک منور علی نون، ملک نور حیات نون، ملک سردار خان نون، ملک سلطان علی خان نون، ملک ظہور حیات خان نون

خاندان ملک اعوان۔۔۔۔۔محمد بوستان خان، محمد سرفراز خان، محمد اورنگزیب خان، محمد ریاض خان، محمد رضا خان، محمد خضر حیات خان، نوشین ریاض خان، نثار خان، یحیی ریاض خان، محمد نادر خان، محمد مراد خان، محمد سکندر رضا خان، محمد اکبر رضا خان

خاندان لغاری۔۔۔۔۔نواب سر سردار محمد جمال خان لغاری، نواب سردار محمد خان لغاری، نواب محمد خان لغاری، سردار محمد افضل خان لغاری، بیگم عفیفہ، سردار فاروق احمد خان لغاری، سردار محمد جعفر خان لغاری، سردار ہارون عارف لغاری، سردار مقصود احمد خان لغاری، سردار منصور احمد خان لغاری، سردار رفیق احمد خان لغاری، سردار محمد جمال خان لغاری، اویس لغاری، مینہ احسان لغاری، سردار محمد یوسف خان لغاری، سردار محمد خان لغاری، سردار محمد محسن خان لعاری، سردار نادر اکمل خان لغاری، سردار رفیق حیدر خان لغاری، سردار محمد اظہر خان لغاری، ڈاکٹر جاوید لغاری، ڈاکٹر عبدالروف لغاری

خاندان قاضی۔۔۔۔۔قاضی عبدالقیوم، قاضی محمد اکبر، قاضی عبدالجید، قاضی عبدالقیوم، قاضی محمد اعظم، قاضی محمد حکیم احسان، فہمیدہ مرزا، قاضی اسد عابد، امینہ اشرف، ذوالفقار مرزا، پیر مظہر الحق، ماروی مظہر

خاندان زرداری۔۔۔۔۔حاکم علی زرداری، آصف علی زرداری، عذرہ پلیجو، فریال تالپور، بلاول بھٹو زرداری،

خاندان ٹوانہ۔۔۔۔۔ملک فتح خان ٹوانہ، ملک محمد شیر خان ٹوانہ، نواب سر کے بی ملک اللہ بخش ٹوانہ، ملک خدا بخش ٹوانہ، ملک انور ٹوانہ، ملک احسان اللہ ٹوانہ، خدا بخش ٹوانہ

خاندان چوہدری۔۔۔۔۔چوہدری اقبال، چوہدری اشرف، چوہدری زکاء اشرف، چوہدری جعفر اقبال، چوہدری ناصر اقبال، بیگم عشرت اشرف

خاندان قاضی آف چنیوٹ۔۔۔۔۔قاضی غلام شبیر، قاضی حسن صفدر، حسن علی، نواب قاضی غلام مرتضیٰ

خاندان کالاباغ آف میانوالی۔۔۔۔۔نواب آف کالاباغ عامر محمد خان،

خاندان ملک آف چکوال۔تلہ گنگ۔خوشاب۔اٹک۔۔۔۔۔سردار فیض خان ٹمن، سردار منصور حیات ٹمن، ایئر مارشل نور خان اعوان، جنرل ریٹائرڈ مجید ملک، ملک ظہور اعوان، ملک تنویر اسلم، کرنل ریٹائرڈ سلطان سرخرو اعوان، ملک کرم بخش اعوان، ملک بشیر اعوان، ملک عمر اسلم اعوان، ملک نعیم خان اعوان، سمیرا ملک، ملک ریاض اعوان، ملک اسلم اعوان، ملک امین اسلم خان، ملک حکیم خان، شاہان ملک، سردار سکندر حیات خان، سردار شوکت حیات خان، غلام سرور خان، صادق خان، میجر طاہر صادق، انجم عقیل خان کوڑہ اعوان

خاندان جنجوعہ۔۔۔۔۔تہمینہ جنجوعہ، نواب طالب مہدی خان، راجہ محمد افضل خان، راجہ لہراسب خان، نواب زادہ اقبال مہدی خان، راجہ محمد اسد خان، راجہ محمد صفدر خان، راجہ محمد اختر خان، راجہ الیاس اختر، راجہ محمد ظفر الحق، حافظ راجہ اعجاز محمود خان، راجہ محمد علی، راجہ احمد سلیم خان، راجہ محمد اشتیاق احمد جنجوعہ، راجہ سعید احمد، لفٹیننٹ کرنل محمد صادق، راجہ احمد علی

خاندان خواجہ۔۔۔۔۔خواجہ صفدر، خواجہ آصف،

مندجہ بالا رئیس خاندانوں کے ہاتھوں میں اقتدار کی ڈور رہی اور غریب عوام اپنے مسائل کے حل کی توقع ان سے کرتی رہی جن کا ان عوامی مسائل سے براہ راست کبھی تعلق نہیں رہا۔ان میں سے کچھ خاندان تو پاکستان بننے سے پہلے سے ہی انگریزوں کے ساتھ وفاداریاں نبھا کر ''سر'' کا خطاب سے نوازے جا چکے تھے۔انگریز تو چلا گیا مگر ''سر'' والے اور ان کے وارث آج بھی ہمارے سر پر سوار ہیں۔اب وقت آ گیا ہے کہ سر اٹھا کر جینے کے لیے ان کو مزید سروں پر نہ بٹھائیں۔ورنہ وہی ہوتا رہے گا جو آج تک یہ کرتے چلے آئے ہیں۔پاکستان کی کامیاب موروثی سیاست کی ایک بات مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی کہ یہاں غدار ابنِ غدار کا بیٹا پاکستان کا آخری گورنر جنرل اور پہلا صدر بن گیا لیکن قائداعظم کی بہن ایک فوجی ڈکٹیٹر سے ہار گئیں۔

روزنامہ ''دن'' لاہور 17 اگست 2011ء

❁-----❁-----❁

قابل غور

☆ یقیناً ہمارے ساتھ ساتھ انگریزوں کے شکر گزار گھوڑے، گدھے، خچر، اونٹ اور بیل بھی ہوں گے کیونکہ اگر انگریز ریلوے کا یہ وسیع وعریض نظام ہمارے خطے میں متعارف نہ کرواتے تو آج بھی ہمارے لیے یہ جانور مال برداری اور نقل و حمل کے کاموں میں ہمارا

ساتھ دے رہے ہوتے۔

☆ یہ تو ایک ماہ کا رمضان ہے اب ہم اتنے پکے ہو گئے ہیں کہ سارا سال بھی روزے رہیں تو ان کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

☆ ریلوے کا سفر چاہے suffer بن جائے پھر بھی اس کو برداشت کرتے جانا ہی پاکستانیت ہے۔

☆ مہنگائی کا جن دن میں کئی بار اپنی مکروہ صورت دکھاتا ہے مگر ہمارے حوصلے کا قد آج تک اس جن سے چھوٹا نہ ہو سکا۔

❁---❁---❁

صبر اور برداشت کا دوغلا معیار

ماہ رمضان میں ہماری زندگی کے تمام امور میں ایک واضح تبدیلی آتی ہے۔جسے ہمارے علاوہ دیگر مذاہب کے لوگ بھی محسوس کرتے ہیں۔مسلم اکثریت والے ممالک میں تو یہ تبدیلی معمول کا حصہ محسوس ہوتی ہے مگر جہاں مسلمان اکثریت میں نہ ہوں وہاں بعض اوقات دیگر مذاہب کے افراد کے لیے سحری کے وقت اٹھ کر روزہ رکھنا اور سارا دن کھائے پیئے بغیر کام کرنا حیرانگی کا باعث بھی بنتا ہے اور ان کے ذہنوں میں کئی سوالات جنم لیتے ہیں۔رمضان کے آغاز میں میرے ساتھ کام کرنے والے چند برطانوی ساتھیوں نے مجھ سے پوچھا کہ ہم اتنی صبح اٹھ کر کیسے کھا لیتے ہیں؟ کیونکہ اتنی صبح تو زیادہ کھایا بھی نہیں جاتا تو پھر ہم سارا دن بھوکے پیاسے گزار کیسے کر لیتے ہیں؟میرے جواب دینے سے پہلے ایک نے کہا کہ ہم میں صبر اور برداشت کا مادہ بہت زیادہ ہے۔ورنہ انسان 17 گھنٹے کچھ کھائے پیئے بغیر نہیں گزار سکتا اور وہ بھی اس وقت جب ہر چیز میسر بھی ہو۔اُن سے بات چیت کا سلسلہ تو خیر معمول کی بات ہے لیکن میرے ذہن میں اپنی عوام کا خیال آیا جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے نماز کے بعد سب زیادہ اہتمام ''روزہ'' کا کرتے ہیں۔مگر ان کے حالات برطانیہ سے کہیں مختلف ہیں کہ یہاں سحری، افطاری، اور تراویح کے دوران کبھی لوڈشیڈنگ کا عذاب نازل نہیں ہوتا اور نہ ہی سجدے کے دوران نظریں دروازوں کی طرف ہوتی ہیں۔یہاں اگر کوئی خوف ہے تو صرف اللہ رب العزت کا۔رمضان شروع ہوتے ہی لوڈشیڈنگ کا دورانیہ بھی ضروریات زندگی کی طرح بڑھا دیا گیا ہے۔واقعی ہماری عوام میں ہمت، حوصلہ اور برداشت قابل دید ہے۔جو بڑے حوصلے اور صبر سے سب کچھ برداشت کرتے جا رہے ہیں۔جس شرح سے بجلی کے نرخ بڑھائے جاتے ہیں اسی تناسب سے لوڈشیڈنگ کا

دورانیہ بھی بڑھایا جاتا ہے۔ستم ظریفی یہ ہے کہ اس کا بھاری بل ادا کرنے کے لیے کڑکتی دھوپ میں قطار میں کھڑے ہو کر اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ہماری عوام بڑے حوصلے اور برداشت سے بل بھی باقاعدگی سے ادا کرتی ہے۔برداشت اور حوصلے کا جو اعلیٰ میعار پاکستانی قوم میں پایا جاتا ہے اس کی مثال دنیا میں کسی اور قوم میں نہیں ملتی لیکن شاید اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں یہ سب کچھ تو ہمیں وراثت میں ملا اور پھر آہستہ آہستہ ہمارے خون میں ہی شامل ہو گیا ہے۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نے ہماری غیرت تک کو نگل لیا ہے۔اب تو ہم کو مشکل نہ پڑے تو ہم مشکل میں پڑ جاتے ہیں۔پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے کچھ دیر بعد ہمارے محبوب قائد کی جدائی کو برداشت کرنا پڑا۔اس کے بعد قائد ملت کی شہادت کے سانحے کو بڑے حوصلے سے برداشت کیا۔پھر سقوط ڈھاکہ جیسے بڑے دھچکے کو بڑے حوصلے سے ہضم کیا۔قیام پاکستان کے وقت پورے ملک میں کے انگریزوں کا بچھایا ہوا ریلوے ٹریک اور اس وقت کی ایشیا کی سب سے بڑی ریلوے ورکشاپ حصے میں آئی۔چار دہائیوں تک ریلوے کو پاکستان کا سب سے بڑا قومی ادارہ ہونے کا اعزاز بھی حاصل تھا۔یقیناً ہمارے ساتھ ساتھ انگریزوں کے شکر گزار گھوڑے، گدھے، خچر، اونٹ اور بیل بھی ہوں گے کیونکہ اگر انگریز ریلوے کا یہ وسیع و عریض نظام ہمارے خطے میں متعارف نہ کرواتے تو آج بھی ہمارے لیے یہ جانور مال برداری اور نقل و حمل کے کاموں میں ہمارا ساتھ دے رہے ہوتے۔ریلوے ساری دنیا میں ایسا ادارہ ہوتا ہے جس سے عوام براہ راست فائدہ اٹھاتے ہیں مگر ہماری اس عوامی سواری کا حال ایسا بے حال کیا گیا ہے کہ اب ادارے کو خسارے کی ایک علامت سمجھا جانے لگا ہے۔مگر ہماری عوام اس سہولت سے محروم ہو کر بھی با حوصلہ اور برداشت کی تو کوئی مثال ہی نہیں ہے۔ریلوے کا سفر چاہے suffer بن جائے پھر بھی اس کو برداشت کرتے جانا ہی پاکستانیت ہے۔موجودہ دور میں واپڈا سب سے بڑا قومی ادارہ ہونے کا دعویدار ہے اور اب یہ بھی ریلوے کے نقش قدم چلنا شروع ہو گیا ہے۔اس محکمے میں بھی ریلوے کی طرح چور اور

چوکیدار میں کوئی فرق نہیں رہا۔مگر ہماری عوام اس کا بھی بیڑہ غرق ہوتے بڑے حوصلے سے دیکھ رہی ہے۔پاکستان اسٹیل ملز جس کے فرنس کی آگ ہر چیز کو کھا جاتی تھی۔اس کو چند "لوہا خوروں" نے ایسا ہڑپ کیا ہے کہ ڈکار کی آواز بھی سنائی نہیں دی۔ہماری عوام ظلم و زیادتی کی اس آگ میں سونے سے کندن بنتے جا رہے ہیں۔آفرین ہے اس قوم پر جس کی زبان پر کبھی شکوہ یا شکایت تک نہیں آئی۔یہ تو بس کسی کو بھی صبر اور برداشت میں اپنا ثانی بنانا نہیں چاہتے۔یہ تو ایک ماہ کا رمضان ہے اب ہم اتنے پکے ہو گئے ہیں کہ سارا سال بھی روزے رہیں تو ان کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔۱۹۸۷ء کے بوہڑی بازار کے بم دھماکے کے بعد کبھی نہ رکنے والا بم دھماکوں یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔جس میں ان گنت قیمتی جانوں کا ضیاع ہوا۔ٹارگٹ کلنگ ہے کہ "ہوس" کی طرح بڑھتی ہی جا رہی ہے۔قدرتی آفات نے کئی بار ہم کو جھنجوڑ کر باخبر کیا لیکن ہماری قوم صبر و برداشت اور غفلت کی نیند سے بیدار نہ ہوئی۔کبھی ریمنڈ ڈیوس قتل و غارت کا بازار گرم کرنے کے بعد عزت سے اپنے ملک روانہ کیا گیا تو کبھی عافیہ اور اس جیسے ہزاروں افراد کو امریکہ کے حوالے کیا گیا۔مگر مجال ہے کہ ہمارے حوصلے اور برداشت نے کبھی جواب دیا ہو......!ڈرون اور خودکش حملہ آوروں کے ہاتھوں لاشوں کے ڈھیر لگتے رہے، ہماری عوام اس کو بھی اپنی قسمت سمجھ کر برداشت کرتی رہی۔مہنگائی کا جن دن میں کئی بار اپنی مکروہ صورت دکھاتا ہے مگر ہمارے حوصلے کا قد آج تک اس جن سے چھوٹا نہ ہو سکا۔ایک طرف تو برداشت کے وسیع سمندر میں ظلم و ستم، جبر و بربریت، ناانصافی، چور بازاری، دہشت گردی اور زیادتی کی کئی داستانیں اس میں غرق ہو چکی ہیں اور دوسری طرف جہاں برداشت اور حوصلے سے کام لینا دانشمندی اور فرض ہوتا ہے وہاں ہمارا غصہ، جلال، غیرت حوصلے اور برداشت پر غالب آ جاتا ہے۔آج ہمارے بہت سے معاشرتی مسائل حوصلے اور برداشت کی کمی سے پیدا ہو رہے ہیں۔ایک دوسرے کو برداشت نہ کرنے سے ہم فرقوں، طبقوں اور، گروہوں میں تقسیم ہو کر نفاق کا شکار ہوتے جا رہے ہیں۔بچے بڑوں کی نوک جھونک چاہے وہ اصلاح کے لیے ہو

برداشت نہیں کرتے۔ بڑے چھوٹوں کی جدید سوچ اور انداز کو برداشت نہیں کرتے۔دوسروں کو تنقید کرنا سب سے آسان کام ہوتا ہے اور کچھ لوگوں کے لیے تو سب سے باعث تسکین کام ہی تنقید ہوتا ہے۔تنقید برداشت کرنے کے لیے بھی حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ہم اکثر تعمیری تنقید جو ہماری اصلاح کے لیے کی جائے وہ بھی برداشت نہیں کرتے۔حالانکہ آج کی ترقی یافتہ قوموں کی ترقی کا ایک راز یہ بھی تھا کہ ان کے مفکرین نے اپنی قوم پر بے رحم تنقیدیں کیں اور ان کی روشنی میں اپنی قوم کی بے راہ روی کے اسباب کی نشان دہی کر کے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کی تلافی کی۔چنانچہ آج ان کا شمار ترقی یافتہ قوموں میں ہوتا ہے۔زندہ قوموں کی چند خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ماضی اور حال پر تنقید کرتی رہتی ہیں۔تنقید کرنے کا شوق ہر انسان کو ہوتا ہے لیکن عموماً ایک فرد دوسرے فرد یا افراد پر تنقید کر کے خوش ہوتا ہے،ایک قوم دوسری قوم پر تنقید کر کے خوش ہوتی ہے لیکن بہترین اور سب سے مفید تنقید وہ ہے جو دوسروں پر نہیں اپنے آپ پر اور اپنی قوم پر کی جائے۔دوسروں کا محاسبہ کرنے کے ساتھ ساتھ خود اپنی قوم کا محاسبہ بھی کیا جائے۔ظاہر ہے کہ اپنی ذات کو نشانہ بنانا سب سے مشکل کام ہوتا ہے۔لیکن کسی قوم کے ذہنی طور پر "بالغ" ہونے کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو اپنے ماضی اور حال کو تنقید کا موضوع بناتی ہیں کہ ارتقاء کا عمل اس کے بغیر خوبصورتی سے آگے نہیں بڑھتا۔

(1) روزنامہ "دن" لاہور 22 اگست 2011ء

(2) دی نیشن لندن 2 ستمبر 2011ء

قابل غور

☆ بٹ صاحب نے عدالت کا لفظ دیکھتے ہی سب سے پہلے بینک جا کر جرمانہ ادا کیا اور مسکراتے ہوئے مجھے کہا کہ یہ میری زندگی کی مہنگی ترین سگریٹ ہے۔

☆ ریاست کی رٹ اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک اس کا نظام چلانے والوں میں سے کرپٹ لوگوں کا خاتمہ

نہ کیا جائے۔

☆ شب و روز رونقیں بکھیرنے والے اس شہر کو کچھ بلوائیوں نے ماتم کدہ بنا دیا ہے جہاں خوف و ہراس کی لہر نے معصوم شہریوں کا سکون برباد کر دیا ہے۔

☆ اقتدار پر قابض رہنے کے لیے مصالحت کے نام پر بار بار مصلحت کی جارہی ہے۔

❁-----❁-----❁

جنابِ قائد ہم شرمندہ ہیں

جون 2001ء کی بات ہے جرمنی کے شہر فرینکفورٹ میں، میں اور میرا ایک دوست طارق بشیر بٹ Hauptwache میں ایک بنچ پر بیٹھے باتوں میں مصروف تھے۔ بٹ صاحب سگریٹ نوش تھے۔ جیسے ہی انہوں نے اپنا سگریٹ ختم کیا اس کے بچے ہوے حصے کو انہوں نے زمین پر پھینک دیا جہاں پر پہلے بھی کچھ سگریٹ کے ٹکڑے موجود تھے۔ اسی وقت دو جرمن سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ سب سے پہلے انہوں نے اپنا تعارفی کارڈ دکھایا۔ ان کا تعلق شہری ماحول کو صاف اور حادثات سے پاک رکھنے سے تھا۔ انھوں نے بٹ صاحب کو سگریٹ کا ٹکڑا اٹھا کر قریبی لگے ہوئے کوڑے کے ڈبے میں پھینکنے کو کہا۔ جب بٹ صاحب فارغ ہوئے تو انہوں نے ان سے نام، تاریخ پیدائش اور پتہ پوچھ کر 10 یورو جرمانے کی پرچی بنا کر فوری جرمانہ ادا کرنے کو کہا۔ بٹ صاحب نے ان کو زمین پر پڑے سگریٹ کے وہ ٹکڑے دکھائے جو پہلے سے زمین پر موجود تھے مگر انہوں نے کہا کہ ان ٹکڑوں کو پھینکنے والوں کو انہوں نے نہیں دیکھا مگر آپ کو سگریٹ کا یہ ٹکڑا پھینکتے ہوے ہم دونوں نے دیکھا ہے۔ بٹ صاحب نے ان کو کہہ دیا کہ ان کی جیب میں اس وقت پیسے نہیں۔ تین دن بعد بٹ صاحب کو خط موصول ہوا جس میں وہی جرمانہ 15 یورو کر دیا گیا تھا۔ 5 یورو خط لکھنے کی فیس تھی۔ بٹ صاحب نے جذباتی ہو کر اس کو پھاڑ کر کوڑے میں پھینک دیا۔ دو ہفتوں بعد ان کو ایک اور خط ملا جس میں وہی جرمانہ لیٹ فیس کے ساتھ 45 یورو کر دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ یہ بھی تحریر تھا کہ اگر جرمانے کی یہ رقم 2 ہفتے کے اندر مذکورہ اکاونٹ میں جمع نہ کرائی گئی تو عدالتی کارروائی کی جائے گی اور عدالتی کارروائی کا سارا خرچ بھی بٹ بہادر کو برداشت کرنا پڑے گا۔ بٹ صاحب نے عدالت کا لفظ دیکھتے ہی سب سے پہلے بینک جا کر جرمانہ ادا

کیا اور مسکراتے ہوئے مجھے کہا کہ یہ میری زندگی کی مہنگی ترین سگریٹ ہے۔قانون کی بالا دستی کا یہ عالم کہ شہری عدالتی کارروائی کا لفظ سنا کر ہی اپنی کوتاہی پر جرمانہ ادا کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہاں کا عدالتی نظام سب سے بالاتر ہے اور بلاشبہ اندھا ہے۔اس کے بعد اس فیصلے پر عمل درآمد کروانا حکومت اپنا اولین فریضہ سمجھتی ہے چاہے یہ فیصلہ ان کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔دوسری طرف ہمارے ملک جرم کا ارتکاب کرنے سے پہلے پولیس کی معاونت کے لیے رابطے کیے جاتے ہیں، بھاری معاوضے ادا کیے جاتے ہیں۔اگر پولیس مذکورہ ہدف پورا نہ کرے تو لوگ قانون کی دیوی کی آنکھوں پر دولت کی پٹی باندھ دیتے ہیں۔اکثر ایماندار پولیس آفیسرز اور منصف کو عبرت کا نشان بھی بنایا گیا ہے۔اب تو وہ صحافی قربانی کا بکرا بننے شروع ہو گئے ہیں جنھوں نے اپنے پیشے سے وفا کر کے قلمی تقاضے ایمانداری سے پورے کرنے کی کوشش کی۔جب ریاست کے اندر ایک گروہ ریاست کا وجود پروان چڑھنا شروع ہو جائے تو اس کا حال ایسا ہی ہوتا ہے جیسے انسانی جسم میں کوئی جن داخل ہو کر اس کی روح کو قابو کر لیتا ہے۔اس جن کو نکالنے کے لیے جیسے کوئی سچا عامل نہیں ملتا ویسے ہی ریاست پر قابض مخصوص گروہ کی سرکوبی کرنے کے لیے کوئی مخلص، نڈر، دیانتدار اور سچا پاکستانی لیڈر نہیں مل رہا جو ریاست کو ان عناصر سے آزاد کرے۔ریاست کے نظام کی بیماری اتنی بڑھ چکی ہے کہ اس کا علاج اب Antibiotics یا Painkillers نہیں رہا۔اس اپاہج نظام کو ٹھیک کرنے کے لیے ایک آپریشن کی ضرورت ہے۔اس کے بعد بھی اس کو مستقبل میں ان بکٹیریا اور وائرس سے بچانے کے لیے حفاظتی ٹیکوں کے مکمل کورس کی ضرورت ہے۔ریاست کی رٹ اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک اس کا نظام چلانے والوں میں سے کرپٹ لوگوں کا خاتمہ نہ کیا جائے۔یہ وہی عناصر ہیں جو ملک میں بدامنی پھیلانے میں بلاواسطہ یا بلواسطہ ملوث ہیں۔بھارت میں گزشتہ چند ہفتوں میں دو بار حکومت کو کرپشن کے خلاف عوامی ردعمل کے آگے گھٹنے ٹیکنے پڑے۔پتہ نہیں ہماری عوام کی آنکھیں کب کھلیں گی؟ حکمران طبقہ تو ان کو "لارے" کی "لوری" دے کر غفلت کی

نیند سلانے میں کامیاب ہے۔

امن وامان تو پورے ملک میں ہی ناپید ہو چکا ہے مگر حالیہ دنوں میں کراچی تو دنیا کے خطرناک ترین شہروں میں شمار ہونے لگا ہے۔جہاں پر غریب عوام کے خون کی ہولی کھیلی جارہی ہے۔قائد کے شہر کراچی کو روشنیوں کا شہر بھی کہا جاتا تھا جو اب بارود کی بدبو اور دہشت گردی کی تاریکی میں ڈوب چکا ہے۔اس کو غریبوں کا مائی باپ شہر بھی کہا جاتا تھا جہاں پاکستان کے ہر علاقے سے لوگ روزی کمانے جاتے تھے۔شب و روز رونقیں بکھیرنے والے اس شہر کو کچھ بلوائیوں نے ماتم کدہ بنا دیا ہے جہاں خوف وہراس کی لہر نے معصوم شہریوں کا سکون برباد کر دیا ہے۔کراچی جو پاکستان کی معاشی گاڑی میں پہیوں کا کردار ادا کرتا ہے۔جس کے عدم استحکام کا مطلب ملک کی معاشی بدحالی ہے۔آج یہاں ہر طرف موت کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ریاست شہریوں کو تحفظ فراہم کرنے میں قطعی ناکام ہو چکی ہے۔اقتدار پر قابض رہنے کے لیے مصالحت کے نام پر بار بار مصلحت کی جارہی ہے۔ان حالات میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے "جناب قائد ہم شرمندہ ہیں"

حقیقت میں اس وقت تک امن وامان قائم نہیں ہو سکتا جب تک ملک کے عدالتی نظام کو درست نہ کیا جائے۔پاکستان میں غریب بندے کے حصے میں صرف خوف ہراس ہی رہ گیا ہے۔قانون بنانے والے ادارے ہوں یا عدالتیں ان کا بس بھی صرف غریب لوگوں پر ہی چلتا ہے۔یہاں قانون کا احترام اور خوف بھی صرف غریب طبقے کے دل و دماغ میں ہی ہے۔امیر طبقہ تو قانون بھی اپنی مرضی سے بنواتا ہے پھر ضرورت پڑنے پر اپنے مفاد کی خاطر اس میں تبدیلیاں بھی کرا لیتا ہے۔قانون اور انصاف سب کے لیے ایک ہونا چاہیے۔عوام نے بڑی آس اور امید سے عدلیہ بحال کروائی مگر غریب عوام کو تو آزاد عدلیہ بھی کچھ نہ دے سکی۔اگر عدالت کسی قصوروار کو سزا سناتی ہے تو اس پر عمل درآمد نہیں ہوتا۔کیونکہ کرپشن کے اس سمندر میں وہ مگرمچھ جن کو بڑی بڑی شارک مچھلیوں کا آشیرباد حاصل ہے بھلا ان کو یہ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں کیا کہہ سکتی ہیں۔ان کو

بھی پتہ ہے کہ سمندر میں رہ کر مگر مچھ سے بیر نہیں رکھا جا سکتا۔نظام چلانے اور اس کو بچانے کے لیے بعض اوقات تاریخی فیصلے کرنا پڑتے ہیں۔برطانیہ کے حالیہ فسادات میں 2 نوجوانوں کو انٹرنیٹ کے ذریعے لوگوں کو لوٹ مار پر اکسانے کے الزام میں 4،4 سال کی قید سنائی گئی۔عام حالات میں اس جرم کی سزا زیادہ سے زیادہ ایک وارننگ نوٹس ہوتا تھا مگر جن حالات میں یہ جرم سرزد ہوا اور اسکے جو اثرات مرتب ہوے ان کو بنیاد بنا کر عدالت نے تاریخی فیصلہ دیا جس پر ریاست نے عمل درآمد بھی کر دیا۔تا کہ آئندہ کوئی ایسا قدم اٹھانے سے پہلے اس کا انجام ذہن میں ضرور رکھے۔1733 لوگوں کو گرفتار کیا گیا،عدالتوں نے دن رات کام کر کے ایک ہفتے میں ہزار سے زائد افراد کو سزائیں بھی سنائیں۔ہمیں ابھی بہت کچھ درست کر سکتے ہیں لیکن شاید وہ دن دور نہیں جب ہم کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔

روزنامہ ''دن'' لاہور 26 اگست 2011ء

دی نیشن لندن 26 اگست 2011ء

قابل غور

☆ اگر ایک آبی جانور اپنے گرو یا مالک کے وعدے پر یقین کر کے اتنا باکمال ہو سکتا ہے تو ہمیں یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ ہم تو اشرف المخلوقات ہیں اگر ہم سے وعدے کر کے پورے کیے جائیں تو کیا ہم ترقی کی بلندیوں کو نہیں چھو سکتے؟

☆ مردِ حق کو تو آتش نمرود نہیں چھو سکتی چہ جائیکہ وہ سی 130 کے ملبے میں جل کر خاکستر ہو جائے......!!

☆ انصاف کا نام و نشان نہیں ، مہنگائی ، لوڈ شیڈنگ ، بے روزگاری اور کرپشن میں اتنے خودکفیل ہو چکے ہیں کہ اگر ان کو برآمد کر کے زرمبادلہ کمایا جا سکتا تو آج ورلڈ بینک ہم سے قرض لینے کی درخواست کرتا۔

☆ شاید کبھی ہمارے ملک میں بھی کوئی "انا" "انے وا" اٹھ کر کرپشن کے خلاف آواز اٹھائے۔

☆ ہمارے "انے" صرف بصارت ہی نہیں بصیرت سے بھی محروم ہیں۔

بصارت اور بصیرت سے محروم سیاستدان

ساؤتھ ویسٹ لندن کا ورلڈ آف ایڈونچر پارک جو یہاں کے مقامی اور باہر سے آنے والے سیاحوں کی توجہ کا خاص مرکز ہے۔یہاں پر انواع و اقسام کی تفریحی سرگرمیوں میں سب سے قابل ذکر آبی جانور "سی لائن" کا شو ہوتا ہے۔جس کو ہر عمر کے لوگ یکساں طور پر پسند کرتے ہیں۔تقریباً بیس منٹ کے اس شو میں "سی لائن" اپنی ٹرینر کے ہمراہ دن میں تین بار جلوہ گر ہو کر ڈانس، کھیل کود اور مختلف کرتب دکھا کر شائقین سے خوب داد وصول کرتا ہے۔آخر میں اس کی ٹرینر لوگوں کے ذہنوں میں اٹھنے والے اس سوال کا جواب دیتی ہے کہ اس نے اس آبی جانور کو کیسے اتنا باکمال بنا دیا کہ وہ بے زبان ہو کر بھی انسانی زبان سمجھ کر اس پر عمل کرتا ہے۔لڑکی نے بتایا کہ اس نے "سی لائن" کو اس مقام تک لانے میں بڑی محنت کی ہے۔اس کو سکھانے سے پہلے اس کی کمزوری یعنی "مچھلی" کھلانے کا وعدہ کیا جاتا ہے۔سیکھنے کے عمل میں ہر قدم پر اس کو مذکورہ ٹاسک پورا کرنے پر مچھلی کھلانے کا وعدہ وفا کیا جاتا ہے۔یوں قدم بہ قدم سیکھ کر "سی لائن" اس شعبے میں ماہر ہو گیا ہے۔لڑکی نے بتایا کہ سکھانے کے سارے عمل میں اس نے کبھی قول و فعل میں تضاد نہیں ہونے دیا۔اگر ایک آبی جانور اپنے گرو یا مالک کے وعدے پر یقین کر کے اتنا باکمال ہو سکتا ہے تو ہمیں یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ ہم تو اشرف المخلوقات ہیں اگر ہم سے وعدے کر کے پورے کیے جائیں تو کیا ہم ترقی کی بلندیوں کو نہیں چھو سکتے؟افسوس یہ ہے کہ ہمیں آج تک کھوکھلے نعروں اور جھوٹے وعدوں کے سوا کچھ دیا ہی نہیں گیا۔کبھی کوئی آمر 90 دن میں الیکشن کروانے کا وعدہ کر کے ہم پر گیارہ سال تک مسلط رہتا ہے اور اسلام کے نام پر دہشت گردی کا بیج بو کر خود کو مردِ حق کہلوانا شروع کر دیتا ہے اور چند ناعاقبت اندیش اُس کے نعرے بازوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔مردِ حق کو تو آتش نمرود نہیں چھو سکتی چہ جائیکہ وہ سی 130 کے ملبے

میں جل کر خاکستر ہو جائے ......!! کوئی روٹی، کپڑا اور مکان کا وعدہ کر کے عوام کو مہنگائی، بے روزگاری اور لوڈشیڈنگ کے تیروں سے گھائل کرتا ہے۔ کوئی روشن خیال پاکستان کا نعرہ لگا کر عوام کا مستقبل تاریک کرتا ہے۔ کوئی وردی میں جمہوریت کا ڈھونگ رچاتا ہے۔ کوئی صنعتی انقلاب لانے کا وعدہ کر کے عوامی امنگوں کا گلہ گھونٹنا شروع کر دیتا ہے۔ غرضیکہ ایک مخصوص طبقہ ہی پچھلے کئی سالوں سے وعدوں پہ وعدے کرتا جا رہا ہے۔ اب تو یہ عالم ہے کہ وعدہ بھی توڑتے ہیں تو اٹھا کے قرآن......! مگر حیرانگی اس بات کی ہے کہ ہماری عوام کو اس بات کا کبھی احساس ہی نہیں ہوا۔ شاید ان کا حافظہ اس معاملے میں کمزور ہے۔ ایک ''سی لائن'' کا گرو اس لیے وعدے کی پاسداری کرتا ہے تاکہ ''سی لائن'' کا اس پر اعتماد برقرار رہے کیونکہ اطاعت کی بنیاد ہی بھروسے پر ہوتی ہے۔ پاکستان کو ایسا مسائلستان بنا دیا گیا ہے جہاں کسی عام آدمی کی جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ نہیں۔ انصاف کا نام و نشان نہیں، مہنگائی، لوڈشیڈنگ، بے روزگاری اور کرپشن میں اتنے خود کفیل ہو چکے ہیں کہ اگر ان کو برآمد کر کے زرمبادلہ کمایا جا سکتا تو آج ورلڈ بینک ہم سے قرض لینے کی درخواست کرتا۔ عوامی استحصال کا میڈیا بڑا پرچار کرتا ہے، وکی لیکس کی طرح میڈیا بھی اشرافیہ کے سیاہ کارناموں کو ہمارے سامنے لاتا رہتا ہے۔ مگر مجال ہے کہ ہمارے سر پر کبھی جوں بھی رینگ جائے۔ لگتا ہے عوام کو کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ اس بات کا ہمارے سیاسی قائدین کو بخوبی اندازہ ہے کہ ہمارے لوگ ''اندھے'' ہیں۔ جن کے سامنے جو مرضی کر دو ان کو کچھ نظر نہیں آئے گا۔ تبھی تو یہ ''کانے'' راجہ بن جاتے ہیں۔ ان ''اندھے'' لوگوں پر مسلط ہونے والے سارے راجے ایک دوسرے کے بھی ''کانے'' ہوتے ہیں۔ اس لیے ان سب کی آپس میں خوب جمتی ہے۔ پیوستہ رہ شجر سے...... امید بہار رکھ......!!! شاید کبھی ہمارے ملک میں بھی کوئی ''انا'' ''اندھا'' اٹھ کر کرپشن کے خلاف آواز اٹھائے۔ کرپشن کے خلاف اک ایک مشعل جو ''انا ہزارے'' نے روشن کی ہے۔ شاید وہ ہمارے ملک میں بھی پہنچ جائے مگر اس مشعل کو تھامے گا کون؟ ادھر تو بھوک ہڑتال کرتے وقت بھی اتنی اذیت سے نہیں گزرنا پڑے گا کیونکہ بھوک سے لڑنے کے ہم کافی دیر سے ورلڈ چیمپئن ہیں۔ بھارت سے اگر موازنہ کیا

جائے تو پچھلے کچھ سالوں سے کرپشن کے علاوہ ہر چیز میں وہ ہم سے آگے ہیں۔ ہمارے ہاں تو حج جیسے مقدس فریضے میں بھی لوگ کرپشن کرتے ہوئے نہ کوئی خوف محسوس کرتے ہیں اور نہ شرم......! انا ہزارے نے کرپشن کے خلاف آواز اٹھا کر اپنے پیچھے جانثاروں کی ایک کثیر جماعت اکٹھی کر کے حکومت کو یہ دکھا دیا کہ وہاں کی عوام باشعور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''گاندھی کے بھگت'' نے سولہ دن کی بھوک ہڑتال اور عوامی دباؤ سے حکومتی مندر کی ایسی گھنٹیاں بجائیں کہ سرکار ''چرنوں'' پر گرنے پہ مجبور ہو گئی۔ بدعنوانیوں کے خلاف اٹھنے والی اس عوامی آواز کو پارلیمنٹ نے تحریک بننے سے پہلے ہی سن کر سمجھ لیا۔ انا ہزارے کے تمام مطالبات کو تسلیم کرتے ہوئے ان کے تین نکاتی بل کو لوک پال میں شامل کیا گیا۔ اس فتح کو عوام کی فتح قرار دیا گیا اور ساتھ کرپشن کے خلاف اس جنگ کو جاری رکھنے کا اعلان بھی کیا گیا۔ ہماری پارلیمنٹ سے منظور ہونے والے ایسے بلوں کی ایک طویل فہرست موجود ہے جن پر کبھی عمل درآمد نہ کیا گیا۔ ڈرون حملوں کے خلاف منظور کی گئی قرارداد اس کی ایک زندہ مثال ہے۔ ہمارے ملک میں تو کرپشن کا وہ سیلاب ہے جس کے ریلے میں پتہ نہیں کتنے ادارے بہہ چکے ہیں۔ کرپشن کے ساتھ لاقانونیت اور دہشت گردی کے منجدھار میں پھنسی عوامی ناؤ آخری ہچکولے لیتی نظر آ رہی ہے۔ فن وظیفہ میں ہمسایہ ملک کی نقل ہم بڑے شوق سے کرتے ہیں۔ کاش! انا ہزارے کے اس مثبت عمل کی بھی تقلید کی جائے مگر کوئی ''انا'' اِدھر اٹھ کر ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ اِدھر کسی ''اندھے'' کی آواز پر کون دھیان دے گا......؟ ہمارے ''اندھے'' صرف بصارت ہی نہیں بصیرت سے بھی محروم ہیں۔ جن کو نہ تو کچھ نظر آتا ہے اور نہ ہی کچھ سمجھ۔ ہمارے معاشرے میں شیر اور شیروں کے پتر تو بہت ہیں لیکن کاش اِن کی بصیرت ''سی لائن'' جتنی ہی ہوتی...... کاش!

روزنامہ ''دن'' لاہور 3 ستمبر 2011ء

دی نیشن لندن 9 ستمبر 2011ء

کی راکھی کی ذمہ داری اس کے کندھے پر ڈال دیتا ہے۔

☆ اگر اس معاملے کو بھی وقت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا تو آنے والا وقت ہم پر رحم نہیں کرے گا۔

☆ محترمہ شہید کو لحد میں اتارنے کے بعد آج تک زرداری صاحب نے ڈگری کے بغیر ایسی شاطرانہ چالیں چلیں ہیں کہ بڑے بڑے پی ایم اے اور آکسفورڈ کے پڑھے ہوئے بھی ان سے مات کھا گئے......!

قابل غور

☆ ''سیاسی باندر کلے'' کے اس کھیل میں کھلاڑی کی بصیرت اور مہارت سے زیادہ اس کی سیاسی نسل دیکھی جاتی ہے۔

☆ جب جوتے پڑنے کی باری آتی ہے تو شاطر کھلاڑی اپنی جان بچانے کے لیے کسی کو بھی ہاتھ لگا کر وقتی طور پر کلے

ذوالفقار مرزا۔۔۔مک مکاؤ۔۔۔مٹی پاؤ

پاکستان میں "سیاست" کو عوامی امنگوں کا آئینہ بنا کر دنیا میں اپنا تشخص مثبت انداز میں پیش کرنے کی بجائے اس کو ایک "موروثی کھیل" بنا دیا گیا ہے۔ "سیاسی باندر کلے" کے اس کھیل میں کھلاڑی کی بصیرت اور مہارت سے زیادہ اس کی سیاسی نسل دیکھی جاتی ہے۔سیاسی باندر کلے میں اقتدار کا رسہ اگر کسی اناڑی کے ہاتھ آ جائے تو وہ زیادہ دیر تک اس کلے پر رسہ تھام کر کھڑا نہیں رہ سکتا۔ایک تو اس کو اپنے کلے کی راکھی کرنے کے زیادہ گر نہیں آتے دوسرا اس کی آنکھوں پر چند مفاد پرست مشیر اعتماد کی پٹی باندھ دیتے ہیں۔پھر مجبوراً اس کو ویسا ہی کرنا پڑتا ہے جیسے مشورہ دیا جاتا ہے۔اس اناڑی کے اندھے پن کا فائدہ اٹھانے والے بہت جلد اس کو ایسے مقام تک پہنچا دیتے ہیں جہاں پر اسے اقتدار کا رسہ چھوڑ کر بھاگنا پڑتا ہے۔بعض اوقات دوڑ لندن اور جدہ تک بھی لگانی پڑ جاتی ہے۔کھلاڑی اگر شاطر ہو تو اقتداری کلے کی رسی کافی دیر تک تھامے رکھتا ہے۔جب حالات سازگار نہ رہیں تو جوتے کھانے سے پہلے ہی کلے کی رسی چھوڑ دیتا ہے۔بعض اوقات اقتداری کلے کی رسی بوٹوں والے کے ہاتھ بھی لگ جاتی ہے۔وہ تو ہوتے ہی آل راؤنڈر ہیں جو ہر کھیل میں کپتانی کے دعویدار بھی ہیں۔اپنے اقتداری کلے کی راکھی کرنا تو ان پر ختم ہے۔جب تک کلے پر کھڑے ہوں چھوٹے موٹے سیاست دان تو پاس آنے کی جرات ہی نہیں کرتے۔رسہ چھوڑ کر بھاگنے کی باری ان کی بھی آ ہی جاتی ہے......چاہے دیر سے ہی!!اس کھیل کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ہر اناڑی اور کھلاڑی کے مقدر میں آخرکار جوتے ہی لکھے ہوتے ہیں۔جب جوتے پڑنے کی باری آتی ہے تو شاطر کھلاڑی اپنی جان بچانے کے لیے کسی کو بھی ہاتھ لگا کر وقتی طور پر کلے کی راکھی کی ذمہ داری اس کے کندھے پر ڈال دیتا ہے۔مگر اس

"سیاسی باندر کلے" کا نشہ کچھ ایسا ہے کہ جوتے کھا کر بھی رسہ دوبارہ تھامنے کو دل کرتا ہے۔باندر کلے کا یہ کھیل اتنا مقبول ہو چکا ہے کہ اس کے منتظم اعلیٰ پیغا کون میں بیٹھ کر اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔اقتداری کلے پر کوئی بھی ہو اس کی ڈور وہ اپنے ہاتھ ہی رکھتے ہیں۔

کسی بھی ملک کی تقدیر سنوارنے اور حالات بدلنے میں سیاست ہی مرکزی کردار ادا کرتی ہے۔ہمارے سیاسی اکابرین نے اپنی ساری بصیرت اقتدار بچانے اور اپنے لیے دولت سمیٹنے میں صرف کردی ہے۔جب تک "نسلی" سیاستدان اس کو کھیل تماشہ سمجھ کر مزہ لیتے رہیں گے تب تک اس ملک اور غریب عوام کے حالات میں کوئی بہتری نہیں آئے گی۔سیاست اب ایوانوں تک محدود نہیں بلکہ اس نے ہر شعبہ زندگی کو اپنے سحر میں لے لیا ہے۔مذہب کے نام پر بھی مکروہ سیاست کا گھناؤنا کھیل کھیلا جاتا ہے۔پاکستانی سیاست کا نام لیتے ہی ایک لفظ جو سب سے پہلے لوگوں کے ذہن میں آتا ہے وہ "جھوٹ" ہے کیونکہ سچ اور ہماری سیاست دو متضاد چیزیں ہیں۔حالانکہ کوئی حکومت جھوٹ، جھوٹے وعدوں اور دعووں پر زیادہ دیر تک نہیں چل سکتیں مگر معجزانہ طور پر ہمارا ملک چاہے آدھا ہی رہ گیا......مگر ابھی تک قائم ہے۔اس میں بھی چند بندوں نے چاہے کسی بھی وجہ سے جرات کا مظاہرہ کر کے سچ بولا......!مگر ان کو گمنامی کی تاریکیوں میں ڈبو دیا گیا اور دوسروں کو باور کروا دیا گیا کہ......سچ بولنا مشکل ہے مگر سچ پر قائم رہنا اس سے مشکل......سچ کا ساتھ بغیر کسی لالچ اور خوف کے دینا مشکل ترین کام ہے۔گزشتہ کچھ عرصہ میں کچھ لوگوں نے اس روایت کو توڑ کر سچ بولا، کسی نے سچے یا مظلوم کا ساتھ دیا یا کسی نے اصولوں کی بات کی......تو نتیجہ ان کو عبرت کا نشان بنانے کی کوشش کی گئی یا ان کو بالکل دیوار کے ساتھ لگا دیا گیا۔ان میں اعتزاز حسن، ناہید خان، صفدر عباسی، شیریں رحمان، جاوید ہاشمی، سلمان تاثیر، عمران خان کے علاوہ کچھ صحافی لوگ بھی شامل ہیں۔اس کارخیر میں بریگیڈیئر (ر) امتیاز بلا بھی شامل ہیں۔ان سب نے لب کشائی کی، کچھ دن میڈیا میں واویلا مچا......پھر سارے معاملات ویسی ہی چلتا

شروع ہو گئے۔آخر آج تک کبھی کسی کے انکشافات کو سنجیدگی سے کیوں نہیں لیا گیا؟ آج تک کبھی کسی کے الزامات کی تصدیق کے لیے کوئی عدالتی کارروائی ہوئی؟ کوئی کمشین مقرر کیوں نہیں ہوا؟ اگر کوئی تاریخ کا مجرم تھا تو اُس کو سزا کیوں نہیں سنائی گئی؟ پہلے تو لوگ الزامات لگاتے تھے اب معاملہ اس سے ایک قدم آگے چلا گیا ہے۔اب باقاعدہ پریس کانفرنس کر کے قرآن پاک پر حلفیہ بیان دیا جاتا ہے۔ذوالفقار مرزا نے بیانات کی ایسی اندھا دھند فائرنگ کی کہ ایم کیو ایم کے ساتھ ساتھ رحمان ملک اور بابر اعوان کو سیاست کے مقبرے میں دفن کر دیا۔اُن کی پریس کانفرنس نے ان گنت سوالوں کو جنم دیا ہے مگر جواب اس کا ایک ہی ہے......مفادات کی جنگ......! اگر واقعی ان کے دل میں ایک دم سے ملک کی محبت اور عوام کا درد جاگ اٹھا ہے تو مرزا صاحب جذبات میں آدھا سچ تو بول چکے ہیں......آدھا سچ اور بول کر تاریخ میں اپنا نام ہی لکھوا دیں۔کیا پاکستان کو اس مقام تک لانے والے صرف رحمٰن ملک اور ایم کیو ایم ہی ہیں؟ سچ بولیں تو بلا امتیاز......بلا تفریق!! باقی کام عدالت پر چھوڑ دیا جائے تا کہ عوام کو بھی دیکھنے کا موقعہ ملے کہ جس چیف جسٹس کو بحال کروانے میں انھوں نے اپنا خون پسینہ پانی کی طرح بہایا اس کی قیمت بھلا چوہدری افتخار صاحب کیسے چکاتے ہیں۔ایک مثال قائم کرنے کے لیے کوئی بھی کیس لے کر اُس کا آن ایئر ٹرائل کر کے حق اور باطل کی اس جنگ کا آغاز کیا جائے۔اگر اس معاملے کو بھی وقت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا تو آنے والا وقت ہم پر رحم نہیں کرے گا۔ویسے مرزا صاحب نے جو انکشافات کیے ہیں وہ کوئی نئے نہیں۔یہ سب باتیں تو اکثر خاص محفلوں میں موزوں بحث رہتی تھیں۔مرزا صاحب نے اگر حوصلہ کر ہی لیا ہے تو سابقہ روایت برقرار رکھتے ہوئے......مٹی پاؤ۔۔کم مکاؤ۔۔والا فارمولا استعمال نہ کریں۔مرزا صاحب کی ایک بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ وہ میڈیا کے سامنے بڑا کچھ بول گئے مگر آصف زرداری کے آگے لب کشائی کی جرات نہیں کر سکتے۔ اگر وہ پارٹی اور قیادت کے اتنے خیر خواہ ہیں تو وفاداری کا تقاضا تو یہ تھا کہ جو آج میڈیا کے سامنے کہا وہ زرداری صاحب کے گوش گزار بھی کر دیتے۔یہ تو ایسا ہی لگتا ہے کہ وفا

کے مجسم پتلے نے اپنے آقا کے ایماء پر ہی یہ قدم اٹھایا ہو۔اس میں بھی اقتداری ”کلے“ کی رسی زیادہ عرصے تک تھامنے کی پلاننگ بھی ہو سکتی ہے۔محترمہ شہید کو لحد میں اتارنے کے بعد آج تک زرداری صاحب نے ڈگری کے بغیر ایسی شاطرانہ چالیں چلیں ہیں کہ بڑے بڑے پی ایم اے اور آکسفورڈ سے پڑھے ہوئے بھی ان سے مات کھا گئے......! پھر بھلا میاں صاحب اور الطاف حسین کس باغ کی مولی ہیں......؟؟ اب اگر ان میں اتنی سیاسی بصیرت ہے کہ وہ جب چاہیں حریف کو حلیف بنا لیں تو یہ سیاسی بصیرت اقتداری کلے کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے کے لیے کیوں استعمال ہو رہی ہے۔ اگر اسکو ذاتی مفادات کی بجائے ملکی مفادات کی خاطر استعمال کیا جائے تو عوام کو کچھ فائدہ بھی ہو......!!! مگر عوام کی کون سوچتا ہے؟ مرزا صاحب نے بھی اپنی پٹاری اور آستین سے جو سانپ نکالے ہیں وہ کس کو ڈستے ہیں۔۔کس کو نہیں......؟ ہو سکتا ہے ماضی کی طرح پھر ان کو مفاہمت کی بین بجا کر مست کر کے واپس پٹاری میں ڈال دیا جائے۔اگر یہ سانپ کسی کو ڈس بھی لے تو اس کا تریاق لندن، جدہ، دوبئی اور واشنگٹن میں مل جاتا ہے۔کچھ لوگ تو پہلے سے علاج کروا کر شفایاب ہو رہے ہیں اور سیاسی باندر کلے میں حصہ لینے کے لیے تیار ہیں۔

روزنامہ ”دن“ لاہور 9 ستمبر 2011ء

دی نیشن لندن 5 اگست 2011ء

قابل غور

☆ قبل از پرویز مشرف ضیاء الحق کے دور میں اگر کوئی صحافی، شاعر یا ادیب ایمانداری سے قلمی تقاضے پورے کرنے کی کوشش کرتا تو کوڑے اور قید و بند کی صعوبتیں اس کے مقدر میں لکھ دی جاتیں۔

☆ جس نے مکے لہرا کر دکھانے والے ڈکٹیٹر کو ایسا ناک آؤٹ کیا کہ بیچارہ آج تک بے اختیار ملکہ کا مہمان بن کر لندن میں بحالت مجبوری زندہ ہے۔

☆ اب فلمی اداکاروں اور ستاروں کا دور گزر گیا۔ان کی جگہ سیاسی اداکاروں اور اداکاراؤں نے لے رکھی ہے۔یہ سیاسی اداکار ٹی وی کے مختلف چینلوں پر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

☆ بریکنگ نیوز کا گراف بھی جس برق رفتاری سے بڑھ رہا ہے اس سے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ بہت جلد ایک چینل صرف ”بریکنگ نیوز“ ہی نشر کیا کرے گا۔

☆ جب تک مسائل کا ذکر ان لوگوں سے کرتے رہیں گے جو ان کے مآخذ ہیں تو مسئلے کبھی حل نہیں ہوں گے۔

پی پی پی۔۔۔پبلک۔۔۔پولیٹیشن۔۔۔پریس

پی پی پی جمہوری معاشرے کی تین اہم اکائیاں ہیں۔جن کے بغیر نہ جمہوریت عمل میں آ سکتی ہے اور نہ ہی پروان چڑھ سکتی ہے۔پی۔۔۔۔۔پبلک یعنی عوام، پی۔۔۔۔۔پریس یعنی میڈیا اور پی۔۔۔۔۔پولیٹیشن یعنی سیاستدان !!!پبلک اور پولیٹشن کے درمیان رابطے کا سب سے اہم ذریعہ پریس ہی ہوتا ہے۔کسی بھی سیاستدان یا سیاسی جماعت کے منشور اور سوچ کے زاویے کو بغیر منعکس کیے اس کی تشہیر عوام الناس میں کرنا۔۔۔۔۔عوام کے مسائل، پریشانیوں اور خواہشوں کو بھی سیاسی پنڈتوں کے مندروں تک پہنچا کر فریاد کی گھنٹیاں ایمانداری سے بجانا،ان کے مقدس فریضے میں شامل ہے۔آج آزاد میڈیا کے دور میں جس برق رفتاری سے عوام کو حقائق سے باخبر رکھ کر ان کا شعور بیدار کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے،ماضی میں اس کا کوئی تصور موجود نہ تھا۔قبل از پرویز مشرف ضیاء الحق کے دور میں اگر کوئی صحافی، شاعر یا ادیب ایمانداری سے قلمی تقاضے پورے کرنے کی کوشش کرتا تو کوڑے اور قید و بند کی صعوبتیں اس کے مقدر میں لکھ دی جاتیں۔خاص طور پر مشرف دور میں 9مارچ کے بعد میڈیا بھرپور عوامی قوت والا رکھنے والا ادارہ بن کر ابھرا۔جس نے مکے لہرا کر دکھانے والے ڈکٹیٹر کو ایسا ناک آؤٹ کیا کہ بیچارہ آج تک بے اختیار ملکہ کا مہمان بن کر لندن میں بحالت مجبوری زندہ ہے۔ہماری مظلوم اور بھولی عوام بہت جلد کسی کو بھی اپنا مسیحاء سمجھنا شروع کر دیتی ہے۔چیف جسٹس سے بڑی توقعات وابستہ کر لیں۔پاکستانی ہجوم نے یہ سوچ کر وکلاء تحریک کا بھرپور ساتھ دیا کہ چیف جسٹس بحال ہو کر معاشرے میں پھیلے ہوئے بد عنوانیوں کے سرطان کا شافی علاج دریافت کر کے ان کو نا انصافی کے گرداب سے نکالیں گے۔بدقسمتی سے ہمارا عدالتی نظام آج بھی طبقات بنیادوں پر چل رہا ہے۔ہر معا

ملہ چیف جسٹس تک پہنچ بھی نہیں سکتا۔اب عوام میڈیا کو بھی اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگی ہے۔یہ بھی جمہوری قدروں کا ایک حصہ ہے کہ عوامی مسائل اقتدار کے ایوانوں تک پہنچائے جائیں کیونکہ ایک عام آدمی کی رسائی خاص طور پر ہمارے ملک میں ان لوگوں تک ممکن نہیں ہوتی جنہوں نے مسائل کو حل کرنا ہوتا ہے۔لہٰذا میڈیا ہی عوام کی آواز بن کر حکمران طبقات تک پہنچتا ہے۔آج کے ترقی یافتہ دور میں میڈیا ملکی اور بین الاقوامی معاملات میں یکساں اہمیت کا حامل ہے۔میڈیا کی جنگ میں جو بھی اپنا موقف دلائل سے بیان کرے گا دنیا میں اس ملک کی قدر و منزلت میں اضافہ ہو گا۔ہمارے ملک میں ان گنت مسائل ہیں جن کی نشاندہی میڈیا کرتا رہتا ہے۔بعض اوقات ان مسائل کے ساتھ ساتھ قدرتی آفات جیسے مصائب بھی وارد ہو جاتے ہیں جن سے نپٹنے کے نت نئے طریقوں سے میڈیا ہی عوام کو روشناس کرواتا ہے۔جہاں تک ہمارے مسائل کا تعلق ہے ان کی صرف نشاندہی اور مناسب حل پیش کر کے میڈیا کی ذمہ داری ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس پر عمل درآمد کروانے کے لیے یکسوئی سے کام کرنا بھی اُن کی ذمہ داری میں شامل ہوتا ہے۔کسی زمانے میں لوگ تفریح کی خاطر تھیٹر اور سینما گھروں کا رخ کیا کرتے تھے۔پھر ایک دور آیا کہ فلم انڈسٹری تباہی کے اس دہانے پر جا پہنچی کہ سینما گھروں کے مالکان نے دل برداشتہ ہو کر ان کو مسمار کر کے شاپنگ پلازہ یا ہوٹل بنانا شروع کر دیئے۔حکومت پابندی عائد نہ کرتی تو آج شاید کوئی سینما گھر باقی نہ رہتا۔اب فلمی اداکاروں اور ستاروں کا دور گزر گیا۔ان کی جگہ سیاسی اداکاروں اور اداکاراؤں نے لے رکھی ہے۔یہ سیاسی اداکار ٹی وی کے مختلف چینلوں پر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ان کی پردوشن میڈیا والے اتنے موثر انداز سے کرتے ہیں کہ گھنٹوں میں ان کو ستارے سے سپر سٹار بنا دیتے ہیں۔اب تو یہ سیاسی ستارے ہالی ووڈ اور بالی ووڈ کے سپنے دیکھنا بھی شروع ہو گئے ہیں۔ٹی وی چینلز پر عوامی نمائندوں کو بیٹھا کر حالاتِ حاضرہ پر بات چیت، مسائل کی نشاندہی اور ان کا مناسب حل، ملکی اور بین الاقوامی امور پر تبادلہ خیال وغیرہ کسی پروگرام کے ذریعے نشر کرنا "ٹاک شو" کہلاتا ہے۔ہم بھی جنونی اور انتہا پسند ہیں

ایک بار ”ٹاک شوز“ شروع کیے تو ان کی بھر مار کر دی۔ بعض اوقات تو ان سیاسی اداکاروں کو ایک ٹاک شو سے اٹھ کر دوسرے ٹاک شو میں جانے کے دوران اپنا حلیہ یا کپڑے تبدیل کرنے کا موقع بھی نہیں ملتا۔ جس کا کچھ اداکاروں کو خاص طور پر گلہ بھی ہے۔ ٹاک شو میں اگر کسر پوری نہ ہو تو اس کی کمی کو پورا کرنے کے لیے باقاعدہ پریس کانفرنس کا اہتمام بھی کیا جانے لگا ہے۔ پریس اور پولیٹیشن اپنی تیسری پی یعنی پبلک کی تفریح کا خیال رکھتے ہوئے اپنے ٹاک شوز اور پریس کانفرنسز میں ہر قسم کا مصالحہ ڈال کر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ مقبولیت کے گراف میں کمی واقع نہ ہو۔ جس میں الزامات کی شمشیر زنی، گالی گلوچ، نازیبا اور غیر مہذب زبان کا استعمال، مار کٹائی، قرآن پر قسمیں، وعدے، نقلیں اتارنا، ناچنا، گانا، ڈرانا، دھمکانا اور مختلف زبانوں میں ڈائیلاگ بازی کرنا وغیرہ شامل ہے۔ پھر بھی اگر کوئی کمی بیشی رہ جائے تو بریکنگ نیوز کا سہارا بھی لیا جاتا ہے۔ بریکنگ نیوز کا گراف بھی جس برق رفتاری سے بڑھ رہا ہے اس سے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ بہت جلد ایک چینل صرف ”بریکنگ نیوز“ ہی نشر کیا کرے گا۔ نیوز کو بریک کرنے کی دوڑ جیتنے کا یہ عالم ہو گیا ہے کہ مریض آئی سی یو پہنچے تو اس کے مرنے کی خبر نشر کر دی جاتی ہے۔ ٹاک شوز اور پریس کانفرنس کی بڑھتی ہوئی رفتار سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب سال کے آخر پر ان سیاسی اداکاروں کو ایوارڈز سے نوازہ جائے گا۔ ایوارڈز کی اس تقریب میں سیاسی اداکاروں کے ساتھ اینکرز حضرات کو بھی ایوارڈ ملا کریں گے۔ اس میں یہ مسئلہ پڑ سکتا ہے کہ کس اداکار کو کونسا ایوارڈ دیا جائے کیونکہ ان میں سے زیادہ تر تو ہر فن مولا ہیں۔ ویسے ایوارڈز کی ایک لمبی لسٹ ہو گی جس میں بہترین ڈریسنگ، گانے، ناچ، ڈائیلاگ ڈیلیوری، فائٹر، فائٹ انسٹرکٹر، چائلڈ سٹار، کہانی نویس، پیش کار، ہیرو، ہیروئین، معاون اداکار، معاون اداکارہ، ہدایت کار، نوزائیدہ فنکار، وغیرہ وغیرہ ......مگر اس میں پریس اور پولیٹکس کو تو کچھ نہ کچھ مل گیا مگر پبلک بیچاری کے حصے میں کیا آئے گا......؟ اس کے حصے میں بھی ایک خاص بین الاقوامی ایوارڈ ہو گا......برداشت کا ایوارڈ۔ ان پریس کانفرسوں اور ٹاک شوز کا اس وقت

تک کوئی فائدہ نہیں جب تک کسی بھی مسئلے کا حل تلاش کر کے اس کو پایہ تکمیل تک نہ پہنچایا جائے۔ جب تک مسائل کا ذکر ان لوگوں سے کرتے رہیں گے جو ان کے مآخذ ہیں تو مسئلے کبھی حل نہیں ہوں گے۔ میڈیا کو چاہیے کہ عوام میں شعور بیدار کرے ان کو ووٹ کی طاقت کا صحیح استعمال کرنے میں اپنا کلیدی کردار ادا کرے۔ تا کہ آئندہ آنے والے نمائندے حقیقی اور خالصتاً عوامی ہوں۔ پاکستان کی نوجوان نسل میں بڑا دم اور ذہانت ہے۔ کبھی ان کو بھی ٹاک شوز میں موقع دیں۔ ان سے بھی ملکی مسائل کا حل جاننے کی کوشش کریں۔ جیسے عالم آن لائن یا شادی آن لائن پروگرام نشر کیے جاتے ہیں اسی طرح کبھی صدر پاکستان آن لائن، وزیر اعظم پاکستان آن لائن، وزیر اعلیٰ آن لائن، گورنر آن لائن، وزیر داخلہ آن لائن، وزیر ریلوے آن لائن، وزیر بجلی و پانی آن لائن، وزیر صحت آن لائن، وغیرہ بھی ہونے چاہئیں اور پروگرام کا دورانیہ بھی ذرا طویل ہو۔ کم از کم الطاف حسین کی پریس کانفرنس سے زیادہ ہو۔ تا کہ عوام کو بھی ایک بار اپنے چہیتے نمائندوں سے براہ راست بات کرنے کا موقع تو ملے کیونکہ پبلک بیچاری تو ان عوامی نمائندوں کو عوامی مقامات پر تو مل نہیں سکتی اور نہ ہی کبھی بات کرنے کا موقع ملتا ہے۔ بلٹ پروف گاڑیاں، بلٹ پروف جیکٹ، ترقی پروف قواریر اور مضبوط حفاظتی حصار پھلانگ کر ایک عام شہری تو ان تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ ان حالات میں پریس ہی پبلک اور پولیٹیشن کے درمیان رابطے کا موثر ذریعہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ جس دن یہ رابطہ صحیح معنوں میں بحال ہو گیا تو حقیقی ”جمہوریت“ کا آغاز ہو جائے گا۔ جب تک پبلک اور پولیٹیشن میں یہ خلیج رہے گی میڈیا کی تمام تر کوششوں کے باوجود جمہوری عمل صرف کاغذی حدود تک ہی محدود رہے گا۔

روزنامہ ”دن“ لاہور 27 ستمبر 2011ء

دی نیشن لندن 4 نومبر 2011ء

قابل غور

☆ چند دن جوش جذبہ دکھا کر اپنی راہیں اور منزل بدل لینا اب ہماری نفسیات کا حصہ بنتا جا رہا ہے۔

☆ کہاں رونا ہے------الطاف حسین سے بہتر کون جانتا ہے؟ کہاں ہنسنا ہے رحمٰن ملک کو دیکھو------! کہاں جوش میں آنا

ہے فیصل رضا عابدی، ذوالفقار مرزا، رانا ثناء اللہ اور عابد شیر علی سے سیکھا جا سکتا ہے۔

☆ آقا------! میرے لیے بھی عوام میں کچھ خون چھوڑ دیا کریں" ------!!! کتا تو کتے کا بیری سنا ہے مگر یہ خون چوسنے والے تو آپس میں ہم نوالہ اور ہم پیالہ ہیں۔

☆ سرچ ہو یا ریسرچ دونوں میں ہم آج تک کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر سکے۔ اتنے سالوں سے سرچ آپریشن جاری ہیں مگر دہشت گرد ایسے ہمارے گلی کوچوں میں دوڑتے ہیں جیسے شریانوں میں خون------

☆ پاکستان ریلوے اور اسٹیل ملز آف پاکستان کا خسارہ تو عوام کے سامنے آ ہی جاتا ہے کیونکہ یہ ادارے آڈٹ کے عمل سے گزرتے ہیں۔ یہ لیبارٹری جس میں میں کام کرتا رہا ہوں اس عمل سے اس لیے مستثنا ہے کہ یہ حساس ادارے کے زیر اثر کام کر رہی ہے۔

❁------❁------❁

ڈینگی وائرس: سرچ اور ریسرچ میں مسلسل ناکامی

نجی ٹی وی چینل پر نشر خبر کے مطابق وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کے "فرزند اول" ڈینگی وائرس کا شکار ہونے کے بعد اسپتال پہنچ چکے ہیں۔اس خبر کو دیکھ کر آدھا یقین ہوا کیونکہ آجکل ہمارے ملک میں زیادہ تر کام آدھے یا ادھورے ہی ہو رہے ہیں۔آدھا سچ بول کر الزامات کی توپوں کا منہ کھول دیا جاتا ہے۔جوابی کارروائی میں بھی آدھے سچ سے ہی کام لیا جاتا ہے۔یہاں یہی ریت مخفی جا رہی ہے......الزامات لگاؤ اور اپنی جان چھڑاؤ۔پھر ان الزامات کی تصدیق کا عمل بھی آدھا یا ادھورا ہی رہتا ہے۔کبھی کوئی چیز یا کام اپنے منطقی انجام کو نہیں پہنچتا۔چند دن جوش جذبہ دکھا کر اپنی راہیں اور منزل بدل لینا اب ہماری نفسیات کا حصہ بنتا جا رہا ہے۔ایسے میں گیلانی جونیئر کے ڈینگی وائرس میں مبتلا ہو کر اسپتال داخل ہونے کو کیسے سچ مان لیا جاتا؟ آخر وہ بھی تو سیاسی گدی نشین ہیں۔سیاستدانوں کے رونے،ہنسنے،غصہ میں آنے،بیمار یا شفایاب ہونے کی ٹائمنگ کا اندازہ ایک عام آدمی بھلا کیا لگا سکتا ہے؟ ان میں سے کچھ ایسے بیمار تھے کہ پاکستان واپس نہیں آ سکتے تھے۔مگر شفایابی کی ٹائمنگ نے ان کو سیدھا صدارتی محل تک پہنچا دیا۔کہاں رونا ہے......الطاف حسین سے بہتر کون جانتا ہے؟ کہاں ہنسنا ہے رحمٰن ملک کو دیکھو......! کہاں جوش میں آنا ہے فیصل رضا عابدی، ذوالفقار مرزا،رانا ثناء اللہ اور عابد شیر علی سے سیکھا جا سکتا ہے۔یہ سیاسی اداکار ہیں جنھوں نے سلطان راہی کے دفن ہونے کے بعد اس کا گنڈاسہ ہاتھ میں لے کر بڑھکیں مارنے کا سلسلہ آج تک جاری رکھا ہوا ہے۔ان کی بے مثال اداکاری نے فلمی ستاروں کو تو بے روزگار کر دیا ہے مگر چند ٹی وی اینکروں کے وارے نیارے کر دیئے ہیں۔جہاں تک ننھے سٹار،گیلانی جونیئر کے اسپتال میں داخل ہونے کا تعلق ہے تو اس بات کو تو سچ مانا جا سکتا ہے مگر ان کو ڈینگی

وائرس......یعنی کوئی مچھر کاٹ جائے بھلا یہ کیسے مان لیا جائے......؟یہ تو وہ حضرات ہیں جن کو حفاظت کے اس حصار میں رکھا جاتا ہے جہاں پر گولی تک کی رسائی نہیں ہوتی۔جن کا لباس بلٹ پروف،گاڑی بلٹ پروف اور پتہ نہیں کیا کیا سیکیورٹی پروف......!! تو بھلا ایک مچھر کی کیا مجال کہ گیلانی جونیئر تک پہنچ جائے۔اگر سیکورٹی کی معمولی غفلت سے ایسا ہو بھی جائے تو مچھر ان کے کان میں ایک سرگوشی کر کے ہاتھ باندھ کر ان کے آگے کھڑا ہو جاتا ہے"آقا......!میرے لیے بھی عوام میں کچھ خون چھوڑ دیا کریں"......!!! کتا تو کتے کا بیری سنا ہے مگر یہ خون چوسنے والے تو آپس میں ہم نوالہ اور ہم پیالہ ہیں۔اطاعت کا یہ عالم ہے کہ اپنے آقاؤں پر جان بھی پروانہ وار نچھاور کرتے ہیں۔جہاں تک اسپتال میں جانے کا تعلق ہے اس میں بھی گیلانی جونیئر کا کوئی سیاسی مفاد ہو گا۔کبھی کبھی عوام کے ساتھ یک جہتی کا ڈرامہ بھی تو رچانا ہوتا ہے ناں......!ان حالات میں عوام بیچاری کدھر جائے؟خون چوسنے والوں کی شکایت خون چوسنے والوں کے پاس لگانے سے کیا حاصل؟پھر بھی دل کو تسلی دینے کے لیے اگر ایسا کرنا پڑے تو ان کی فریاد حکومت تک کیسے کی جائے؟ پہلے تو بلدیاتی نظام تھا جس میں کبھی آفت آنے پر فریاد لے کر محلے کے کونسلر کے پاس پہنچ جاتے تھے جس کو مجبوراً ان کے لیے کوئی قدم اٹھانا پڑتا تھا۔اب عوام کو اس سہولت سے محروم کر کے ان کی فریاد کو ایوانوں تک پہنچانے والا راستہ ہی بند کر دیا ہے۔شکر ہے اس میڈیا کا جو عوامی دکھوں کا بین 24 گھنٹے کرتا رہتا ہے مگر اقتدار کے ایوانوں میں بیٹھے اس کو "مسٹر بین" سمجھ کر کچھ دیر مزہ لے کر بھول جاتے ہیں۔ڈینگی وائرس پچھلے سال بھی کئی غریبوں کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔اس سال بھی جشن آزادی پر شرکت کے لیے آیا ہے۔ڈینگی آزادی کا جشن آج تک منا تا جا رہا ہے۔اس کی روک تھام کے لیے کی حفاظتی اقدامات کیے گئے؟اس کے بچاؤ کے لیے کیا ایجاد کیا گیا؟ یہ کیوں پھیلتا ہے اس کے اسباب جاننے کی کوشش کی گئی؟ برطانیہ اور یورپ میں کچھ عرصہ پہلے برڈ فلو اور سوائن فلو کے وائرس پھیلے۔اس پر یہاں کے تمام ریسرچ سنٹر حکومتی تعاون سے حرکت میں آ گئے۔انہوں

نے اس کے اسباب جاننے کی کوشش کی تاکہ اس کی روک تھام کے لیے اقدامات اٹھائے جاسکیں۔اس کے اثرات کوزائل کرنے اور مزید لوگ اس سے متاثر نہ ہوں اس کے لیے Vaccination ایجاد کی گئی۔اس کے بارے میں لوگوں کوشعور دینے کے لیے خصوصی Website اورفری ٹیلیفون لائن کی سہولت بھی متعارف کروائی گئی۔ڈاکٹرز حضرات نے اپنے کلینک پر خصوصی بورڈ نصب کیے عوام کومفت Vaccination لگوانے کی طرف راغب کیا گیا۔ہماری ریسرچ اگر کسی کی کردار کشی کے لیے ہوتو اس سے بہتر دنیا کی کوئی لیبارٹری نہیں مگر تعمیری اور اصلاحی ریسرچ میں ہمارا مقام انتہائی بھیانک ہے۔سرچ ہو یا ریسرچ دونوں میں ہم آج تک کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر سکے۔اتنے سالوں سے سرچ آپریشن جاری ہیں مگر دہشت گرد ایسے ہمارے گلی کوچوں میں دوڑتے ہیں جیسے شریانوں میں خون ......مگر سرچ کرنے والوں کو وہ نظر ہی نہیں آتے۔ریسرچ کے لیے بھی متعدد سنٹرز اور لیبارٹریز ہیں مگر آج تک عوامی سہولت کی کوئی چیز انہوں نے متعارف ہی نہیں کروائی۔1992ء میں مجھے بھی حساس ادارے کے ریسرچ سنٹر جو منسٹری آف ڈیفنس کے جھنڈے تلے چلتی ہے، میں کام کرنے کا موقع ملا۔بڑے جوش اور جذبے سے جوائن کیا مگر اندر کا حال دیکھ کر اس بات کا اندازہ ہوا کہ پاکستانی عوام کے ٹیکس پر صرف سیاستدان ہی نہیں اور بھی بہت سے لوگ موج مستی کر رہے ہیں۔۔آؤ ......جاؤ......تے ٹُرخاؤ ......کی پالیسی پر سارے بڑے ایمانداری سے عمل پیرا تھے۔پاکستان ریلوے اور اسٹیل ملز آف پاکستان کا خسارہ تو عوام کے سامنے آ ہی جاتا ہے کیونکہ یہ ادارے آڈٹ کے عمل سے گزرتے ہیں۔یہ لیبارٹری جس میں میں کام کرتا رہا ہوں اس عمل سے اس لیے مستثنا ہے کہ یہ حساس ادارے کے زیر اثر کام کر رہی ہے۔پاکستان کی تاریخ میں آج تک کبھی حساس اداروں کو اس عمل سے نہیں گزارہ گیا۔یہاں کام تو بہت ہوتا تھا مگر ریسرچ کا نہیں بلکہ ذاتی......! چھوٹا سٹاف بڑوں کو خوش کرنے کے چکر میں ان کی گاڑیوں سے لے کر گھر کے کام بھی کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔چند ریٹائرڈ فوجی تو اس کو اپنی

بریگیڈ ہی سمجھتے تھے۔ریلوے انجن اور گاڑیاں تو چل چل کر آخر ناکارہ ہوئیں ادھر تو بہت سے قیمتی انسٹرومنٹس کبھی استعمال نہ کرنے کی وجہ سے وہاں پڑے پڑے ناکارہ ہو گئے تھے۔انفارمیشن اور ٹیکنالوجی کے دور میں تحقیق ملک کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔مگر جہاں تحقیق گاہوں پر بھی نااہل لوگوں کا قبضہ ہوتو ایسے حالات میں قابل اور حقدار لوگ دوسرے ممالک کا رخ کرتے ہیں۔اگر ایسا نہ ہوتا تو ڈاکٹر قدیر اور ڈاکٹر عبدالسلام کو اپنے ملک میں ہی قابلیت کے جوہر دکھانے کا موقع دیا جاتا۔اب تو صدر پاکستان نے بھی سیاسی جھگڑے چھوڑ کر ڈینگی وائرس پر ریسرچ کرنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ہمارے محققین کے لیے اب یہ چیلنج ہونا چاہیے کہ کم از کم ڈینگی وائرس کی ویکسینیشن ہی متعارف کروادیں۔شاید اب کوئی محقق کوئی بڑا کارنامہ کرنے کی جرات نہ کرے کیونکہ جو صلہ ڈاکٹر قدیر کو ان کی گراں قدر خدمات کا دیا گیا ہے وہ مثال سب کے سامنے ہے۔کاش! ہمارے ملک میں قابل اور حقدار کو اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھانے کا مناسب موقع دیا جائے تاکہ آئندہ کبھی ڈینگی وائرس پر ریسرچ کرنے کے لیے صدر مملکت کو نہ کہنا پڑے۔

دی نیشن لندن 30 ستمبر 2011ء

روزنامہ ''دن'' لاہور......ستمبر 2011ء

قابل غور

☆ ہم اپنے اعمال کا ذمہ دار حکومت کو ٹھہرا کر اس سے بری الذمہ نہیں ہو سکتے کیونکہ ان لوگوں کو ایوانوں تک پہنچا کر اپنا استحصال کروانے میں ہماری آزاد منشاء بھی شامل ہے۔

☆ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے جیسے کسی ماتم کدہ میں موجود متاثرہ لوگوں میں اچانک کوئی معصوم بچہ اپنی معصوم شرارات سے ان سب کو کچھ دیر کے لیے غموں کے سمندر سے نکال کر چہروں پر تبسم بکھیرنے پر مجبور کر دے۔

☆ ایشنر کے دوران اس نے علیم ڈار صاحب کے جس فیصلے کو بھی چیلنج کیا اس کو منہ کی کھانی پڑی اور پھر اتنا سحر زدہ ہوا کہ سیریز میں علیم ڈار کے فیصلے کو چیلنج کرنے سے پہلے اپنے دیگر ساتھیوں سے مشورہ لینا ضروری سمجھنے لگا۔

☆ بیٹسمین کو آؤٹ دینے کے لیے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی کبھی استعمال نہیں کی بلکہ بائیں ہاتھ کی انگلی اٹھاتے ہیں تا کہ کبھی غلطی سے بھی شہادت کی انگلی غلط فیصلے میں استعمال نہ ہو جائے۔

☆ آئی سی سی جسے اب عرف عام میں انڈین کرکٹ کونسل بھی کہا جانے لگا ہے۔اس آئی سی سی سے کسی پاکستانی کا ایوارڈ حاصل کرنا------کتا کے منہ سے ہڈی چھیننے کے مترادف ہے۔

علیم ڈار۔۔۔پاکستان کا حقیقی فخر

اسلامی جمہوریہ پاکستان میں بسنے والے 96.3فیصد مسلمان ہیں جو محمد عربی کے امتی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔قیام پاکستان سے لے کر اب تک اُن کی عوامی ناؤ گندی سیاست کے گرداب میں پھنسی ہوئی ہے۔جو آج جھوٹ، کرپشن، نا انصافی، اور ظلم کے وسیع سمندر میں غرق ہونے سے پہلے آخری ہچکولے کھا رہی ہے۔امت محمدی کی اگر موجودہ صورت حال دیکھیں تو ان کو آج ساری قدرتی آفات کا سامنا ہے جو آج سے پہلے بھی حضرت شعیبؑ، حضرت موسیٰ ؑ، حضرت صالحؑ کی گمراہ قوموں کا نصیب بنیں۔ہم میں بھی آج وہ تمام برائیاں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں جو عبرت کا نشان بننے والی قوموں میں موجود تھیں۔ہم اپنے اعمال کا ذمہ دار حکومت کو ٹھہرا کر اس سے بری الذمہ نہیں ہو سکتے کیونکہ ان لوگوں کو ایوانوں تک پہنچا کر اپنا استحصال کروانے میں ہماری آزاد منشاء بھی شامل ہے۔شاید اسی لیے مصنوعی مسائل کے ساتھ ساتھ سیلاب، ڈینگی مچھر، سونامی، آندھی طوفان، خشک سالی، قحط جیسی قدرتی آفات کا بھی سامنا ہے۔خبر رساں ایجنسیوں کی تعداد جس برق رفتاری سے بڑھ رہی ہے۔تکلیف دہ خبریں بھی اسی سبک رفتاری سے بڑھتی جا رہی ہیں۔جبر سلطانی اور عذاب الٰہی کا شکار عوام کسی اچھی خبر کو ترس جاتے ہیں۔میڈیا الیکٹرانک ہو یا پرنٹ محظوظ کرنے والی خبر نشر کرے تو اس کا منبع پاکستان کی بجائے کوئی اور ملک ہی ہوتا ہے۔شاید ان کو بھی پورے پاکستان میں کوئی اچھی چیز نظر نہیں آتی جس کو وہ اپنی خبروں کی زینت بنا سکیں۔آٹے میں نمک کی مقدار چاہے کتنی کم ہی کیوں نہ ہو مگر اس کا اثر محسوس ضرور کیا جا سکتا ہے۔اسی طرح لاکھ برائیوں اور بری خبروں میں کبھی اگر کوئی اچھی خبر بھی آ جائے تو ایسا ہی محسوس ہوتا ہے جیسے کسی ماتم کدہ میں موجود متاثرہ لوگوں میں اچانک کوئی معصوم بچہ اپنی معصوم شرارات

سے ان سب کو کچھ دیر کے لیے غموں کے سمندر سے نکال کر چہروں پر تبسم بکھیرنے پر مجبور کر دے۔اسی طرح تذبذب، پریشانی اور مایوسی کی خبروں میں خوشی کی ایک خبر نشر کی گئی "پاکستان کے علیم ڈار کو لگاتار تیسری بار آئی سی سی نے بیسٹ امپائر آف دی ایئر کے ایوارڈ سے نواز دیا"۔بلاشبہ یہ پوری قوم کے لیے ایک بڑی خوشی کی خبر تھی جس سے ہر پاکستانی کا سر فخر سے بلند اور پاکستان کا نام روشن ہوا......!اس ایوارڈ کے بعد جب علیم ڈار سے کولمبو رابطہ کیا گیا جہاں پر وہ آسٹریلیا اور سری لنکا کی ٹیموں کے مابین سیریز سپروائز کر رہے تھے۔انہوں نے اس کامیابی کو پوری قوم کی دعاؤں کا نتیجہ قرار دیا۔اس کے ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اس شعبہ میں جب سے قدم رکھا ہے اس کو پوری دیانتداری سے نبھانے کی کوشش کی ہے۔بلاشبہ وہ اپنی محنت، لگن، شعبے میں پیشہ وارانہ مہارت اور ایمانداری سے وہ اس مقام پر ہیں جہاں ہر کوئی نہیں پہنچ سکتا۔اپنے ہنر میں ماہر اور دیانتداری کا مجسم علیم ڈار ایک دہائی سے اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا لوہا منوا رہے ہے۔اس دوران انہوں نے تقریباً ڈیڑھ سو ایک روزہ بین الاقوامی میچز جس میں 2007ء کے ورلڈ کپ کا فائنل اور 2011ء کے ورلڈ کپ کا فائنل بھی شامل ہیں، 70ٹیسٹ میچز جن میں آسٹریلیا اور انگلینڈ کے مابین کھیلے جانے والی مقبول ایشز بھی شامل ہے۔اس کے علاوہ تقریباً21میچز T20بشمول 2007ء کا T20فائنل جس میں انہوں نے امپائرنگ کے فرائض سرانجام دیئے ہیں۔اُن کے فیصلوں کے طلسم کے آگے بڑے بڑے کرکٹ کے ساحری بازی ہار گئے۔خاص طور پر آسٹریلیا کے سابق کپتان رکی پونٹنگ جو گراؤنڈ میں اکثر اپنے آپ کو امپائر کے درجے پر بھی فائز کر لیتے ہیں۔ایشز کے دوران اس نے علیم ڈار صاحب کے جس فیصلے کو بھی چیلنج کیا اس کو منہ کی کھانی پڑی اور پھر اتنا سحر زدہ ہوا کہ سیریز میں علیم ڈار کے فیصلے کو چیلنج کرنے سے پہلے اپنے دیگر ساتھیوں سے مشورہ لینا ضروری سمجھنے لگا۔ان کے فیصلوں کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھ اور دماغ کو جدید ٹیکنالوجی کی سہولیات سے لیس کیا ہوا ہے۔ان کے کئی فیصلوں کو تو کرکٹ کے مبصرین اور ناقدین نے نا صرف سراہا

بلکہ حیران بھی کر دیا کہ کیسے ایک انسانی آنکھ اور دماغ اتنے کم وقت میں اتنا اچھا فیصلہ کر سکتا ہے۔ورلڈ کپ 2011ء میں ان کے فیصلوں کو 15بار چیلنج کیا گیا مگر ہر بار اللہ تعالیٰ نے ان کو سرخرو کیا۔بیٹسمین کو آؤٹ دینے کے لیے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی کبھی استعمال نہیں کی بلکہ بائیں ہاتھ کی انگلی اٹھاتے ہیں تا کہ کبھی غلطی سے بھی شہادت کی انگلی غلط فیصلے میں استعمال نہ ہو جائے۔پاکستان کی ٹیم تو کچھ عرصہ سے تنازعات کا شکار ہے۔شاید اسی وجہ سے حالیہ آئی سی سی ایوارڈز میں صرف عمر گل واحد پاکستانی کھلاڑی ہیں جو ورلڈ الیون میں جگہ بنا سکیں ہیں۔اس کے علاوہ کسی کھلاڑی کے حصے میں کوئی ایوارڈ نہیں آیا۔آئی سی سی جسے اب عرف عام میں انڈین کرکٹ کونسل بھی کہا جانے لگا ہے۔اس آئی سی سی سے کسی پاکستانی کا ایوارڈ حاصل کرنا......کتا کے منہ سے ہڈی چھیننے کے مترادف ہے۔انڈین نواز آئی سی سی نے پاکستانیوں کے ساتھ ناروا سلوک بھی رکھا ہے مگر علیم ڈار نے اپنی انفرادی محنت، ایمانداری اور با کمال کارکردگی سے آئی سی سی کو تیسری بار لگاتار ایوارڈ دینے پر مجبور کر دیا۔کرکٹ میں اگر ٹیکنالوجی پہلے سے متعارف کروائی جاتی تو شاید ان کے ایوارڈز کی تعداد تین سے بھی زیادہ ہوتی۔محمد یوسف پاکستان کے وہ آخری کھلاڑی ہیں جن کو آئی سی سی کی طرف سے 2007ء میں بیسٹ ٹیسٹ پلیئر آف دی ایئر اور وزڈن پلیئر آف دی ایئر کا ایوارڈ ملا۔اس کا صلہ پاکستان کرکٹ بورڈ نے یہ دیا کہ ان کو کرکٹر کے بجائے ممی کی شکل میں حنوط کر کے کرکٹ بورڈ کے میوزیم میں رکھ لیا۔شکر ہے کہ امپائرنگ کے شعبے میں اعجاز بٹ صاحب کا کوئی عمل دخل نہیں ورنہ آج علیم ڈار صاحب بھی محمد یوسف کے ساتھ ممی کی شکل میں کھڑے ہوتے۔کسی بھی کام کی کامیابی کے لیے فن میں مہارت، محنت، لگن، جوش اور جذبہ کے ساتھ ساتھ ایمانداری کا عنصر بھی ہونا لازمی ہے۔اگر دیانتداری کا عنصر منفی کر دیں تو دعائیں بھی اثر نہیں کرتیں۔علیم ڈار صاحب اگر ہنر اور ایمانداری کا امتزاج بن کر ہمارے لیے باعث افتخار ہو سکتے ہیں تو باقی شعبہ جات میں بھی اگر حقدار اور قابل لوگوں کو موقع دیکر ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا جائے تو ہر شعبے میں ہماری کارکردگی مثالی

110

ہو سکتی ہے۔ترقی کی شاہراہ پر کامیابی کی گاڑی چلانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے دل کے کلچ پر دباؤ حسب ضرورت رکھیں، دماغ کے بریک مضبوط ہوں، غصہ کی پیڈ کو کنٹرول میں رکھیں، اپنی طرف کے ٹائر اونچے اور اعلیٰ درجے کے ہوں تا کہ خیالات کی ٹیوب پنکچر نہ ہو، آنکھوں کی ہیڈ لائٹس میں خلوص کی روشنی ہو، اپنی طبیعت کی ڈگی کو وسیع اور مضبوط رکھنا ہو گا، اپنی زبان کے سپیڈو میٹر میں مٹھاس کی سوئی لگانا ہو گی، ان سب چیزوں کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے پاس خوش اخلاقی اور ایمانداری کا لائسنس ہو۔ہمارے ہاں المیہ یہ ہے کہ ملکی نظام ہو یا کوئی ادارہ اس کو چلانے والے اس کے اہل نہیں، اگر وہ اہل اور قابل ہیں تو مخلص نہیں، اگر مخلص ہیں تو اپنے شعبے سے مخلص اور وفادار نہیں......کیونکہ جب بھی فیصلہ لینے کی گھڑی آتی ہے تو وہ اکثر اپنے ذاتی مفادات کو ملحوظ خاطر رکھ کر فیصلہ کرتے ہیں۔علیم ڈار فیصلہ لیتے وقت اپنی تمام تر مہارت کو بروئے کار لا کر صرف ایمانداری کو بنیاد بناتے ہیں اسی وجہ سے خدا ان کو سرخرو بھی کرتا ہے۔ہمارے ملک میں اگر سب اسی فارمولے پر عمل پیرا ہو جائیں تو بہت جلد ہم دنیا میں ایک مثالی قوم بن کر ابھر سکتے ہیں۔اس کے علاوہ مصنوعی اور قدرتی آفات سے بھی محفوظ رہیں گے۔پھر یقیناً میڈیا کو بھی بری خبر تلاش کر کے نشر کرنے میں اتنی ہی محنت کرنا پڑے گی جتنی آج کل اچھی خبر ڈھونڈنے میں کی جاتی ہے۔

روزنامہ ''دن'' لاہور 15 اکتوبر 2011ء

دی نیشن لندن 2011ء

قابل غور

☆ اگر اسٹیو جابز نے اس میں ایسا نظام بھی متعارف کروایا ہوتا جس سے غیر اخلاقی حد کو تجاوز کرنے سے موبائل فون پھٹ جاتا تو رات کے سناٹے میں پتہ نہیں کتنے دھماکوں کی آوازیں سنائی دیتیں۔

☆ حاملہ عورتیں جب چاہیں اپنے بچے کا دیدار نہ صرف سکرین پر کر سکیں گی بلکہ دل دھڑکنے کی آواز سے بھی لطف اندوز ہونگی، سکرین پر خون کا قطرہ رکھنے کی بھی نوبت نہیں آئے گی صرف انگلی سکرین پر رکھ کر شوگر لیول کا پتہ لگایا جائے گا۔

☆ جیسا کہ میں اپنی بیوی سے جھوٹے بولنے کے ایسے طریقوں پر غور کر رہا ہوں جس کو میرا آئی فون 7 پکڑ کر میری زوجہ کو نہ بتا سکے کیونکہ انسانی عقل ابھی اپنی ارتقائی عمل میں ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

☆ آج ایپل کوئی کھائے یا نہ کھائے مگر ہاتھ میں ایپل فون نہ ہو تو دنیا مکمل نہیں ہوتی۔

☆ اسٹیو جابز نے اس میں ایسا نظام بھی متعارف کروایا ہوتا جس سے غیر اخلاقی حد کو تجاوز کرنے سے موبائل فون پھٹ جاتا تو رات کے سناٹے میں پتہ نہیں کتنے دھماکوں کی آوازیں سنائی دیتیں۔

جدید عہد کے ایک جن کی کہانی

ارتقائی عمل جس سبک رفتاری سے منازل طے کررہا ہے۔اس کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاید اب کچھ بھی ناممکن نہیں رہا۔اس برق رفتار مادی دنیا میں ہر شے کی قدرومنزلت بھی بڑے مختصر دورانیے کی ہو کر رہ گئی ہے۔کمپیوٹر کے اس دور میں دنیا میں مقابلے کا رجحان پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ چکا ہے۔لہٰذا آج کے انفارمیشن اینڈ ٹیکنالوجی کے دور میں کسی شخص کو اپنا "نام" بنانے میں بڑی محنت کرنا پڑتی ہے کیونکہ "نام" بنانے کے لیے کوئی ایسا کام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جس سے ساری دنیا کی توجہ کا مرکز بنا جا سکے۔انفارمیشن اینڈ ٹیکنالوجی کے وسیع سمندر میں دنیا کے کئی محققین غوطہ زن ہیں اور اکثر کوئی نہ کوئی گوہر نایاب دنیا میں متعارف کروا کر اپنا "نام" ان لوگوں کی فہرست میں شامل کروا لیتے ہیں جو تحقیق اور مشاہدے کے عمل سے گزر کر کسی ایسی چیز کے موجد بنے جس نے انسانی زندگی کو مزید سہل بنا دیا ہے۔موجودہ دور میں ایسا ہی ایک "نام" اسٹیو جابز کا بھی ہے۔جو چند دن قبل 56 سال کی عمر میں کینسر کے مرض میں مبتلا ہو کر اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے مگر دنیا بھر میں ان کا نام ٹیکنالوجی میں گراں قدر پیشہ وارانہ جوہر دکھانے کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔آج کا آئی فون جس نے ساری دنیا کو سمیٹ کر انسانی ہتھیلی تک محدود کر دیا ہے۔اس کا موجد اسٹیو جابز ہے جنھوں نے اپنے فنی کیریئر کا آغاز ایک ٹیکنیشن کی حیثیت سے کیا مگر اپنی خداداد صلاحیتوں اور محنت کے بل بوتے پر انہوں نے بہت کم عرصے میں آلات کی دنیا کے بڑے بڑے تیس مار خانوں کے دانت کھٹے کر دیئے۔آج ایپل کوئی کھائے یا نہ کھائے مگر ہاتھ میں ایپل فون نہ ہو تو دنیا مکمل نہیں ہوتی۔بیوی یا گرل فرینڈ روٹھ جائے تو شاید ان کو منانے میں اتنی عجلت سے کام نہیں لیا جاتا جتنی جلدی آئی فون خراب ہو جائے تو

اسے قابل استعمال حالت میں لانے کے لیے کی جاتی ہے۔پہلے کبھی فون دور سے پیغام رسانی کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا تھا مگر وقت کے ساتھ اس میں تبدیلیاں آتی گئیں۔پھر موبائل فون نے جیسے قدم جمانا شروع کیے تو Landline فون کے قدم اکھڑنا شروع ہو گئے۔موبائل فون میں ایس ایم ایس، فوٹو کیمرہ، ویڈیو کیمرہ وغیرہ آنے سے اس کی دلکشی اور کشش مزید بڑھ گئی۔موجودہ دور کا انٹرنیٹ وہ "جن" ہے جس نے ہر شخص کو قابو کر رکھا ہے۔جب یہ جن موبائل فون تک رسائی حاصل کر گیا تو اسے کان سے کم اور آنکھ کے آگے زیادہ رکھا جانے لگا۔خاص طور پر نوجوان نسل کے دن کا چین اور رات کی نیندیں حرام ہونا شروع ہو گئیں۔شاید آنکھ اور موبائل کے اس شدید ملاپ کو دیکھ کر اسٹیو جابز نے "آئی فون" لانچ کیا۔نوجوان نسل نے اسے آنکھ ملانے اور لڑانے والا آلہ سمجھ کر بڑوں سے آنکھیں چرا کر اس کا استعمال ایسا کیا جیسے حاتم طائی نے غریبوں میں اپنی دولت کا یعنی......"لُٹنے دا"!! ایک وقت تھا جب بچے مطالعہ کرتے وقت رات کو کتاب ہاتھ میں پکڑے پکڑے نیند کی آغوش میں چلے جاتے تھے۔پھر ماں باپ ان کی کتابوں کو سمیٹتے ہوئے زیر لب مسکراتے اور خیالوں میں اپنے بچے کو کسی بڑے عہدے پر فائز ہوتا دیکھتے ہوئے ان پر لحاف یا رضائی دے کر خود بھی خوابوں کی دنیا میں کھو جاتے مگر آج فیس بک کی قدر اتنی زیادہ ہو گئی ہے کہ کتاب پر چہرہ ٹکتا ہی نہیں۔پہلے ماں باپ سوئے بچوں کو لحاف دیتے تھے اب بچے اس بات کا انتظار کرتے ہیں کہ کب ماں باپ لحاف اوڑھ کر سوتے ہیں۔پھر ان کی فیس بک کی دنیا آباد ہوتی ہے جہاں ان کی فیس بک میں سینکڑوں کی تعداد میں اپنی طرح کے دوست لسٹ میں ہوتے ہیں جو سب ایک دوسرے کو بے وقوف بنانے کے کھیل میں مصروف ہوتے ہیں۔یہ علیحدہ بات ہے گھر میں چاہے کسی سے صلح ہو نہ ہو، کسی بیمار کا حال پوچھا نہ ہو مگر فیس بک پر دوستی کے بلند و بالا دعوے کیے جا رہے ہوتے ہیں۔اسٹیو جابز نے تو ایپل آئی فون تعمیری کاموں میں معاونت اور سہولت کے لیے متعارف کروایا تھا مگر نئی نسل کی ایک خاص تعداد اس سے ایسے کام لے رہی ہے کہ اگر اسٹیو جابز نے اس میں ایسا نظام بھی متعارف کروایا ہوتا

جس سے غیر اخلاقی حد کو تجاوز کرنے سے موبائل فون پھٹ جاتا تو رات کے سناٹے میں پتہ نہیں کتنے دھماکوں کی آوازیں سنائی دیتیں۔آئی فون 4 تک تو اس آلے میں اتنا کچھ ڈال دیا گیا ہے کہ اب گھر سے ٹیلیفون، ٹی وی، ریڈیو، ٹیپ ریکارڈر، کمپیوٹر وغیرہ کی اہمیت میں واضح کمی آ گئی ہے۔اب آئی فون کے آنے والے ماڈلز میں اسٹیو جابز کی خواہش کے مطابق کچھ ایسی چیزیں متعارف کروائیں جائیں گی جس سے مختلف لوگ پیشہ وارانہ زندگی میں بھی اس کا مثبت استعمال کر سکیں گے۔مثلاً لمبائی، چوڑائی، اونچائی، ناپنے کے لیے اس میں لیزر ٹیکنالوجی بھی ہو گی۔اس کی بیٹری کو چارج کرنے کے لیے بجلی کی ضرورت نہیں ہو گی بلکہ ہاتھوں کی حرارت سے یہ خود بخود چارج ہوتا رہے گا۔یوں لوڈشیڈنگ میں اس بات کا کوئی فکر نہیں ہو گا کہ موبائل چارج نہیں کیا۔اپنی کار یا موٹر سائیکل کے سنٹرل لاک سسٹم کو بھی آئی فون کے ساتھ منسلک کیا جا سکے گا۔جیسے ہی کوئی غیر متعلقہ شخص گاڑی یا موٹر سائیکل چوری کرنے کی کوشش کرنے کی نیت سے اس سے کوئی زبردستی کرے گا تو آئی فون کا سیکیورٹی الارم مالک کو مطلع کر دے گا۔اسی طرح دکانوں، گھروں، فیکٹریوں اور دفاتر کے دروازوں کا لاک سسٹم بھی آئی فون سے منسلک کر کے حفاظتی نظام میں اضافہ کیا جا سکے گا۔مزید سیکیورٹی کے لیے گھروں، دفاتر، دکانوں اور فیکٹریوں وغیرہ میں ''سی سی ٹی وی'' کیمرے لگا کر ان کو آئی فون کے ساتھ منسلک کیا جا سکے گا۔یوں چلتے پھرتے ہر جگہ کی نگرانی ہو سکے گی۔اس سے ہر قسم کی کرپشن کو مانیٹر کیا جا سکے گا۔میاں بیوی ایک دوسرے کو دھوکہ نہیں دے سکیں گے۔شروع میں ہو سکتا ہے طلاقوں کی شرح بہت بڑھ جائے مگر کچھ دیر بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔

فون کرتے وقت تصویر کے ساتھ بات کرنے والے اور اس کے ارد گرد ماحول کی ''بو'' بھی محسوس کی جا سکے گی۔اس سے کم سے کم لوگ فون کو گندی جگہ پر استعمال کرنے سے اجتناب کریں گے۔صنف نازک خاص طور پر میک اپ اور پرفیوم کا استعمال کر کے فون پر بات کریں گی۔ایسے میں صفائی ستھرائی کا خیال اور رجحان بڑھنے سے ماحول میں ایک زبردست صحت مند آنہ تبدیلی آئے گی۔اسٹیو جابز دنیا کے ہاتھ میں ایسا ایپل دے

گیا ہے کہ جسے دیکھ کر یہ محاورہ "An apple a day keeps doctor away" بدلتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔کیونکہ جس تیز رفتاری سے اس ایپل میں اتنا کچھ سما گیا وہ وقت دور نہیں جب اس آلے کو طبی مقاصد کے لیے بھی استعمال کیا جانے لگے گا۔کرۂ ارض کا درجہ حرارت تو یہ بتا ہی رہا ہے ایسے ہی انسانی جسم کا درجہ حرارت بھی بتائے گا۔فوٹو تو بنا ہی رہا ہے ایسے ہی انسانی جسم کے ایکسرے بھی بنائے گا۔منی پرنٹر بھی ساتھ ہو گا جس سے ای سی جی کی رپورٹ بھی نکلے گی۔سکیننگ اور الٹرا ساؤنڈ کے لیے بھی سہولت موجود ہو گی۔حاملہ عورتیں جب چاہیں اپنے بچے کا دیدار نہ صرف سکرین پر کر سکیں گی بلکہ دل دھڑکنے کی آواز سے بھی لطف اندوز ہوں گی۔سکرین پر خون کا قطرہ رکھنے کی بھی نوبت نہیں آئے گی صرف انگلی سکرین پر رکھ کر شوگر لیول کا پتہ لگایا جائے گا۔اسی آلے کو بازو پر باندھ کر بلڈ پریشر بھی چیک کیا جائے گا۔نبض کی رفتار بھی ناپی جا سکے گی۔فنگر پرنٹ جانچنے کے لیے بھی اس میں باقاعدہ انتظام ہو گا۔بینائی ٹیسٹ کرنے میں بھی معاونت کرے گا۔غرضیکہ ایسے کئی ٹیسٹ چلتے پھرتے کہیں بھی اس آلے سے ممکن ہو سکیں گے۔سب سے بڑھ کر فوری رپورٹ بھی میسر ہو گی۔اس کے ساتھ بیماری کی علامات اور تمام ٹیسٹ رپورٹس کی بنیاد پر یہ آلہ دوائیں بھی تشخیص کرے گا۔اس وقت یہ محاورہ کچھ ایسا ہو گا "An apple phone in hand, keeps doctor away" اگر اسٹیو جابز کی زندگی کچھ دیر اور وفا کر جاتی تو شاید یہ سب آئی فون 6 میں آ جاتا۔پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ!!! ہو سکتا ہے وقت کچھ اب زیادہ لگ جائے اور ''آئی فون 7'' میں یہ ساری سہولیات میسر ہوں۔آئی فون 7 ہاتھ میں لے کر گھومنے کا مطلب ہو گا کہ ڈاکٹر حضرات تو بس آپریشن تک محدود رہ جائیں گے۔یہ سب باتیں اپنی جگہ درست ہیں مگر پھر میں سوچتا ہوں کہ اس آئی فون 7 کو بنانے والا بھی انسانی ذہن ہے اور اس کائنات میں اگر انسان نے آنے والے دنوں میں انسانی ذہن بنا بھی لیا تو بھی حقیقی انسانی ذہن ہی سپر ہو گا کہ آخر کار نئے ذہن کا خالق تو وہی ہے۔سو آئی فون کی تمام افادیت اور اسے کے زریعے استعمال ہونے والے تمام حربے اپنی جگہ لیکن اس

سے اوپر اگر اب بھی کچھ ہے تو وہ انسانی عقل ہے جو اس کو مات دینے کے نت نئے طریقے سوچ رہی ہوگی۔جیسا کہ میں اپنی بیوی سے جھوٹے بولنے کے ایسے طریقوں پر غور کر رہا ہوں جس کو میرا آئی فون 7 پکڑ کر میری زوجہ کو نہ بتا سکے کیونکہ انسانی عقل ابھی اپنی ارتقائی عمل میں ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

روزنامہ "دن" لاہور 20 اکتوبر 2011ء

دی نیشن لندن 21 اکتوبر 2011ء

قابل غور

☆ 70ء کی دہائی اس لیے ہمیشہ اہم رہے گی کہ اس میں مسلم دنیا نے ایک بلاک بننے کی پہلی کوشش کی اور 80ء کی دہائی شروع ہونے سے پہلے اسلامی سربراہی کانفرنس میں شرکت کرنے والے سربراہان کا ذلت آمیز سفر شروع ہوگیا کہیں حکومت اور کہیں حکمران بدلے جا چکے تھے۔

☆ اہم بات تو یہ ہے کیا جبر اور سازش کے ذریعے کسی فلسفے یا فکر کو ختم کیا جا سکتا ہے؟ کیا امریکہ اور اُس کے خواری خود ایک اتحاد کی شکل میں دنیا بھر کے مظلوم انسانوں کا استحصال نہیں کر رہے؟ کیا یہ کسی مذہب کی زبان ہے یا طاقت کی؟

☆ قتل کے جس مقدمہ میں انہیں مشورے کا ملزم نامزد کیا گیا تھا۔ اس مقدمہ کی اہم بات یہ بھی ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف پیدا کیے گئے وعدہ معاف گواہان کو بھی سزائے موت دے دی گئی جو کسی بھی عدالت کی انتہائی پست ذہنیت ظاہر کرتی ہے۔

☆ 6 اکتوبر 1981ء کو سالانہ پریڈ کے موقع پر سلامی کے چبوترے پر گولیوں کی سلامی لینا پڑی۔ انہیں اُن کی اپنی سپاہ نے ایک فتوے کی وجہ سے قتل کیا۔ اس طرح یہ کردار بھی 11 سال حکمرانی کے بعد تاریخ کا حصہ بن گیا۔

اتفاق یا سازش؟

1974ء میں لاہور میں ہونے والی اسلامی سربراہی کانفرنس کے تمام اہم کرداروں کو دردناک انجام سے دو چار ہونا پڑا۔ اسلامی بلاک بنانے کی سوچ رکھنے والے آخری کردار کو بھی تاریخ کا حصہ بنا دیا گیا۔ 1974ء میں لاہور میں ہونے والی اسلامی سربراہی کانفرنس کے سرگرم رکن کرنل معمر قذافی کا انجام بھی ایسا کروایا گیا کہ آئندہ کوئی اسلامی اتحاد کے بارے میں سوچنے سے قبل تاریخ میں موجود ان ناموں کو ضرور ذہن میں لائے گا جو 38 اسلامی ممالک کو یکجا کرنے کا خواب دیکھنے کے جرم میں باری باری صفحۂ ہستی سے بڑے شاطرانہ انداز سے مٹائے گئے مگر اہم بات تو یہ ہے کیا جبر اور سازش کے ذریعے کسی فلسفے یا فکر کو ختم کیا جا سکتا ہے؟ کیا امریکہ اور اُس کے خواری خود ایک اتحاد کی شکل میں دنیا بھر کے مظلوم انسانوں کا استحصال نہیں کر رہے؟ کیا یہ کسی مذہب کی زبان ہے یا طاقت کی؟ اسلامی ممالک میں سعودی عرب کو ایک خاص مقام حاصل ہے اور اُس کی مقدس اور متبرک سرزمین کے حکمرانوں کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ دوسری اسلامی سربراہی کانفرنس کے لاہور میں کامیاب انعقاد کے بعد امریکہ اور مغربی دنیا میں خطرے کی گھنٹی بجنا شروع ہو گئی۔ انہوں نے اس سوچ کو ختم کرنے کے لیے اس کا آغاز ہی اس پاک دھرتی کے سربراہ سے کیا اور شاہ فیصل کا انتخاب درحقیقت فانسر کا خاتمہ تھا جو اس تمام تحریک کو سپورٹ کر رہا تھا۔ 25 مارچ 1975ء کو شاہ فیصل جو اس وقت گیارہ سال سے سعودی عرب کے حکمران تھے 69 سال کی عمر میں اپنے ہی بھتیجے کے ہاتھوں قتل کروائے گئے۔ اس کے بعد 15 اگست 1975ء کو بنگلہ دیش کے حکمران مجیب الرحمٰن بھی اپنی آرمی کے جے سی اوز کے ہاتھوں اپنے

صدارتی محل ڈھاکہ میں ہی سی آئی اے کی غیر محسوس سازش کا حصہ بن گئے۔اس وقت ان کی عمر 55برس تھی۔شیخ مجیب الرحمان تحریک پاکستان کے نامور کارکن اور قائداعظم محمد علی جناح کے اہم ترین ساتھیوں میں سے تھے اسی لیے انہیں ایم ایس ایف بنگال کا صدر بنایا گیا۔وہ جدوجہد اور انقلاب کی مکمل سائنس سے باخبر تھے اور پھر اسلامی سربراہی کانفرنس میں شرکت سے پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان موجود تناؤ میں بھی کمی آئی تھی جو کم از کم اُن طاقتوں کو تو کسی صورت قابل قبول نہیں تھا جنہوں نے انہیں علیحدہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔شیخ مجیب کے بعد شاہ ایران کے باری آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایران کے پرامن سرزمین انقلاب کے نعروں سے گونجنا شروع ہوگئی۔ امام خمینی نے ایران کی سرزمین پر قدم رکھا تو اُس سے پہلے شاہ ایران اپنی ڈھائی ہزار سال پرانی سلطنت کو بے یارومددگار چھوڑ کر فرار ہو چکے تھے۔رضا شاہ پہلوی کو شاہ سے گداگر بنا کر اُس کے لیے دنیا تنگ کر دی گئی۔شاہ ایران رضا شاہ پہلوی 27 جولائی 1980ءکو مصر کے شہر قاہرہ میں وفات پا گئے جہاں ان کو پورے اعزاز کے ساتھ دفن کیا گیا۔رضا شاہ پہلوی کا دور کرنل قذافی کے بعد سب سے طویل تھا۔اپنی 60سالہ زندگی میں سے انہوں نے 37سال 138دن حکومت کی۔رضا شاہ پہلوی بھی شاہ فیصل کی طرح امریکہ کے اچھے دوستوں میں سمجھے جاتے تھے مگر زندگی کے آخری ایام میں امریکہ میں ان کو علاج کی سہولیات بھی میسر نہ آسکیں اور امریکہ کا یہ خیر خواہ دوگز زمین کو ترستا ہوا دنیا سے رخصت ہوگیا۔ان کے بعد اسلامی سربراہی کانفرس کے چیئرمین اور بڑے ذہن جناب ذوالفقار علی بھٹو کی باری آگئی۔5 جولائی 1977ءکو پہلے اُن کے خلاف اُن کے اپنے پسندیدہ جرنل ضیاءالحق نے فوجی بغاوت کرکے انہیں گرفتار کیا اور بعد ازاں، 4اپریل 1979ءکو صرف 51برس کی عمر میں اُن کو افغانستان میں روس کو بلوا کر ٹکڑے کرنے سے انکار کرنے کے جرم میں ایک ایسے قتل میں تختہ دار پر لٹکا دیا گیا جس میں اُن کو مشورے کا ملزم نامزد کیا گیا تھا۔اس مقدمہ کی اہم بات یہ بھی ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف پیدا کیے گئے وعدہ معاف گواہاں کو بھی سزائے موت دے دی گئی جو

کسی بھی عدالت کی انتہائی پست ذہنیت ظاہر کرتی ہے۔"مردمومن ضیاع الحق" نے امریکہ اور اس کے حواریوں کو خوش کرنے کے لیے سفاکی اور جبر کی انتہاء کر دی۔ پاکستان کو اٹیمی قوت بنانے کی بنیاد رکھنے میں اہم کردار ادا کرنے والے کا جسد خاکی اس کے ورثاء کے حوالے بھی نہ کیا گیا۔کروڑوں پرستاروں کے قائد کو کسی اپنے کا کندھا نصیب نہ ہوا۔70ءکی دہائی اس لیے ہمیشہ اہم رہے گی کہ اس میں مسلم دنیا نے ایک بلاک بننے کی پہلی کوشش کی اور 80ءکی دہائی شروع ہونے سے پہلے اسلامی سربراہی کانفرنس میں شرکت کرنے والے سربراہان کا ذلت آمیز سفر شروع ہوگیا کہیں حکومت اور کہیں حکمران بدلے جا چکے تھے۔ذوالفقار علی بھٹو کے بعد باری مصر کے صدر انور سادات کی آئی۔اُن کو اسلامی سربراہی کانفرنس کے اہم اور سرگرم رکن ہونے، شاہ ایران رضا شاہ پہلوی کو پناہ دینے اور ان کے مرنے پر پورے قومی اعزاز سے دفن کرنے کے جرم میں اپنی ہی فوج کے ہاتھوں 62سال کی عمر میں 6اکتوبر 1981ءکو سالانہ پریڈ کے موقع پر سلامی کے چبوترے پر گولیوں کی سلامی لینا پڑی۔انہیں اُن کی اپنی سپاہ نے ایک فتوے کی وجہ سے قتل کیا۔اس طرح یہ کردار بھی 11 سال حکمرانی کے بعد تاریخ کا حصہ بن گیا۔

اسلامی بلاک بنانے کی سوچ رکھنے والے ایک اور اہم شخصیت فلسطین کے یاسر عرفات بھی 11نومبر 2004ءکو 75سال کی عمر میں اپنے خالق حقیقی جا ملے۔اس کی موت کے بارے میں شبہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ ان کو دوا کے ساتھ مہلک دوا thalium دے کر ہلاک کیا گیا۔یاسر عرفات کو قتل کرنے کی بھی کوششیں ہوئیں مگر وہ ناکام رہیں۔اسی وجہ سے 1988ءکو ایک انٹرویو میں یاسر عرفات نے یہ انکشاف کیا کہ وہ دو راتیں لگاتار ایک کمرے میں نہیں سوتے۔اُن کی زندگی کو شاید اس لیے طوالت مل گئی کہ اس نے مزاحمت کی پالیسی کو چھوڑ کر مفاہمت کی پالیسی اپنالی۔ان کی وفات کے بعد لیبیا کے کرنل معمر قذافی اسلامی سربراہی کانفرنس کے اہم رکن تھے جو اس دنیا میں اب تک سانسیں لے رہے تھے۔بکرے کی ماں آخر کب تک خیر منائے گی-----ایک دن

تو چھری کے نیچے آئے گی......!!!اس بکرے پر بھی چھری چلانے والے ہاتھ اپنوں کے اور چھری پرائی تھی۔20 اکتوبر 2011ء کو اپنی بے شمار خوبیوں اور خامیوں کی وجہ سے عالمی شہرت کے حامل کرنل معمر قذافی کو بھی قتل کر دیا گیا۔اس بار بھی قتل کرنے والے اپنے اور ان کے ہاتھوں میں اسلحہ دینے والے ہمیشہ کی طرح کوئی اور تھے۔کرنل معمر قذافی کا دور اسلامی سربراہی کانفرنس کے سرگرم ارکان میں سب سے زیادہ تھا۔وہ 69 سالہ زندگی میں سے 42 سال تا دم مرگ حکمران رہے۔ان کے قتل پر دنیا میں ملا جلا رد عمل آ رہا ہے۔کوئی ایک ڈکٹیٹر کا خوفناک انجام کہہ رہا ہے،کوئی اس کو شہید کے درجے پر فائز دیکھ رہا ہے۔مگر یہ سچ ہے کہ امریکہ اور اس کے حواری اس پر بڑے پر مسرت ہیں۔کیونکہ آج انہوں نے ماضی کی طرح ایک کلمہ گو مسلمان کو اپنے کلمہ گو بھائیوں سے ہی نہیں مروایا بلکہ اسلامی بلاک بنانے کی سوچ رکھنے والے اس آخری کردار کو بھی ختم کر دیا۔باہمی اتحاد کی اس سوچ کی تقلید کرتے ہوئے آج یورپی ممالک نے آپس میں وہی پالیسیاں اپنا کر اتحاد کی ایک مثال قائم کی ہے۔ان کے اس اتحاد اور اسلامی ممالک کے نفاق کا یہ نتیجہ ہے کہ آج کوئی بھی اسلامی ملک کسی بھی خارجی قوت کا آسانی سے ہدف بن جاتا ہے۔حالانکہ پچاس سے زائد اسلامی ممالک میں ہر طرح کے قدرتی وسائل، معدنیات، زرعی دولت اور کچھ ایٹمی طاقت بھی ہیں۔سب کچھ ہونے کے باوجود ہم میں یک جہتی کی کمی ہے۔قذافی کو کیا اسی لیے ہلاک کیا گیا کہ وہ ایک ڈکٹیٹر تھا......؟؟امریکہ اور اس کے حواری دنیا میں جمہوریت پھیلانے کے امن مشن پر نکلے ہیں۔اس کام کے لیے چاہے ان کو خود وہ حربے استعمال کرنے پڑیں جو "آمرانہ" ہیں اس پر نہ ان کو کوئی ندامت ہوتی ہے اور نہ ان کے اس رویے کو کوئی غلط کہنے کی جرات کرتا ہے۔سب سے بڑی حقیقت یہ ہے امریکہ اپنی تیزی سے تباہ ہوتی ہوئی معیشت کو بچانے کے لیے دنیا کے ان قدرتی وسائل پر قبضہ کر کے اپنی "چوہدراہٹ" کو طول دینے کے چکر میں ہے۔90ء کی دہائی میں امریکی معیشت کا حال اتنا برا ہو گیا تھا کہ ان کو 1929ء والی "وال کریش" یاد آنا شروع ہو گئی تھی۔اپنے آپ کو اس تباہی

سے نکالنے کے لیے انہوں نے کویت عراق والا ڈرامہ رچایا۔پھر تھانیدار بن کر اپنے فوجیوں کو مڈل ایسٹ اتار دیا۔یوں ادھر سے ہی "کھانا اور گھورنا" ......!اپنی فوج کی تنخواہوں کا مسئلہ تو حل کر لیا مگر اس سے وقتی بھوک اور پیاس تو ختم ہو گئی مگر "دائمی ہوس" کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی ایسا بندوبست کیا جائے کہ قدرتی وسائل سے مالا مال ان ممالک پر ایسا قبضہ کیا جائے کہ دوبارہ 1929ء والی "منگل" ان کو نہ دیکھنی پڑے۔کویت عراق کے حملے سے لیبیا تک کے امریکی ڈرامے کے سکرپٹ میں یکسانیت نظر آتی ہے۔پہلے ایک ڈکٹیٹر کو سپورٹ کی جائے پھر اس سے اپنی مرضی کے مطابق کوئی ایسا کام کروایا جائے جس سے اس کی عوام اس کے خلاف ہو جائے پھر اس جمہوریت کے نام پر ایسا فساد کروایا جائے کہ شہر تباہ و برباد ہو جائیں اور انسانی خون کی ہولی کھیلی جائے۔اس کے بعد اس نام نہاد انقلاب میں جنونیوں کی اسلحہ اور نیٹو فورسز کے ذریعے تختہ الٹنے میں مدد کی جائے۔ڈرامے کے آخر میں اپنے آپ کو انسانی حقوق کا علمبردار ظاہر کیا جاتا ہے اور ان تباہ شدہ کھنڈر نما شہروں کی تعمیر نو کا ٹھیکہ بھی خود کو دے کر وہاں اپنے ڈیرے پکے کر لیے جاتے ہیں۔وہاں پر رہنے کا ایک اور بہانہ جمہوری عمل میں کسی جارحیت کو روکنا بھی ظاہر کیا جاتا ہے۔اگر جمہوریت کی بین بجا کر ہی دنیا کے ڈکٹیٹر ناگوں کو کچلنا یا پٹاری میں بند کرنا مقصد ہو تو پھر ان ناگوں کو پہلے دودھ پلا کر پالا ہی کیوں جاتا ہے؟تاریخ گواہ ہے کہ امریکہ اور اس کے حواری اپنے مفادات تک رسائی کے لیے جمہوری حکمرانوں کی نسبت آمروں کے قریب رہے ہیں۔صرف پاکستان کی تاریخ دیکھی جائے تو اس بات کا واضح ثبوت آمروں کے دور میں امریکی امداد ہے۔ضیاء الحق کو کس نے استعمال کیا اور کس کے خلاف کیا......ایک جمہوری حاکم کو آمر ناگ نے ڈسا،اس وقت کسی نے اس جمہوریت پسند حاکم کو تریاق تو نہ پلایا۔پرویز مشرف بھی ایک آمر ناگ تھا جس کے ڈنگ کا اثر شاید اتنا شدید نہ تھا کہ جمہوریت پسند حکمران نواز شریف اس دنیا سے ہی رخصت ہو جاتا۔جان تو بچ گئی مگر کرسی پر آمر ناگ نے ایسا قبضہ کیا جیسے کسی خزانے پر پھن پھیلا کر بیٹھ جاتا ہے۔اس ڈکٹیٹر کو بھی امریکہ اور اس کے حواریوں کا

مکمل آشری باد حاصل تھا۔ضیاء الحق کی طرح اس سے بھی اپنے مفادات تک آسانی سے رسائی کو یقینی بنانے کے لیے بھرپور استعمال کیا گیا۔بلکہ ان کی توقعات سے بڑھ کر ان کے مطالبات مانے گئے۔امریکہ اور اس کے حواریوں کا یہ دوہرا معیار اور کھلا تضاد ہمارے اسلامی ممالک کے سربراہان کو نظر کیوں نہیں آتا؟ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ جمہوریت کی بقاء اور بحالی کی جنگ نہیں بلکہ اپنے مفادات کی جنگ ہے۔کوئی بھی طاقتور اس بات سے خائف ہوتا ہے کہ اس کی طاقت ختم ہوگئی تو ان لوگوں میں کیسے زندگی گزار پائے گا جن پر اس نے ظلم وستم کیا۔جہاں تک جمہوریت اور آمریت کا تعلق ہے تو آمریت کے لیے ضروری نہیں کہ آمر نے فوجی یونیفارم ہی زیب تن کیا ہو۔یہ تو اس رویے کا نام ہے جس میں کسی فرد واحد کے پاس اتنی طاقت ہو کہ اس کے جائز یا ناجائز فیصلوں کے آگے کوئی سر اٹھانے کی جرات نہ کرسکتا ہو۔ایسی ہی آمریت تو دنیا میں کتنے ممالک میں بھی ہے۔عالمی طور پر دیکھا جائے تو اپنے رویے کی وجہ سے دنیا کا سب سے بڑا آمر تو امریکہ خود ہے۔جو اپنے آپ کو UNO کے تمام قوانین اور اصولوں سے بالاتر سمجھتا ہے۔بلکہ اپنے آپ کو UNO ہی سمجھتا ہے۔پہلے تو اس کو اپنے اس رویے میں تبدیلی لانا ہوگی۔ورنہ جو آگ دنیا میں انہوں نے لگا رکھی ہے اس کے اثرات اب امریکہ میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔یہاں کی عوام بھی یہ نہیں چاہتی کہ ان کی حکومتی پالیسی ایسی ہو کہ ملک کے فلاحی کاموں اور عوام پر خرچ کرنے کی بجائے دنیا میں خون کا بازار گرم کرنے میں پیسہ خرچ کیا جائے۔یہی سوچ مغرب کے دیگر ممالک کے عوام کی بھی ہے۔اگر امریکی ڈنڈے سے جمہوریت بحال یا رائج کرنے کا سلسلہ نہ تھما تو وہ وقت دور نہیں کہ عرب ممالک میں بھی یہ ڈنڈا برسنا شروع ہوجائے گا۔سعودی عرب میں بھی تو شخصی اور موروثی آمریت ہے جہاں پر انسان اپنے بنیادی حقوق کے لیے آج تک ترس رہا ہے۔جہاں عورت کو گاڑی چلانے کی بھی آزادی نہیں۔بڑا احسان کرکے عورت کو ووٹ دینے کا حق دیا گیا ہے۔یمن اور بحرین میں بھی عوام جمہوریت کی خاطر اپنی جانوں کے نذرانے دے رہے ہیں۔شام کے حکمران بھی آمر ناگ بن کر اپنی عوام

پر پھنکار رہے ہیں۔برما میں بھی فوجی آمر ناگ راجہ بن کر کب سے عوامی امنگوں کا استحصال کرکے راج کر رہے ہیں۔اب ان ممالک کے سربراہان کو چاہیے کہ اس سے قبل کہ ان کا انجام بھی کرنل قذافی یا صدام حسین جیسا ہو خود ہی ہوش کے ناخن لیں۔امریکی فوج اور اس کے حواری جہاں بھی تیل ہو وہاں پھسل جاتے ہیں۔پھر اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے۔افغانستان میں شرمناک شکست کے بعد چلو بھر پانی میں ڈوب مرنے کی بجائے اب وہ تیل میں ڈوب کر مرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔کیونکہ ان کی اب گزر و اوقات ان بھوکے بحری قزاقوں کی طرح ہے جن کا پیشہ ہی لوٹ مار بن چکا ہے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ امریکی اپنے حواریوں کا ٹولہ لے کر لیبیا سے کب نکلتا ہے؟ اگر نکلنا ہی ہوتا تو اتنی لمبی پلاننگ کرکے ادھر آتے ہی کیوں؟ لیبیا کے تیل پر تصرف حاصل کرنا ہی ان کا ٹارگٹ تھا جس کے لیے اس نے وہاں کی عوام کو استعمال کیا۔یورپ کے امیر ممالک کی طرح لیبیا بھی ویلفیر اسٹیٹ تھی۔اب آنے والا وقت بتائے گا کہ وہاں کی عوام کا معیار زندگی متاثر ہوتا ہے یا نہیں.....! قذافی کا معاملہ اس کا اس کی عوام کا تھا لہٰذا اس کے نتائج کے بھی وہ سب سے زیادہ ذمہ دار ہوں گے۔جہاں تک پاکستان اور لیبیا کے باہمی تعلقات کا تعلق ہے تو اس بات کو ساری قوم جانتی ہے کہ دوسری اسلامی سربراہی کانفرنس میں قذافی نے اپنے خطاب میں "پاکستان کو اسلام کا قلعہ" قرار دیا تھا۔پاکستان کو ایٹمی طاقت بنانے میں کرنل معمر قذافی کی خدمات سے بھی انکار ممکن نہیں۔جس نے اس مشن کو لانچ کرنے میں ابتدائی رقم 100ملین ڈالر دی تھی۔قذافی سٹیڈیم لاہور ان کے اس تعاون کے شکریے میں ان کے نام منسوب کیا گیا۔لیبیا اور پاکستان کے تعلقات میں اتار چڑھاؤ آتا رہا۔ضیاء الحق کے دور میں ان میں خلیج پیدا ہوگئی تھی مگر بینظیر نے اپنے باپ کے پرانے رفیق سے تعلقات دوبارہ استوار کیے۔ایک وقت تھا جب لاہور کو وہ مقام حاصل تھا جو آج یورپی یونین کے ہیڈ آفس برسلز کو ہے۔اسلامی سربراہی کانفرنس کی کامیاب انعقاد کے بعد اس کی یاد میں لاہور میں ایک مینار بھی بنایا گیا۔ڈاک ٹکٹ جاری کیے گئے جن پر بھٹو کی فوٹو اور ساتھ 38 ممالک کے

جھنڈے بنے تھے۔ایک روپے کے سکے بھی جاری کیے گئے جن پر اس مینار کی تصویر اور دوسری طرف اسلامی سربراہی کانفرنس 1974ء لکھا تھا۔یہ سب مغربی ممالک اور امریکہ کو ہضم نہ ہوا۔اس میں شامل ہونے والے سارے کردار ایک ایک کر کے ختم کر دیئے گئے۔اس وقت پاکستان کی خاتون اول بیگم نصرت بھٹو تھیں۔ 23 اکتوبر 2011ء کو ان کا نام بھی ان لوگوں کی لسٹ میں شامل ہو گیا جو اس کانفرنس میں شریک ہوئے مگر اس دنیا میں نہیں رہے۔قذافی ''آمر'' تھا مگر ان جمہوری لیڈروں سے بہتر تھا جنہوں نے پاکستان کی سالمیت کو نقصان پہنچایا۔آم کے اس شجر سے جس پر پھل نہ لگتا ہو بیری کا وہ پھلدار درخت بہتر ہوتا ہے جس کا پھل کھا کر کسی غریب کا پیٹ تو بھر جاتا ہے۔تاریخ اس چیز کی گواہ ہے کہ ہر عروج کو زوال ہے۔سلطنت عثمانیہ ہو یا سلطنت روم آخر کار زوال پزیر ہو گئیں۔حکمران چاہے کوئی بھی ہو اور کسی بھی سلطنت کا ہو آخر تخت سے محروم ہونا پڑتا ہے۔اس لیے حکمرانی کی طاقت کے نشے میں اپنی موت یا زوال نہیں بھولنا چاہیے۔یہ عوام جو کندھوں پر بٹھا کر تخت پر بٹھاتا جانتی ہے تو یہی ایسا حال کر دیتی ہے کہ جنازے کو کندھا دینے والا کوئی نہیں ملتا۔ہمارے حکمران طبقے کو اب اس بات کی سمجھ آجانی چاہیے کہ عوام کا ضمیر جس دن جاگ گیا تو ان کو پاتال سے بھی نکال کر اپنا حساب چکتا کر لیں گے۔اس لیے اپنی عوام اور ملکی مفادات کو ذاتی مفادات پر ترجیح دینا بند کر دیں۔برے وقت میں آج تک کبھی امریکہ مدد کو نہیں پہنچا......بھلا وہ پہنچے گا بھی کیسے کیونکہ وقت لانے کا آدھا ذمہ دار تو وہ خود ہی ہوتا ہے۔ماضی میں بھی اس نے اپنے کئی چہیتوں کو اپنا کام لینے کے بعد مار دیا یا مروا دیا۔ایسا ہو رہا اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔ کیونکہ اس کے نزدیک دوستی کی بنیاد ہی مفادات ہے اور وہ بھی یک طرفہ......!!اب دیکھنا یہ ہے کہ مسلم امہ کی آنکھیں کھلتی ہیں یا نہیں۔اپنے آپ کو یکجا کر پاتے ہیں یا نہیں حالانکہ اسلام ہی امن، بھائی چارے، مساوات اور اتحاد کا درس دیتا ہے بدقسمتی سے آج کوئی بھی مسلم ممالک ایسا نہیں جس میں اسلامی تعلیمات کا عکس جھلکتا ہو۔چند جنونی اور مفاد پرست لوگوں نے ایک نئے اسلام کی شکل متعارف کروا دی ہے جس کی وجہ سے ہم

119

نفاق کا شکار ہو رہے ہیں۔اگر اب بھی ان کو عقل نہ آئی تو ہر ایک کو اپنی باری کا انتظار کرنا چاہیے۔ان کے ساتھ بھی ایسا سلوک ہوگا جیسے کچھ حکمرانوں سے کیا جا چکا ہے اور کچھ کے ساتھ ابھی ہو رہا ہے۔آج امریکہ اور مغربی ممالک اسی سوشلزم کے نظام کے نفاذ میں دلچسپی لے رہے ہیں جس کے وہ کبھی مخالف تھے۔یہ بھی حقیقت ہے یہ نظام اسلامی معاشی نظام کے قریب ترین ہے۔مگر کچھ لوگ اس کو اسلام کے متصادم سمجھتے ہیں۔موجودہ دور میں چین نے اسی نظام کو اپنا کر امریکہ کی سپر پاور کو باقاعدہ طور پر چیلنج کر دیا ہے۔حالیہ دنوں ''وال سٹریٹ'' کے مناظر نے یہ بات عیاں کر دی ہے کہ عوام اب وہ نظام چاہتی ہے جس سے امیر اور غریب کے درمیان خلیج کا تیزی سے بڑھتا ہوا فاصلہ کم کیا جا سکے۔امریکہ جو آج تک دوسروں کے گھروں میں آگ لگا کر ہاتھ تاپتا رہا ہے اب اس آگ کی چنگاریاں اس کے اپنے ملک میں بھی اڑنا شروع ہو گئیں ہیں۔ اب وہ وقت دور نہیں جب یہ چنگاڑی آگ کی صورت میں بدل کر امریکہ کے غرور کو راکھ کا ایک ڈھیر بنا دے گی۔وطن عزیز کے لیڈروں کو بھی اب اپنی روش بدل لینی چاہیے ورنہ ہماری قوم جو ابھی تک غفلت کی نیند میں ہے اگر یہ جنونی قوم جاگ گئی تو ان ظالم حکمرانوں کا حال ایسا ہوگا کہ آئندہ آنے والی نسلیں ان حکمرانوں کے خوفناک انجام کی مثالیں دیا کریں گی۔

روزنامہ ''دن'' لاہور 26 اکتوبر 2011ء

قابل غور

☆ جب بھٹو صاحب ضیاء کے چنگل میں پھنسے تو کوئی عالمِ دین اُس عاشقِ رسولؐ کو بچانے کے لیے سڑکوں پر نہیں آیا۔

☆ ضیاء الحق کا بنایا ہوا یہ قانون پچاس سے زائد اسلامی ممالک میں بھی متعارف نہیں کیا گیا اور اگر کہیں یہ قانون

ہے تو اس کی سزا موت نہیں مقرر کی گئی۔

☆ اگر اولاد اپنے ماں باپ کا کہنا نہ مانے اور اپنے مفادات کی خاطر اپنی مرضی کرے تو ہم اس کو تابعدار تو نہیں کہتے ناں! اس کو نافرمان اور گستاخ سمجھا جاتا ہے مگر جب معاملہ اللہ اور اس کے رسول کی بات ماننے اور اس پر صاف نیت سے عمل کرنے کا آتا ہے تو ہمارا معیار دوغلا ہو جاتا ہے۔

☆ جب تک ہم اپنے اعمال حقیقی اسلام کے سنہری اصولوں کے مطابق نہیں کریں گے ہم سب سے بڑے ”گستاخ رسول“ رہیں گے۔ جس کی سزا ہم کو کسی انسان سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے مل کر رہے گی۔

☆ ہم جس نبیؐ کے عاشق ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ انہی کی ہدایت پر عمل نہ کر کے گستاخی کے مرتکب ہو رہے ہیں اور یہ اتنی دیر تک ہوتا رہے گا جب تک پاکستان میں انتہاپسندوں کے بجائے فیصلے پاکستان کی عدلیہ اور آئین نہیں کرتا۔

ہم کب تک انتہا پسندوں کے ہاتھوں ہائی جیک رہیں گے؟

14 اگست 1947ء کو سامراجی شکنجے سے آزاد ہونے کے سے صرف تین دن پہلے قائداعظم محمد علی جناح نے پہلی مجلسِ دستور ساز سے خطاب کرتے ہوئے ریاست پاکستان کے ڈھانچے اور ابتدائی ہیت پر تقریر کرتے ہوئے واضح الفاظ میں کہا کہ آپ کو اپنی مسجدوں، مندروں اور گرجا گھروں میں جانے کی مکمل آزادی ہے ریاست کا اس سے کوئی تعلق نہیں کہ کسی شہری کا مذہب کا ہے۔میں نے آسان ترین الفاظ میں اُن الفاظ کو لکھنے کی کوشش کی ہے جو قائداعظم نے انگریزی زبان میں کہے۔سب سے پہلے تو قائد کی اس تقریر کو چھپنے سے روکا گیا لیکن خدا بھلا کرے "ڈیلی ڈان" کا جس نے اُس تقریر کو من وعن شائع کر کے آنے والی نسلوں تک پہنچا دیا کہ بانی پاکستان کس طرح کی ریاست کا نقشہ ذہن میں لیے جدوجہد کرتے رہے لیکن 1949ء کی قرار دادِ مقاصد نے ریاست کے بنیادی ڈھانچے کی جو تشریح کی وہ قائد کے خیالات ونظریات سے بالکل متضاد بلکہ متصادم تھی۔پاکستان کو اسلامی جمہوریہ قرار دینے کے بعد نام نہاد ملاؤں اور خود غرض سیاسی رہنماؤں نے "اسلام" کے نام پر اپنے اپنے مفادات کی جنگ کا وہ سلسلہ شروع کیا کہ آج 64 برس گزرنے کے بعد بھی ہر صوبے سے الامان الامان کی آوازیں آ رہی ہیں۔ہمارے ملک میں بسنے والوں کی اکثریت ان لوگوں کی ہے جن میں شعور کم اور جنون زیادہ ہے۔اسی چیز کا فائدہ چند لوگ اٹھاتے چلے آ رہے ہیں کیونکہ جنونی لوگ دماغ سے کم اور دل سے زیادہ کام لیتے ہیں۔یہی وجہ ہے اس عوام کے دل میں اسلام کا امن اور محبت کا پیام اتارنے کے بجائے اپنی سیاست چمکانے کے لیے ایک اجنبی "اسلام" کا نعرہ یا نام استعمال کیا ہے۔اس مکروہ کام میں پاکستان کی تاریخ کے سب

سے بڑے عوامی لیڈر ذوالفقار علی بھٹو بھی اپنا حصہ ڈال گئے۔حالانکہ ذاتی طور پر وہ بڑے روشن خیال تھے مگر اپنی کرسی کو بچانے کی خاطر علماء کو خوش کر کے عوام میں اپنی مقبولیت کا گراف گرنے سے بچانے کے لیے انہوں نے کچھ قوانین میں ایسی ترامیم کیں جن کو بعد میں ضیاء الحق نے مزید وسعت دے کر اپنے آپ کو "مردِ مومن مردِ حق" ظاہر کر کے اپنے اقتدار کو طول دینے کی کوشش کی۔جب بھٹو صاحب ضیاء کے چنگل میں پھنسے تو کوئی عالمِ دین اُس عاشقِ رسول کو بچانے کے لیے سڑکوں پر نہیں آیا۔یہ بات بھی سب کو پتہ ہے کہ "مردِ مومن" قوم سے کیا وعدہ اور 90 دن میں انتخابات 90 ماہ میں بھی نہ ہو سکے۔مومن تو اپنے وعدے کا پکا ہوتا ہے مگر یہ خودساختہ مومن ایسا بیج بو گیا جس کی فصل آج تک کاٹی جا رہی ہے۔مردِ مومن نے "توہین رسالت" کا وہ قانون متعارف کروایا جو کبھی انگریزوں نے برصغیر میں صرف اس لیے نافذ کیا تھا تا کہ یہاں پر بسنے والے مختلف مذاہب میں ہم آہنگی قائم رہے۔کوئی کسی دوسرے مذہب، مذہبی پیشوا یا مذہبی صحیفوں کے بارے میں غلط بات کر کے فسادات کا موجب نہ بنے۔1697ء میں اسکاٹ لینڈ کے شہر ایڈنبرا کے رہائشی ایکن ہیڈ جو میڈیکل کا طالب علم تھا کو اسی قانون کے تحت پھانسی کی سزا دی گئی۔برطانوی تاریخ میں Blasphemy law کے تحت پھانسی کی سزا پانے والا یہ آخری شخص ثابت ہوا کیونکہ اس کے بعد برطانیہ میں یہ قانون نافذ العمل نہ رہا۔ضیاء الحق کا بنایا ہوا یہ قانون پچاس سے زائد اسلامی ممالک میں بھی متعارف نہیں کیا گیا اور اگر کہیں یہ قانون ہے تو اس کی سزا موت نہیں مقرر کی گئی۔پاکستان بلکہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس نے نہ صرف یہ قانون متعارف کروایا بلکہ اس کی سزا کی آخری حد یعنی موت مقرر کر کے اللہ اور اس کے رسول سے اپنی بے پناہ عقیدت اور والہانہ پیار کا ثبوت بھی دیا۔ظاہر ہے جب اس قانون کو تشکیل دیا گیا ہوگا تو بڑے بڑے علماء اور قانونی مشیروں نے اپنی رائے بھی دی ہوگی۔اس قانون سے شاید عوام کی اکثریت کو اختلاف بھی نہ ہو۔کیونکہ اس ملک میں مسلم آبادی کا تناسب تقریباً 96.2% ہے۔مگر پاکستان میں اکثر قوانین طاقتور کو

تحفظ دیتے ہیں یا طاقتور اس کا ناجائز استعمال کر کے کمزور کا استحصال کرتا ہے۔اسی طرح اس قانون میں بھی ہوا۔کیونکہ اس قانون کے نافذ ہونے کے بعد زیادہ تر ایسے واقعات سامنے آئے جن میں دیکھا گیا کہ "توہین رسالت" کسی نے کی ہی نہیں مگر طاقتور نے اپنی زیادتی اور گناہ چھپانے یا کمزور کے سر اٹھانے پر اس کو توہین رسالت کے اس جال میں الجھا دیا جس کی ابتداء ذلالت اور انتہا اذیت والی موت پر ہوتی ہے۔اس قانون کے تحت بننے والے کئی قربانی کے بکرے آج تک میڈیا عوام کے سامنے لا چکا ہے۔جس کا اثر ساری دنیا میں محسوس کیا جاتا ہے کیونکہ بیرونی میڈیا اور انسانی حقوق کے ادارے اس بات کو اس طرح لیتے ہیں کہ ہم جنونی ہیں، انتہاء پسند ہیں، انسانی قدروں کو پامال کر رہے ہیں، اپنے ملک میں اقلیتوں اور غریبوں کے جان و مال کا تحفظ نہیں کر سکتے، قانون اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں وغیرہ وغیرہ-----! 295B, 295C, 298A, 298C میں یہ تو لکھ دیا گیا کہ مجرم کی سزا موت ہے۔مگر اس قانون کا غلط استعمال کرنے والے کی سزا مقرر نہیں کی۔اللہ اور اسکے رسول کے نام پر جھوٹے بہتان باندھ کر کسی کی جان لینا یا کسی کی جان لینے پر آمادہ کرنے والے کے لیے اس میں کوئی شق نہیں رکھی گئی---دوسری طرف سلمان تاثیر کے بیٹے کو ان لوگوں نے پہلے سے اغواء کر لیا۔اس کی بیٹی کو بھی دھمکیوں کا سلسلہ جاری ہے جس کا انکشاف اس نے اپنے بھائی کے اغواء ہونے سے پہلے اپنے ایک انگلش کالم میں کیا تھا جو دی نیشن لندن میں شائع ہو چکا ہے۔کیا رسول اللہ سے محبت اور عقیدت کا یہی انداز ہے؟صفائی نصف ایمان ہے ہمارے ملک میں صفائی کا حال دیکھ کر نصف ایمان سے تو ہم ویسے ہی محروم نظر آتے ہیں۔باقی ہمارے اعمال بھی دیکھ لیں۔جن کی تو ہین ہم برداشت نہیں کرتے ان کو تو دشمن بھی صادق اور امین کہتے تھے۔ہمارے جھوٹ اور بے ایمانی کی مثال نہیں ملتی۔ آپ کی زندگی ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے جو میدان جنگ میں بھی اصولوں اور قوانین پر کاربند رہتے تھے۔مگر ہماری عام زندگی میں کوئی اصول اور قانون نہیں۔اسلام تو سلامتی، امن، پیار، محبت، اخوت، بھائی چارے، مساوات، عاجزی، انکساری، انسانیت، عفو و در

گذر، قابل عمل، قابل فہم اور آسان دین ہے۔جس میں زندگی کے تمام معاملات اور مسائل کے حل کے لیے ہدایت کا سرچشمہ قرآن پاک اور اس کا عملی نمونہ آپ ﷺ کی ذات اقدس ہے۔جس پر عمل پیرا ہو کر ہم اپنی زندگی کو مثالی بنا سکتے ہیں۔مگر کیا ہم لوگ جو عاشق رسول ہونے کے دعوے دار ہیں اور اس میں موت بھی قبول کرنے کو تیار رہتے ہیں۔کیا ان کی یہ تعلیمات ہیں جن پر ہم آج عمل کر کے ساری دنیا میں رسوا ہو رہے ہیں؟جنونی مسلم اکثریت والے پاکستان میں کیا کوئی غیر مسلم توہین رسالت کرنے کا سوچ بھی سکتا ہے؟ ہم جنونی مسلمان تو یہ ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتے تو اس کو خود کیسے کر سکتے ہیں؟مگر حقیقت میں تو گستاخ رسول غیر مسلم یا اقلیتیں نہیں۔ہم مسلمان ہیں مگر ہم کو اس کا احساس نہیں ہوتا۔اگر اولاد اپنے ماں باپ کا کہنا نہ مانے اور اپنے مفادات کی خاطر اپنی مرضی کرے تو ہم اس کو تابعدار تو نہیں کہتے ناں! اس کو نافرمان اور گستاخ سمجھا جاتا ہے مگر جب معاملہ اللہ اور اس کے رسول کی بات ماننے اور اس پر صاف نیت سے عمل کرنے کا آتا ہے تو ہمارا معیار دوغلا ہو جاتا ہے۔ایک طرف تو ہم اپنے آقاؐ کے سب سے بڑے پرستار ہونے کے دعوے دار بنتے ہیں مگر ان کی بتائی ہوئی طرز زندگی اپناتے نہیں۔حقیقی گستاخ تو وہ ہیں جو ان کے ماننے والے بھی ہیں مگر آپؐ کے بتائے ہوئے راستے پر عمل نہیں کرتے۔مگر سچ کو تسلیم کرنا ہم نے سیکھا ہی نہیں۔اسلام انتہاء پسندی اور بنیاد پرستی نہیں سکھاتا بلکہ دوسرے مذاہب کا احترام کرنے کا درس بھی دیتا ہے۔مگر چند موقع شناس سیاستدانوں اور مفاد پرست علماء نے اس کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔جس میں وہ اکثر معصوم اور بے شعور لوگوں کو جہاد کی ترغیب دے کر ان سے وہ کام کروا رہے ہیں جس سے ہمارے ملک میں دہشت گردی اور خوف و ہراس کا ماحول بھی بڑھتا جا رہا ہے۔جہاد کے نام پر معصوم اور جاہل لوگوں کو گمراہ کرنے والوں نے کبھی خود جہاد کے لیے قدم کیوں نہ بڑھایا؟ اپنے بیٹوں کو کیوں نہ جہاد کرنے بھیجا؟ مولانا قادری صاحب نے تو ممتاز قادری کو ورغلا کر کسی کی جان لینے کے لیے اکسا دیا۔اگر یہ اتنا ہی نیک کام تھا تو سارا ثواب خود کیوں نہ لیا؟ ان حالات

میں بین الاقوامی سطح پر انسانی حقوق کے اداروں کی نظر ہماری عدالتوں پر ہوگی۔مگر حکومت اور عدالت بھی اس معاملے میں مجبور اور مفلوج ہے کیونکہ چند ایسے ہی جنونی جو اپنے آپ کو سچا مسلمان ظاہر کرتے ہیں ملک کے سارے نظام کو ایسا ہائی جیک کیا ہے کہ سارا نظام مفلوج ہو کر رہ گیا ہے۔اس میں سب سے زیادہ حصہ دار ضیاء الحق اور اس کی باقیات ہیں۔اگر ہم واقعی ہی عاشقِ رسول ہیں تو سب سے پہلے اپنے اعمال درست کرنے ہونگے،اپنی نیتیں صاف کرنی ہوں گی۔جب تک ہم اپنے اعمال حقیقی اسلام کے سنہری اصولوں کے مطابق نہیں کریں گے ہم سب سے بڑے "گستاخ رسول" رہیں گے۔جس کی سزا ہم کو کسی انسان سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے مل کر رہے گی۔اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت یہی ہے کہ کسی بھی ایسے معاملے میں عدالت سے رجوع کیا جائے چہ جائیکہ ہم خود وطنِ عزیز کی ہر سڑک پر کھڑے ہو کر منصفی کے فرائض سرانجام دیتے نظر آئیں۔ہم جس نبیؐ کے عاشق ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ انہی کی ہدایت پر عمل نہ کرکے گستاخی کے مرتکب ہو رہے ہیں اور یہ اتنی دیر تک ہوتا رہے گا جب تک پاکستان میں انتہاپسندوں کے بجائے فیصلے پاکستان کی عدلیہ اور آئین نہیں کرتا۔

روزنامہ "دن" لاہور 31 اکتوبر 2011ء

قابل غور

☆ نقل و حمل کی تاریخ بھی اتنی ہی پرانی ہے جتنی خود انسان کی اپنی تاریخ مگر انسان نے اپنی عقلِ سلیم کو استعمال کرتے ہوئے آہستہ آہستہ اپنے کندھوں کا بوجھ مشینوں پر منتقل کر دیا

☆ اس سوچ کو مزید آگے بڑھانے کے لیے برطانیہ جو اس

وقت تقریباً آدھی دنیا میں حکمرانی کر رہا تھا اس کے ایک صنعتکار اور امیر شخص ولیم جیمز نے کوئلے سے چلنے والی گاڑی کا منصوبہ پیش کیا

☆ 16 اپریل 1852ء کو پہلی ٹرین 400 مسافروں کو لے کر بمبئی سے تھانہ روانہ ہوئی جس کو تین بھاپ کی مدد سے چلنے والے انجن چلا رہے تھے۔ برصغیر کی اس پہلی ٹرین کو 21 توپوں کی سلامی دی گئی

☆ 1886ء میں مختلف چار کمپنیوں کو یکجا کر کے نارتھ ویسٹرن اسٹیٹ کے نام سے جو ریل شروع کی گئی وہی بعد میں پاکستان مغربی ریلوے اور پھر 1961ء کو پاکستان ریلوے کہلائی

☆ ایک زمانہ تھا جب بچے کھیل کود میں ایک دوسرے کی قمیض یا شرٹس پکڑ کر ریل بن کر چھک بم کرتے نظر آتے تھے۔ کھلونوں میں بھی ریل ایک لازمی جزو تھی۔ جیسے جیسے پاکستان ریلوے پر زوال آتا گیا بچوں نے بھی اس کھیل کو خیر باد کہہ دیا

<u>اشاعت خاص</u>

پاکستان ریلوے کی تاریخ اور ریل کا سفر

ابتدائی انسان کی ترقی کی رفتار وہی تھی جو اُس کے پیدل چلنے کی رفتار تھی۔ جس دن اُس نے گھوڑے پر قابو پالیا اُس کی ترقی کی رفتار ون ہارس پاور ہوگئی اور اُس کے بعد انسانی عقل نے رفتار کو تیز ترین کر دیا اس مقصد کیلئے اُس نے نت نئی ایجادات کیں۔ نقل و حمل کی تاریخ بھی اتنی ہی پرانی ہے جتنی خود انسان کی اپنی تاریخ مگر انسان نے اپنی عقل سلیم کو استعمال کرتے ہوئے آہستہ آہستہ اپنے کندھوں کا بوجھ مشینوں پر منتقل کر دیا......! نقل و حمل کا دور جانوروں پر سواری سے شروع ہوا پھر پہیہ کی ایجاد ہوئی تو نقل و حمل میں استعمال ہونے والا پہیہ آج تک ایسے گھومتا جا رہا ہے جیسے زمین اپنے محور کے گرد گھوم رہی ہے مگر وقت کے ساتھ ساتھ اس میں جدت آتی گئی۔ کبھی انسان یا جانور چھکڑے کو کھینچتا تھا پھر موٹر کی ایجاد نے انسانوں اور حیوانوں سے سارا بوجھ اپنے سر لے لیا۔ ترقی کے منازل طے کرتے ہوئے زمین، پانی اور فضاء میں سفر کرنا آسان اور تیز ترین ہوتا گیا۔ ذرائع نقل و حمل کے اس وسیع خاندان میں "ریل" کافی دیر بعد دنیا میں متعارف ہوئی۔ مگر بہت جلد اس کا شمار دنیا کے اہم ترین ذرائع نقل و حمل میں کیا جانے۔ جیمز واٹ نے بھاپ س چلنے والا انجن ایجا د کیا تو 1804ء میں پہلی مرتبہ ریلوے کے بارے میں سوچا گیا۔ 1812ء میں امریکی انجینئر اولیو رایونز نے بھاپ کی مدد سے چلنے والے انجن کو دنیا میں متعارف کروایا جو لوہے کی پٹریوں پر چلنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ امریکہ میں ہونے والی خانہ جنگی کی وجہ سے اس کا منصوبہ پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ اس کے بعد اس سوچ کو مزید آگے بڑھانے کے لیے برطانیہ جو اس وقت تقریباً آدھی دنیا میں حکمرانی کر رہا تھا اس کا ایک صنعتکار اور امیر شخص ولیم جیمز نے کوئلے سے

چلنے والی گاڑی کا منصوبہ پیش کیا۔ جس پر عمل کرتے ہوئے اس وقت کے دنیا کے سب سے بڑے صنعتی شہر مانچسٹر سے لیورپول تک ریلوے کا منصوبہ شروع کیا گیا۔ ولیم جیمز کاروبار میں دیوالیہ کی وجہ سے اس کو مکمل نہ کر سکا۔ لہٰذا اس کام کو جارج اسٹیفن سن نے پورا کیا۔ اسی وجہ سے اس کو "ریل" کا موجد بھی کہا جاتا ہے۔ 15 ستمبر 1830ء کو پہلی مال بردار اور مسافر گاڑی مانچسٹر سے لیورپول روانہ ہوئی۔ پارلیمینٹ نے اس ریلوے کا بل منظور کیا جس میں یہ وضع کیا گیا کہ قانون بنانے والے ادارے، حساس ادارے، پولیس وغیرہ اس کو ٹرانسپورٹ کرے گی۔ اس کے ساتھ ڈاک کی ترسیل کا کام بھی اس کے ذمے ہوگا۔ 1850ء تک برطانیہ کے تمام بڑے شہروں میں ریلوے کا نظام متعارف کروا دیا گیا تھا۔ 1832ء میں پہلی بار برطانیہ کے تسلط میں ہندوستان میں بھی ریلوے کا نظام متعارف کروانے کا منصوبہ پیش کیا گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دفاتر سے لندن میں برطانوی حکومت کو برصغیر میں فوجی اور تجارتی مقاصد کے لیے ریلوے کے قابل عمل ہونے کی ایک رپورٹ بھیجی۔ جس کے لیے 1840ء میں برطانوی حکومت نے لندن میں اجلاس کے دوران برصغیر میں ریلوے پر سروے کرنے کا حکم جاری کیا۔ جس کے لیے 1844ء میں برطانی انجینئر میکڈ ملڈ اسٹیفن سن نے سروے مکمل کر کے اس کے منافع بخش ہونے کی یقین دہانی کی رپورٹ لندن بھجوا دی۔ 1852ء میں بمبئی سے تھانہ 35 کلومیٹر ریلوے ٹریک بچھانے کا آغاز کیا گیا۔ 16 اپریل 1852ء کو پہلی ٹرین 400 مسافروں کو لے کر بمبئی سے تھانہ روانہ ہوئی جس کو تین بھاپ کی مدد سے چلنے والے انجن چلا رہے تھے۔ برصغیر کی اس پہلی ٹرین کو 21 توپوں کی سلامی دی گئی۔ یوں ہندوستان کی سست تہذیب اپنے تیز رفتاری کے پہلے سفر پر چل پڑی۔ 1853ء میں بنگال میں ہوا راہ سے ہگلی تک ریلوے لائن بچھا دی گئی۔ یوں 1854ء میں ہندوستان میں دوسری ٹرین سروس کا آغاز ہوا۔ بنگال کو دہلی سے ملانے کے لیے 1855ء کو ڈھاکہ سے کلکتہ براستہ پٹنہ، الہ آباد، کانپور، آگرہ ریلوے لائن کا کام شروع کیا گیا جو 10 سال میں پایہ تکمیل تک پہنچا۔ دوسری طرف دہلی سے جے پور، اجمیر کا 10 سالہ منصوبہ بھی

شروع کیا گیا۔ یکم جولائی 1856ء کو مدراس سے ارکوٹ کے لیے پہلی ٹرین چلی۔ 1856ء دہلی کو کراچی سے ملانے کے لیے بھی 10 سالہ منصوبہ شروع کیا گیا۔ جس کے مطابق دہلی، امرتسر، لاہور، خانیوال، ملتان، بہاولپور، رحیم یار خان، سکھر، خیر پور، نواب شاہ، ٹنڈو آدم، حیدر آباد، کوٹری، کراچی تک ریلوے لائن بچھانے کا کام تھا۔ 1858ء کو کھنڈالہ سے پونا تک ریلوے لائن مکمل کی گئی۔ 13 مئی 1861ء کو کراچی سے کوٹری 105 میل کی ریلوے ٹریک کو عوام الناس کے لیے کھول دیا گیا۔ 1864ء دہلی سے کلکتہ تک پہلی ٹرین سروس کا آغاز ہوا۔ یوں 1880ء تک برصغیر میں 14500 میل کا ریلوے ٹریک بچھا دیا گیا تھا۔ جو اس وقت دنیا کا سب سے بڑا ریلوے نظام تصور کیا جاتا تھا اور آج بھی اس کا شمار دنیا کے بڑے ریلوے نظاموں میں ہی ہوتا ہے۔ پاکستان، بھارت، سری لنکا، بنگلہ دیش میں ریلوے کا یہ وسیع نظام آج بھی ایک ارب سے زائد لوگوں کو سفری سہولتیں مہیا کر رہا ہے۔ 1880ء تک مختلف نجی کمپنیوں نے 95 کروڑ پاؤنڈ کی سرمایہ کاری کر رکھی تھی جو نہایت منافع بخش سرمایہ کاری ثابت ہوئی۔ 1886ء میں مختلف چار کمپنیوں کو یکجا کر کے نارتھ ویسٹرن اسٹیٹ کے نام سے جو ریل شروع کی گئی وہی بعد میں مغربی پاکستان ریلوے اور پھر 1961ء کو پاکستان ریلوے کہلائی۔ 1887ء میں اس وقت کا دنیا کا سب سے بڑا لوہے کا پل سکھر، روہڑی کے درمیان شروع کیا گیا جس میں 3300 ٹن لوہا استعمال ہوا اس پل کا افتتاح اس وقت کے وائس رائے لارڈ ڈاؤن نے 25 مارچ 1889ء کو کیا یہ تاریخ ساز پل آج بھی قائم ہے۔ جیکب آباد سے چمن براستہ سبی، کوئٹہ ریلوے لائن بھی بچھائی گئی۔ جس میں اس وقت کی دنیا کی لمبی ترین سرنگ بنائی گئی۔ جس کی لمبائی 3.9 کلومیٹر ہے۔ جسے خوجک سرنگ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کو بنانے کے لیے اس وقت مختلف ممالک سے ہزاروں کی تعداد میں مزدور بلائے گئے جن میں سے سینکڑوں سخت سردی کی وجہ سے بیمار ہو کر مر بھی گئے۔ 1890ء میں آٹھ سو سے زیادہ مزدور ٹائفائڈ کی وجہ سے ہلاک ہوئے۔ قندھار تک ریلوے لائن کا منصوبہ تھا جو پھر پورا نہ ہو سکا جو آج تک خواب ہی

بن کر رہ گیا ہے۔یہ سرنگ سطح سمندر سے 5394 فٹ کی اونچائی پر ہے۔1898ء میں اس سرنگ کے مکمل ہونے سے خیبر پختون میں بچھنے والی لائن کو کراچی سے جوڑ دیا گیا۔راولپنڈی، پشاور اور لنڈی کوتل کو بھی مکمل کیا گیا۔یوں کوئٹہ چمن اور پشاور لنڈی کوتل کو دنیا کی شاہکار ریلوے ٹریک میں شمار کیا جانے لگا۔4 نومبر 1925ء کو پشاور سے لنڈی کوتل کے لیے پہلی ٹرین کا آغاز ہوا۔انگریزوں کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک میں ان کی بنائی ہوئے ریلوے لائنوں پر لیٹ کر یا ان کو توڑ کر نظام کو مفلوج بنانے کی بھی اکثر کوشش کی جاتی تھی۔

1947ء کو قیام پاکستان کے وقت تقریباً 8122 کلومیٹر ریلوے لائن پاکستان کے حصے میں آئی۔اس کے ساتھ ایشیاء کی سب سے بڑی اور بہترین ریلوے ورکشاپ بھی، جس کو آج بھی مغل پورہ ریلوے ورکشاپ کہا جاتا ہے لیکن آج یہ ایشیاء کی سب سے بڑی ورکشاپ نہیں ۔ریل ہر دور میں بچوں، بوڑھوں اور بڑوں کی ہر دلعزیز سواری رہی ہے۔ایک زمانہ تھا جب بچے کھیل کود میں ایک دوسرے کی قمیض یا شرٹس پکڑ کر ریل بن کر چھک بم کرتے نظر آتے تھے۔کھلونوں میں بھی ریل ایک لازمی جزو تھی۔جیسے جیسے پاکستان ریلوے پر زوال آتا گیا بچوں نے بھی اس کھیل کو خیر باد کہہ دیا۔قیام پاکستان کے بعد 1954ء میں مردان سے چارسدہ اور 1956ء میں جیکب آباد سے کشمور کے لیے ریلوے لائن بچھائی گئی۔اس کے بعد راونڈ سے خانیوال سیکشن کو الیکٹرک کیا گیا جس کا آج یہ عالم ہے کہ ان برقی رو والی تاروں پر پرندوں نے گھونسلے بنا رکھے ہیں۔1969ء سے 1973ء میں کوٹ ادو سے کشمور تک ریلوے لائن بچھائی گئی جس سے شمالی پاکستان کو کراچی سے ملایا گیا۔اس کے علاوہ ملتان لودھراں کا ڈبل ٹریک ایک خاص کام ہے جو پاکستان ریلوے کے نام منسوب کیا جا سکتا ہے۔مگر حقیقی اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ انگریزوں کے دور میں بچھائی گئی 8122 میل کی ریلوے لائن میں اتنا اضافہ نہیں ہوا کیونکہ آج بھی پاکستان ریلوے کی پاس 8122 میل سے زائد کا ریلوے ٹریک نہیں۔کیونکہ جتنا اس میں اضافہ ہوا اس سے زیادہ پہلے سے بچھائی گئی

ریلوے لائن کو نا قابل استعمال بنا دیا گیا۔برطانوی حکومت کو جس ریلوے کو بنانے میں ایک صدی لگی اس کا ستیا ناس ہم نے نصف صدی میں کر دیا۔ساری دنیا میں آج ریلوے معاشی ستون تصور کیا جاتا ہے اس کے ساتھ عوام اور صنعت کا اس پر کافی دارومدار ہوتا ہے۔لگتا ہے پاکستانی حکمرانوں کو افغانستان نظر آتا ہے جس میں ریل کا کوئی نظام موجود نہیں مگر ان کو بھارت نظر کیوں نہیں آتا جس کو ورثے میں ایسا ہی ریلوے کا نظام ملا تھا جیسا ہمارے ملک کو-----آج بھارت کا شمار ان ممالک میں ہوتا ہے جہاں پر ریلوے منافع بخش ادارہ ہے۔پاکستان کا رواں سال کا ریلوے کا خسارہ 26252.315 ملین روپے اور بھارت کا اس سال کا سرپلس 19 ہزار کروڑ روپے ہے۔ پھر بھی ادھر انا ہزارے نے کرپشن کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ہمارے ہاں ریلوے میں کرپشن کا یہ عالم ہے کہ 400 کلومیٹر کی پٹڑی جس کی مالیت 380 کروڑ تھی اس کو صرف 9 کروڑ میں فروخت کر دیا گیا۔اس کے علاوہ بھی ریلوے کو کرپشن مافیا نے ایسا جکڑ رکھا ہے کہ جلد ہی ریلوے کا نام ہی رہ جائے گا مگر ریل کا نشان نہیں ملے گا۔دنیا میں ارتقائی عمل میں ترقی کے ساتھ ساتھ ریل کے نظام کو بھی جدید سہولیات پر استوار کیا گیا۔1908ء میں برطانیہ میں الیکٹرک ٹرین کا آغاز ہوا۔اس کے بعد روز بروز اس میں جدت آتی گئی۔آج دنیا میں بلٹ ٹرین جو رفتار کے لحاظ سے زمینی جہاز ہی ہے۔زیر زمین ٹرین بھی دنیا کے بیشتر ممالک میں چل رہی ہے۔لوگوں کی اکثریت کام کاج پر جانے کے لیے ٹریفک کے جھنجٹ سے آزاد ہونے کے لیے اس کا استعمال بڑے شوق سے کرتے ہیں۔لندن میں زیر زمین ٹرین کی مقبولیت اور اہمیت کا یہ عالم ہے کہ لاڈز اور پارلیمنٹیرین بھی اس میں سفر کرتے عام دکھائی دیتے ہیں۔اس کے علاوہ اندرون شہر ٹرامز کا استعمال بھی بہت سے ممالک میں عام ہے۔یورپ کے کئی ایئر پورٹس پر ایک ٹرمینل سے دوسرے ٹرمینل تک جانے کے لیے شٹل ریل سروس کا انتظام ہوتا ہے جو بغیر کسی ڈرائیور کے کمپیوٹرائزڈ پروگرام کے تحت چلتی ہے۔اکثر ایئر پورٹس کو ریلوے سے منسلک کیا جاتا ہے تاکہ مسافر جہاز سے اتر کر ریل کے ذریعے اپنی منزل

مقصود تک جا سکیں۔ یورپ اور برطانیہ کو ٹرین سروس کے ذریعہ ایسا منسلک کیا گیا ہے کہ لوگ روزانہ کام کاج کے سلسلے میں ٹرینوں میں ایسے سفر کرتے ہیں جیسے ہمارے ہاں ایک شہر سے دوسرے شہر میں کیا جاتا ہے۔ مگر فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں جسمانی اذیت اور ذہنی کوفت کا عنصر شامل نہیں ہوتا۔ لوگ دوران سفر اپنا دفتری یا کاروباری کام بھی لیپ ٹاپ پر کر رہے ہوتے ہیں، خواتین اپنا میک اپ بھی کرتی نظر آتی ہیں، کچھ اپنا آرام کا کوٹہ دوران سفر ہی پورا کرتے ہیں۔ سب سے خاص بات کہ دوران سفر کوئی کسی دوسرے پر نظر ہی نہیں ڈالتا ہر کوئی اپنے کام میں مگن نظر آتا ہے۔ انٹرنیشنل ٹرینوں کا معیار جہازوں سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ تبھی تو لوگ سیر و سیاحت کے لیے بھی ریل کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس آرام دہ سفر میں باہر کے قدرتی نظاروں سے بھی محظوظ ہونے کا موقع ملتا ہے جو جہاز میں میسر نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ گرمیوں اور سردیوں کی سالانہ چھٹیوں کے موقع پر ریل کے خصوصی پیکیج کا اعلان بھی کیا جاتا ہے تا کہ لوگ چھٹیوں میں ریل کے ذریعے سیر و تفریح سے بھر پور لطف اندوز ہو سکیں۔ برطانیہ اور یورپ کی کامیاب ریل سروس میں چینل ٹنل کا بڑا ہاتھ ہے۔

channel tunnel زیر سمندر ایک 50.5 کلومیٹر لمبی سرنگ ہے جو برطانیہ کے dover کو فرانس کے calais سے ملاتی ہے۔ اس سرنگ میں برطانیہ کی ہائی سپیڈ ٹرین Euro star چلتی ہے۔ اس سرنگ کا باقاعدہ افتتاح 1994ء میں فرانس کے صدر متراں اور برطانیہ کی ملکہ نے مل کر کیا تھا۔ اسی طرز کی ایک اور زیر سمندر سرنگ جو ریل کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ جاپان seikam tunnel کے نام سے مشہور ہے جس کی لمبائی 53.85 کلومیٹر ہے۔ یورپ اور برطانیہ میں بچے، بوڑھے اور معذور افراد کے لیے ریل میں سفر کے دوران خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ معذور افراد کے ساتھ دیکھ بھال کرنے والے کو بھی رعایت کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ جرمنی میں معذور افراد کو ریل کا سفر فری رکھا گیا ہے اور ان کے ساتھ دیکھ بھال کرنے والے کو بھی کرایے سے مستثنیٰ کر دیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں کرائے میں رعایت تو درکنار بوڑھے لوگ اپنی

ساری زندگی ریلوے میں کام کر کے اپنا خون پسینہ بہا کر جب اپنا حق یعنی پنشن لینے جاتے ہیں تو ان کو دھکے کھانے پڑتے ہیں۔ بعض بزرگ تو اپنی پنشن کے حصول میں دھکے کھا کر جان سے ہی ہاتھ دھو بیٹھے۔ اسلام تو ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کر دینی چاہیے۔ شاید اسلام کے اس سنہری اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے ہی یہاں مزدور کو اتنا بھگایا جاتا ہے کہ اس کا پسینہ خشک ہونے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ لوگ سمجھ رہے ہیں کہ پاکستان ریلوے تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے مگر ہمارے سیاسی اکابرین کو اس بات کا احساس ہی نہیں کیونکہ ان کے خیال میں اگر ٹرین نہ چلے تو اس کے بھی کافی عوامی فائدے ہوں گے۔ آج ہر انسان کو تیزی ہے اور وقت کسی کے پاس نہیں لہٰذا ٹرین بند ہو جانے سے پھاٹک پر کھڑے ہو کر انتظار کی زحمت سے بچا جا سکے گا۔ ریلوے ٹریک کے ساتھ آبادی ہوتی ہے ان کے بچے اور بوڑھے اکثر ٹرین حادثات کا شکار ہو جاتے ہیں ریل سروس ختم ہونے سے ان کی جان کو خطرہ ختم ہو جائے گا۔ ٹرین کے شور سے اکثر لوگوں کے آرام میں خلل پڑتا ہے، ٹرین نہ چلنے کی صورت میں انسانی بنیادی حقوق کی پاسداری ہو گی۔ ریلوے اسٹیشن پر اکثر گھٹیا معیار کی اشیاء خورد و نوش کھا کر لوگ بیمار ہو جاتے ہیں ٹرین بند ہونے سے لوگ اس مہلک کھانے پینے کی چیزوں سے بچ جائیں گے اس سے صحت مندانہ معاشرہ پروان چڑھے گا۔ لوگوں کا خیال ہے ریلوے کے اس وسیع نظام کو کرپشن کی دیمک نے چاٹ لیا ہے تو اگر ٹرین ہی نہ چلے گی تو نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری......!! اس سے کرپشن میں خود بخود کمی آئی گی۔ ٹرینوں میں اکثر کم عمر بچے چیزیں بیچنے آ جاتے ہیں ٹرین نہ ہو گی تو چائلڈ لیبر پر بھی کنٹرول ہو جائے گا۔ ٹرین میں مختلف درجات کی سفری سہولیات ہوتی ہیں جن میں ائیر کنڈیشنڈ، اے سی پارلر، اے سی لوئر، اکانومی، سلیپر کلاس وغیرہ وغیرہ جس میں بیٹھے لوگوں کی کلاس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ٹرین ختم ہو جائے تو مساوات قائم کرنا آسان ہو گا۔ اب ان ظالم حکمرانوں کو کون سمجھائے کہ ریلوے وہ عوامی سواری ہے جس پر ایک دن میں تقریباً 178000 لوگ سفر کرتے ہیں۔ ہماری

ناقص ریلوے نظام کی وجہ سے لوگ نہ چاہتے ہوئے بھی پرائیویٹ ٹرانسپورٹ پر سفر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں جن کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہی ہو رہا ہے کیونکہ ٹرینوں کی تعداد میں کمی آتی جا رہی ہے۔آج ایک محتاط اندازے کے مطابق 250000افراد روزانہ پرائیویٹ ٹرانسپورٹ کے ذریعے انٹر سٹی روٹس پر سفر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اسی طرح مال برداری کا سب سے بڑا ذریعہ بھی ریل ہونی چاہیے مگر اب ایسا نہیں رہا، اس کی جگہ اب پرائیویٹ مال بردار ٹرانسپورٹ لے چکی ہے۔اس وقت پاکستان ریلوے کی حالت زار یہ ہے کہ یہاں کچھ ٹرینوں کی ہفتہ وار چھٹی ہوتی ہے حالانکہ اس چھٹی والے دن مسافر زیادہ سفر کرتے ہیں۔یورپ کے اکثر ممالک میں ہفتے کے اختتام پر ٹکٹ خصوصی رعایت کے ساتھ دی جاتی ہے تاکہ لوگ چھٹی والے دن سستے سفر کی سہولت سے فائدہ اٹھائیں اس طرح کاروں وغیرہ کے استعمال میں کمی بھی آتی ہے جس سے ماحول میں آلودگی کو کم بھی کیا جا سکتا ہے اور ٹریفک حادثات کو بھی۔مثلاً جرمنی میں 35یورو کی weekendفیملی ٹکٹ کے ساتھ سولہ سال سے کم عمر کے دو بچے اور دو جوان سارے جرمنی میں کہیں بھی سفر کر سکتے ہیں۔ہمارا ریلوے کا ادارہ وہ تھا جس کو ایک منی ریاست کہا جا سکتا تھا۔پاکستان ریلوے ایک ایسا ادارہ ہے جس میں اس محکمے کے اپنے سکول، اساتذہ، بسیں، رہائشی کالونیاں ہیں۔ جہاں بجلی اور پانی کی فراہمی ریلوے کے زیر اثر ہے، ہسپتال، پیرامیڈیکل سٹاف، اپنا ریونیو ڈیپارٹمنٹ، اس کی اپنی عدالتیں جہاں ریلوے کے مجسٹریٹ عدالت لگا کر بیٹھتے ہیں۔اپنے گراؤنڈز، اپنی اراضی ہے۔ مغل پورہ کی ورکشاپ جس کا ایشیاء میں خاص مقام تھا، رسالپور کی 251 ایکڑ پر محیط لوکو موٹو فیکٹری جو جاپان کے اشتراک سے تیار کی گئی جس میں الیکٹرک اور ڈیزل انجن بنانے کا کام ہوتا ہے جو 3000ہارس پاور کے AGE-30انجن بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔یہاں انجن کے سپئر پارٹس بنانے کا کام بھی کیا جاتا ہے۔راولپنڈی میں قائم ریلوے کیرج فیکٹری پاکستان ریلوے کی مسافر بوگیاں بنانے اور کیرج ویگنز کی تمام سہولیات پوری کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔خانیوال میں سلیپر بنانے کی فیکٹری موجود

ہے۔ پاکستان ایسے خطے میں واقع ہے اگر ریلوے کے نظام کو توسیع دے کی اس کا سلسلہ دوسرے ممالک سے ملایا جائے تو ہم چین، بھارت، یورپ تک ٹرین سروس کے ذریعے منسلک ہو کر اپنی حالت بہتر بنا سکتے ہیں۔اب تک ایسے کئی منصوبے اس لیے ناکام ہو چکے ہیں کہ ان کو صرف پیسہ کھانے کے لیے استعمال کیا گیا۔کرپشن کا یہ عالم کہ رن پٹھانی اور دیگر پلوں کے گرنے کے واقعات بار بار ہوئے مگر کسی کے سر پر جوں تک نہ رینگی ......1889ء میں سکھر۔روہڑی کے درمیان بننے والا پل آج بھی اپنے بنانے والوں کی ایمانداری کی گواہی دے رہا ہے۔ایران، زاہدان سیکشن کو ترکی سے ملانے کا ناکام منصوبہ،کبھی حویلیاں سے چین کے کاشغر کی ریلوے سروس کا ادھورا خواب، جو چند لوگوں کو تو فائدہ دے گیا مگر ساری قوم کی یکساں ملکیت پاکستان ریلوے کا بیڑہ غرق کر گیا۔اب بھی وقت ہے اس کو بچایا جا سکتا ہے بس اس سے نااہل اور کرپٹ لوگوں کو نکال باہر کیا جائے۔ریلوے کے اثاثے اب بھی اتنے وسیع ہیں کہ ان کو لیز پر دے کر پورے ملک کو چلایا جا سکتا ہے۔لیکن ریلوے کے ارباب بست وکشاد اس جانب توجہ نہیں دیتے۔ ہر کام میں نیت کی درستگی بہت ضروری ہے۔ جو لوگ پٹری کو بیچ سکتے ہیں، مال گاڑی کے ڈبے بمعہ تابنا چوری کر سکتے ہیں، وہ کیا کچھ نہیں کر سکتے......؟میڈیا کو عوامی مسائل کے ساتھ ساتھ اب ملکی املاک اور اثاثوں پر بھی نظر رکھنا ہو گی۔کیونکہ اب کرپٹ لوگوں پر مزید اعتبار کر کے اپنے آپ کو تباہی کے اتھاہ سمندر میں غرق ہونے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔اگر ریل کے نظام کو نہ بچایا گیا تو پھر اس کے اثرات پاکستانی سماج پر بری طرح اثر انداز ہوں گے۔ریل کے نظام کو کاروبار اور منافع کی غرض سے دیکھنے کی بجائے اس کو سماجی خدمت کا ایک ادارہ قرار دے کر مسافروں کی سہولیات کی خاطر اس نظام کو درست کرنے کی عملی کوشش کی جائے تاکہ ریلوے مستحکم کر کے زوال پذیری سے نکل کر ترقی کی اعلیٰ منزلیں طے کر سکے۔ ورنہ ریلوے کے وزیر حاجی بلور صاحب نے تو کہہ دیا ہے کہ دنیا میں بہت سے ممالک ایسے ہیں جہاں ریلوے نہیں ہے، کیا وہ ملک نہیں چل رہے؟اور اُن کی ذہنی پستی کا حال اس بات سے لگائیں کہ اس زمرے میں وہ

افغانستان کی مثال دیتے ہیں۔ذلیل و خوار ہوتے لاکھوں مسافر، لاکھوں بے روزگار ہوتے ریلوے ملازم اور پنشن کیلئے قطاروں میں لگے ذلت آمیز رویہ برداشت کرتے ہوئے موت کے منہ میں جاتے ہوئے بزرگ حیرت وحسرت سے پاکستان ریلوے کے کرتا دھرتا لوگوں کو دیکھ رہے ہیں۔ جہاں سے کوئی امید کی کرن نمودار ہوتی دکھائی نہیں دے رہی۔

روزنامہ "دن" لاہور 2 نومبر 2011ء

قابلِ غور

☆ صوبہ بلوچستان ان دھرنوں اور ریلیوں سے صرف اس لیے محفوظ ہے کہ وہاں تو زیارتوں کے لیے اکٹھے نہیں ہوا جا سکتا سو بلوچوں نے ایسے جان لیوا اکٹھ سے لاتعلق ہی بہتر سمجھی ہے۔

☆ جن کا سب کچھ سیلاب میں بہ جائے وہ یا حکومت کی طرف دیکھیں گے یا آسمان کی طرف۔

☆ ریلے گزر جاتے ہیں لیکن بارشوں کا پانی چونکہ رستہ مانگتا ہے اور پہلے سے بندوبست نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے اور ریلے کی بجائے دھرنے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

☆ اگر کسی کو سانپ ڈس لے تو کوئی باشعور انسان سانپ کو بلا کر اس کا تریاق نہیں پوچھتا اور پھر بھلا سانپوں کے پاس اتنا وقت کہاں ہوتا ہے کہ وہ پہلے ڈسنے کیلئے ٹائم نکالیں اور بعد ازاں علاج کے لیے اپوئنٹمنٹ دیتے پھریں۔

☆ اس جلسے کی خاص بات کہ اس کا نوٹس بین الاقوامی سطح پر بھی لیا گیا۔ کیونکہ یہ ”آل ان ون“ اور ”ون اگینسٹ آل“ تھا۔

سیلابی دھرنے اور سیاسی ریلیاں

جب سے مفاہمت پسند جمہوری حکومت نے وطن عزیز میں جنم لیا ہے سیلابی دھرنوں اور سیاسی ریلیوں کا تسلسل ہے کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ صوبہ بلوچستان ان دھرنوں اور ریلیوں سے صرف اس لیے محفوظ ہے کہ وہاں تو زیارتوں کے لیے اکٹھے نہیں ہوا جا سکتا سو بلوچوں نے ایسے جان لیوا اکٹھ سے لاتعلقی ہی بہتر سمجھی ہے۔ گزشتہ برس تو سیلاب کا ریلا آیا اور اپنے ساتھ غریبوں کے آشیانے، ذرائع معاش کے ٹھکانوں کے ساتھ ساتھ ان کے کئی عزیز و اقارب بھی بہا لے گیا۔ میڈیا نے اس کی دہائی دی تو اُس کی وجہ سے سیلاب متاثرین کے لیے پاکستان اور کچھ بیرونی ممالک کا ضمیر بھی جاگ گیا۔ اب یہ الگ داستان ہے کہ امداد دیانت داری سے متاثرین سیلاب تک پہنچائی گئی یا نہیں۔ سیلابی ریلا جہاں سے گزرتا ہے وہاں تباہی تو ہوتی ہی ہے مگر اس کے بعد وہاں کی زمین پہلے سے زیادہ توانا ہو جاتی ہے مگر اس کی توانائی سے کچھ حاصل کرنے کے لیے اس پر پہلی سرمایہ کاری تو خود ہی کرنا پڑتی ہے اور جن کا سب کچھ سیلاب میں بہہ جائے وہ یا حکومت کی طرف دیکھیں گے یا آسمان کی طرف۔ وطن عزیز میں سیاسی ریلیوں کا موسم دیکھ کر اس سال سیلاب نے بھی دھرنا دے دیا ہے جو اس بار دریائی ریلہ نہیں بلکہ بارشوں کی کارستانی ہے۔ ریلے گزر جاتے ہیں لیکن بارشوں کا پانی چونکہ رستہ مانگتا ہے اور پہلے سے بندوبست نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے اور ریلے کی بجائے دھرنے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس سال سیاسی اکابرین اپنے مفاداتی دھرنوں اور غیر سیاسی ریلیوں میں اتنے مگن تھے کہ ان کو اتنا وقت ہی نہ ملا کہ سیلابی دھرنے کے مطالبات پورے کر سکیں۔ 18 اکتوبر کو ایسٹ لندن میں PTI UK کے تعاون سے پاکستان کے معروف صحافی طلعت حسین نے اپنی چج فاؤنڈیشن

کے پلیٹ فارم سے سیلاب زدگان کے لیے ایک چیرٹی ڈنر کا اہتمام کیا۔جس میں برطانیہ میں تعینات پاکستانی ہائی کمیشن جناب واجد شمس الحسن نے بھی شرکت کی،اس کے علاوہ تقریباً ہر طبقے کے لوگ اس میں موجود تھے۔وہاں پر ایک دستاویزی فلم دکھائی گئی جس میں پاکستان میں حالیہ سیلابی دھرنے سے ہونے والی تباہ کاریوں کا علم ہوا۔یہ بھی تلخ حقیقت ہے کہ دھرنا سیاسی ہو یا سیلابی ......ریلا سیلابی ہو یا سیاسی اس میں فائدہ ہمیشہ مخصوص طبقے کا ہی ہوا ہے اور نقصان غریب عوام کا......یہ اب پاکستانی سیاست کا طے شدہ اصول بن گیا ہے دوسرے نقصان دینے والے اصولوں کی طرح،جس میں فتح اور نقصان کی یہ جنگ ہمیشہ عوام اپنے حکمرانوں سے ہار جاتی ہے اور جب تک عوام خود حکومت نہیں کرے گی ہارتی رہے گی!! ہمارے سیاسی "قائدین" نے ملک کا نام دنیا میں اتنا بدنام کر دیا ہے کہ اب ہم سیلاب زدگان کی مدد کے لیے اگر بیرونی ممالک کچھ کرنا بھی چاہیں تو لوگ اس کو بھی شک کی نظروں سے دیکھنا شروع ہوجاتے ہیں۔ہر سال سیلاب تباہ کاریاں کرے اور حکومت پھر بھی کوئی حفاظتی تدابیر نہ کرے تو اس فعل کو شک کی نظروں سے دیکھنا ناجائز نہیں کیونکہ انہوں نے اس کو بھی سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنا شروع کردیا ہے۔دنیا کا بہترین نہری نظام ہونے کے باوجود اگر ہم کو ہر سال سیلابی آفت سے نبرد آزما ہونا پڑے تو یہ انتظامی نالائقی ہی تصور ہو گی۔حالانکہ نہروں کو مزید گہرا کر کے اس کا سدباب کیا جا سکتا تھا۔حفاظتی ڈیم بھی بنائے جا سکتے تھے۔مگر ایسا کرنے سے سیلاب اتنا تباہ کن نہیں ہوگا اور پھر بیرونی امداد کیسے ملے گی؟سیلابی دھرنوں یا سیلابی ریلیوں میں اہم سیاسی شخصیات کا بنیادی مقصد ایک فوٹوسیشن سے زیادہ نہیں ہوتا۔حتیٰ کہ وہاں کے لوکل حکومتی نمائندے بھی غائب ہو جاتے ہیں۔مگر سیاسی دھرنے اور سیاسی ریلیاں میڈیا سمیت سب سیاسی قائدین کے لیے بڑی پر کشش ہوتے ہے۔ان ریلیوں، دھرنوں اور جلسوں میں پارلیمانی حضرات غیر پارلیمانی زبان استعمال کر کے اپنے آپ کو ایک دوسرے سے زیادہ مہذب ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔خادم اعلیٰ پنجاب انہی ریلیوں میں راگ آلاپ رہے ہیں

کہ وہ صدر پاکستان کو نہیں مانتے حالانکہ آصف علی زرداری سے صدر تک کا سفر صدر آصف علی زرداری نے مسلم لیگ نون کی غیر محسوس مدد سے ہی طے کیا ہے۔دوسری طرف وہ اسی حکومت کا حصہ بھی ہیں اور اس کے ساتھ ساری مراعات اور پوری تنخواہ پر کام بھی کر رہے ہیں۔یہ تو ایسے ہی ہے کہ کسی فوج کا ایک میجر اٹھ کر کہہ دے کہ میں اپنے آرمی چیف کو نہیں مانتا اور اُسے اپنے آفس کے باہر الٹا لٹکا دوں گا۔ایسا کہنے والے کو یقیناً کورٹ مارشل کا سامنا کرنا پڑے گا۔اگر اس کو یہ کہنا ہے تو اس سے قبل اس کو استعفیٰ دے کر فوجی وردی واپس کرنا ہوگی۔خادم اعلیٰ پنجاب کی خوش قسمتی ہے کہ ان سے ابھی تک شریفوں والا سلوک کیا جا رہا ہے اور مجھے حیرت ہے کہ آئین کے رکھوالے بھی اس پر خاموش ہیں۔ایم کیو ایم نے بھی ریلیوں کے اس تہوار میں کراچی میں اپنی ریلی کر کے یہ ثابت کر دیا کہ اب وہ حکومت کی سوکن نہیں کہلی ہے۔اسی لیے تو ان کی ریلی میں پیپلز پارٹی کے جھنڈے نہیں تھے باقی سب کچھ تھا۔ق لیگ بھی کبھی کبھی اپنا آپ دکھا کر موجودگی کا احساس دلا دیتی ہے۔جماعت اسلامی تو ہے ہی ریلیوں کی موجد......!یہ سب وہ لوگ ہیں جنہوں نے کئی بار اقتدار کے ایوانوں کے مزے لوٹے اور کچھ ابھی تک لوٹ رہے ہیں۔بھلا یہ ریلیوں اور جلوسوں میں عوام سے کس منہ سے ملک میں بہتری لانے کی بات کر سکتے ہیں۔اگر کسی کو سانپ ڈس لے تو کوئی باشعور انسان سانپ کو بلا کر اس کا تریاق نہیں پوچھتا اور پھر بھلا سانپوں کے پاس اتنا وقت کہاں ہوتا ہے کہ وہ پہلے ڈسنے کے لیے ٹائم نکالیں اور بعد ازاں علاج کے لیے اپوئنمنٹ دیتے پھریں۔میری سمجھ سے باہر ہے کہ ہر چینل پر میڈیا والے کرپشن مافیا کو "ٹاک شوز" میں بلا کر یہ پوچھ رہے ہوتے ہیں کہ ملک سے کرپشن کیسے دور ہوگی؟ملکی حالات کیسے ٹھیک ہو نگے؟ یہ تو وہی لوگ ہیں جنہوں نے اس ملک کو اس حال بلکہ بے حال تک پہنچایا ہے بھلا یہ کیا حل بتائیں گے۔

پھر بھی چند اینکر صاحبان کو 4 خواتین اور 20 حضرات کے علاوہ سارے پاکستان میں کوئی ایسا چہرہ ہی دکھائی نہیں دیتا جو مسائل کا حل بتا سکے۔ان کو بھی چینل کی

ریٹنگ کا فکر ہوتا ہے۔ حالانکہ اگر یہ ذرا سی تبدیلی لائیں تو ان کی ریٹنگ بہت بہتر ہو سکتی ہے۔ جلسے، ریلیوں اور دھرنوں کے اس موسم میں عمران خان کا لاہور میں جلسہ پاکستانی سیاست میں ایک نئے باب، نہیں نئے دھرنے کا اضافہ ہوا ہے۔ اس جلسے کی خاص بات کہ اس کا نوٹس بین الاقوامی سطح پر بھی لیا گیا۔ کیونکہ یہ ”آل ان ون“ اور ”ون اگینسٹ آل“ تھا۔ اس میں ہر طبقے کے لوگوں کی نمائندگی تھی اس کے جدید انداز میں پاکستانی عوام کے روایتی اسٹائل کی جھلک تھی۔ جس میں نماز بھی ادا کی گئی اور میوزک کا انتظام بھی کیا گیا۔ شاید عمران کے نزدیک یہی حقیقی ماڈرن اسلامی ریاست ہے۔ عمران خان کے جلسے کو میڈیا نے اچھی کوریج دے کر اُس کا یہ گلہ ختم کر دیا جو اسلام آباد، پشاور اور گوجرانوالہ کے جلسوں، دھرنوں اور ریلیوں میں کیا گیا تھا کہ اُسے میڈیا کوریج نہیں دیتا۔ عمران خان نے ثابت کر دیا کہ وہ صرف کرکٹ میں پرانی گیند کو ریورس سوئنگ کر کے وکٹیں اڑانے کا ماہر نہیں تھا بلکہ 15 سال پرانی سیاسی گیند سے بھی 35 سال پرانی سیاسی وکٹ پر 30 سال سے جمے کسی کو بھی کھلاڑی کو کلین بولڈ کر سکتے ہیں صرف ایمپائر نیوٹرل ہونے چاہئیں۔ اب تو انہوں نے صاف کہہ دیا ہے کہ ”میاں جی بس جان دے او۔۔۔ بس ساڈی واری آن دے او“۔ اپنی باری آنے پر وہ کتنوں کے چھکے چھڑائے گا یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا لیکن عمران خان قسمت کا دھنی اور ذہین کپتان تھا جو یہ بات بخوبی جانتا تھا کہ اگر مخالف ٹیم ایک بار دباؤ میں آ جائے تو فیصلہ اپنے حق میں آنے تک پریشر برقرار رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ عمران خان کی موجودہ سیاسی پرفارمنس سے سب سے زیادہ دباؤ اس وقت بیچاری نون لیگ پر ہے۔ جس کا اندازہ نون لیگ کے رہنماؤں کے بیانات سے لگایا جا سکتا ہے۔ جو کلین بولڈ ہو کر بھی یہ سوچ رہے ہیں کہ شاید ایمپائر اس کو نوبال قرار دے۔ سیاست کے رنگ بھی نرالے ہوتے ہیں کل تک جو اس کو تانگہ پارٹی کہتے تھے اب وہ وقت دور نہیں جب وہ اس تانگے میں سوار ہونے کے لیے ٹکٹ کے منتظر ہوں گے چاہے کرایہ جتنا مرضی ہو......!! دراصل اب لوگ موجودہ نظام سے تنگ آ چکے ہیں اور اس میں تبدیلی کے خواہاں ہیں۔ ان کا یہ خواب ہی عمران خان

کے جلسے کی کامیابی کا راز تھا۔ ویسے ہماری عوام کے آج تک خواب آنکھوں میں ہی ٹوٹتے رہے ہیں۔ اب تو یہ مزید خوابوں کو چکنا چور ہوتے دیکھنے کی سکت بھی نہیں رکھتے۔ ملک میں حقیقی تبدیلی لانے کے لیے ضروری ہے کہ چاروں صوبوں کو ساتھ لے کر چلا جائے۔ بلوچستان کی عوام ابھی تک منتظر ہے کہ ان کا بھی کوئی پرسان حال ہو۔ اسی طرح سیلابی دھرنے اور سیلابی ریلے سے متاثرہ عوام کی مدد کر کے اگر آج اپنا فرض ادا کیا جائے تو کل ان کے ووٹ کے بھی حقدار ہوں گے۔ ریلیاں اور دھرنے جمہوریت کا حصہ ہیں مگر جمہوریت صرف ریلیوں اور دھرنوں میں نہیں۔ اس کے لیے اُس وقت سجدے میں نہیں گرنا چاہیے جب قیام کا وقت ہو۔ عمران بہادر ہے اور بہادر قوم کا لیڈر کوئی بہادر انسان ہی ہو سکتا ہے۔ جو دکھ اور سکھ اپنی زمین پر اپنے لوگوں کے ساتھ اپنے آسمان کے نیچے دیکھے۔ عمران ایسا ہی ہے، وہ ایسا ہی رہے گا کیونکہ تبدیلی نامکمل چیزوں میں آتی ہے۔ جو مکمل ہو جائے وہ تبدیل نہیں ہوتا اور جو تبدیل ہوتا رہے وہ ابھی خود مکمل نہیں ہوتا اُس نے دوسروں کو کیا مکمل کرنا ہوتا ہے۔ اب ہمارے پاس یہ آخری موقع ہے اور اگر ہم نے اس سے بھی فائدہ نہ اٹھایا تو پھر اس کے بعد فائدہ اٹھانے کی ضرورت کیا ہے؟

روزنامہ ”دن“ لاہور 6 نومبر 2011ء

دی نیشن لندن 18 نومبر 2011ء

قابل غور

☆ آج ہم اس مقام پر آ چکے ہیں کہ اگر کسی کو سزا دینا ہو تو اس پر صرف تین ماہ کے لیے یہ پابندی لگا دی جائے کہ وہ جھوٹ، کرپشن اور دھوکہ دہی میں بالکل ملوث نہیں ہوگا۔

☆ سب سے زیادہ کرپشن ہی ان اداروں میں ہوتی ہے جن

کے ذمہ کرپشن کا خاتمہ ہے۔

☆ اگر بدنام ملک کا کوئی "بد" بیرونی ممالک میں "بد فعلی" کرتا پکڑا جائے تو اس "بدبخت" کو کون بچانے آئے گا......؟

☆ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان طلباء سے معافی مانگ کر ان کو ہرجانہ ادا کیا جاتا لیکن ان کو تعلیم مکمل کیے بغیر پاکستان ڈیپورٹ کر دیا گیا جس سے ان کا وقت اور پیسہ دونوں برباد ہوئے۔

☆ ہمارا تو اپنے ملک میں کوئی والی وارث نہیں تو بھلا ان کھلاڑیوں کے پیچھے برطانیہ کس نے آنا تھا......؟

☆ تاریخ بنانے، تاریخ بننے اور تاریخ کا بدنما داغ بننے میں صرف ایمانی جذبے کا ہی فرق ہوتا ہے۔

❁.....❁.....❁

سستی اخبار مہنگی خبر

دنیائے صحافت میں "مستقی خبروں کا سرچشمہ" پاکستان ایک بار پھر ساری دنیا میں بریکنگ نیوز بنا رہا۔ ہمیشہ کی طرح "بریکنگ نیوز" بھی ایسی جو سب پاکستانیوں کے لیے "ہارٹ بریکنگ نیوز" تھی۔ برطانیہ کی "سستی اخبار" دی نیوز آف دی ورلڈ جو اس سال "فون کالز اسکینڈلز" میں ملوث ہونے کی وجہ سے بند کر دی گئی مگر جانے سے پہلے ہمارے کھلاڑیوں کو بہت مہنگی پڑی۔ کرپشن اور دھوکہ دہی کے الزامات میں تین دیسی کرکٹرز کو جسٹس کک نے "ولائتی جیل" کا تحفہ عیدی میں دیکر دنیائے کرکٹ بلکہ سپورٹس کی تاریخ میں پہلی بار کسی کھلاڑی کو "سپاٹ فکسنگ" میں ملوث ہونے کے جرم میں پابند سلاسل کرنے کا حکم صادر کیا۔ اسیرانِ طمع ولالچ اب ولائتی زندان میں بیٹھ کر یہ تو ضرور سوچتے ہونگے کہ آخر ہم نے ایسا کونسا "نیا کام" کر دیا جس کی پاداش میں ہمیں سات سمندر پار رسوائی کا ٹیکہ ماتھے پر لگا کر آہنی سلاخوں کے پیچھے بند کر دیا گیا۔ جس معاشرے کا وہ حصہ ہیں وہاں تو ایسا سلوک ان لوگوں سے کیا جاتا ہے جو ایمانداری کا سبق پڑھانے کی کوشش بھی کرے، سچ بولے یا حق کا ساتھ دینے کی جرات کرے، کرپشن کے خلاف اعلان بغاوت کرے......! اسلامی جمہوریہ پاکستان میں کرپشن، دھوکہ دہی، جھوٹ اور اقربہ پروری ہی تو ہمارے "قومی امتیاز" بن کر سامنے آئے ہیں۔ جو صدر پاکستان سے شروع ہو کر فٹ پاتھ پر ٹھیلہ لگا کر روزی کمانے والے تک پہنچتا ہے۔ آج ہم اس مقام پر آ چکے ہیں کہ اگر کسی کو سزا دینا ہو تو اس پر صرف تین ماہ کے لیے یہ پابندی لگا دی جائے کہ وہ جھوٹ، کرپشن اور دھوکہ دہی میں بالکل ملوث نہیں ہوگا۔ یقیناً اس ملک میں ان تین خوبیوں کو بروئے کار لائے بغیر تین ماہ گزارنے کا عمل ہی سب سے سخت سزا ہوگی۔ بد قسمتی سے یہ "صفات" اب ہماری فطرت کا حصہ بنتی جا

رہی ہیں یہی وجہ ہے کہ ملک سے باہر جا کر بھی ہم جانے، ان جانے میں کچھ ایسا کر بیٹھتے ہیں جس کے منظر عام پر آنے سے ہماری جگ ہنسائی ہوتی ہے۔ ان کھلاڑیوں نے بھی وہی کیا جو اس ملک میں تقریباً سب ہی کر رہے ہیں۔ اس میں وہ اکیلے ہی قصور وار نہیں بلکہ سارا معاشرہ ہی قصور وار ہے جو ایسے نظام کو پروان چڑھانے کا ذمہ دار ہے۔ آج اگر ہمارے سلطان کرپشن کے بے تاج بادشاہ ہیں تو ان کو مسلط کرنے والے بھی ہم خود ہیں۔ اب تو ملک کا کوئی ادارہ ایسا نہیں جس کو کرپشن سے پاک تصور کیا جا سکے۔ سب سے زیادہ کرپشن ہی ان اداروں میں ہوتی ہے جن کے ذمہ کرپشن کا خاتمہ ہے۔ لہٰذا میرے نزدیک کسی کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ ان کھلاڑیوں پر انگلی اٹھائے کیونکہ اگر ہم خود احتسابی کی اخلاقی جرات کا مظاہرہ کریں تو ہم میں سے شاید کوئی اس قابل نہیں جو یہ دعوی کر سکے کہ اس نے کبھی کوئی ایسا کام نہیں کیا۔ جسٹس کک نے عامر کا دیہاتی اور خاندانی پس منظر، تعلیم اور عمر کی کمی کو فیصلے میں ملحوظ نظر رکھا اور اس کا ذکر بھی کیا مگر اس کو یہ بھی دیکھنا چاہیے تھا کہ جیسے کئی چیزیں ولائتی معاشرے میں جائز ہیں مگر ہمارے ملک میں ناجائز......ایسے ہی کئی چیزیں ایسی بھی ہیں جو ہمارے معاشرے میں اب جائز بن چکی ہیں اور برطانوی سماج میں ناجائز تصور کی جاتی ہیں۔ جسٹس کک کے سخت ریمارکس اور زیادہ سے زیادہ سزا دینے پر کچھ حلقوں میں یہ بازگشت سنائی دے رہی ہے کہ "برطانوی جج" نے قومی ہیروز کے ساتھ ناروا سلوک کیا۔ اگر کوئی برطانیہ، بھارت، ساؤتھ افریقہ یا آسٹریلیا کا کھلاڑی اس جیسے فعل میں ملوث پایا جاتا تو اس کو یقیناً اتنی سخت سزا نہ ملتی۔ ماضی میں اظہر الدین، اے جدیجہ، منوج پربھارکر، سرینش راتنا، ہنسی کرونیئے، ہرشلے گبز، شین وارن، وغیرہ بھی ایسے الزامات کی زد میں آ چکے ہیں مگر ان کو اتنی کڑی سزائیں نہ سنائی گئیں۔ یہ بھی سب کو پتہ ہے کہ کرکٹ میں جوا مافیا کا اڈا بھارت میں ہے۔ اس کو بڑے بڑے ڈان اور بھائی لوگوں کی سرپرستی بھی حاصل ہے۔ مگر ہم کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہم پاکستانی ہیں۔ "بد سے بدنام برا" ہمارا نام پہلے ہی بدنام ہے چاہے وہ کرپشن، دھوکہ دہی کی وجہ سے ہو یا دہشت گردی کی وجہ سے......! اگر

بدنام ملک کا کوئی "بد" بیرونی ممالک میں "بدفعلی" کرتا پکڑا جائے تو اس "بدبخت" کو کون بچانے آئے گا......؟ ہمارے چند طلباء کو کچھ عرصہ قبل برطانیہ میں صرف شبہ کی بنیاد پر گرفتار کیا گیا۔ جن پر دہشت گرد ہونے کے الزامات لگائے گئے جو بعد میں ثابت نہ ہو سکے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان طلباء سے معافی مانگ کر ان کو ہرجانہ ادا کیا جاتا لیکن ان کو تعلیم مکمل کیے بغیر پاکستان ڈیپورٹ کر دیا گیا جس سے ان کا وقت اور پیسہ دونوں برباد ہوئے۔ اس وقت اگر حکومتی سطح پر خلوص نیت سے دلچسپی لی جاتی تو آئندہ کسی دوسرے پاکستانی پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے کوئی ضرور سوچتا۔ ہمارے ملک میں اگر کوئی غیر ملکی سر عام قتل و غارت گری بھی کرے تو اس کو سفارت کا رکہہ کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ہمارا تو اپنے ملک میں کوئی والی وارث نہیں تو بھلا ان کھلاڑیوں کے پیچھے برطانیہ کس نے آنا تھا......؟ جو اس ادارے کے چیئر مین تھے اگر وہ برطانیہ آ کر معافی نامہ نہ پڑھتے تو شاید ان کھلاڑیوں سے پہلے اعجاز بٹ صاحب بھی ولائتی جیل کا مزہ چکھ چکے ہوتے۔ پاکستان کرکٹ بورڈ ہی بس ایسا ادارہ بچا تھا جس میں کچھ پیسہ ہے، جس پر کرپشن مافیا نے نظریں گاڑھ رکھی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ بین الاقوامی طور پر متنازعہ شخصیت کے حامل اعجاز بٹ کو چیئر مین برقرار رکھا گیا کیونکہ وہ صدر زرداری صاحب کے منظور نظر تھے۔ لہٰذا اس ادارے کو بھی پی آئی اے، ریلوے، پاکستان اسٹیل مل، رینٹل پاور، جیسا بنانے کے لیے ضروری تھا کہ اس کا ہیڈ ہی ایسا ہو جس کی سوچ کا معیار ہی کھاؤ اور کھلاؤ ہو......!!!

اب اپنی برائی کو سازش کا نام دے کر خود کو دھوکہ دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ فرض کریں یہ سازش بھی ہے تو جال میں ہمیشہ وہی طائر پھنستا ہے جو "دانے" کا لالچ کرتا ہے۔ آخر کب تک ہم سازشوں کا شکار ہوتے رہیں گے؟ ایک با کردار اور سچے انسان کا انجام کبھی رسوائی نہیں ہوتا۔ اس کے خلاف چاہے سارا زمانہ ہی سازشیں کر لے اگر اس کا ایمان پختہ ہے تو وہ ہر امتحان میں سرخرو ہو کر تاریخ بنا دیتا ہے۔ اگر ایمان کمزور ہو تو انجام رسوائی اور ذلت ہوتا ہے اور تاریخ میں ایک بدنما حصہ بن کر رہ جاتا ہے۔

تاریخ بنانے، تاریخ بننے اور تاریخ کا بدنما داغ بننے میں صرف ایمانی جذبے کا ہی فرق ہوتا ہے۔ یہ تو تین کھلاڑیوں سے ہوا ہے اگر ہم نے اب بھی نہ سیکھا تو ہم سب تاریخ میں بدنما داغ بن کر رہ جائیں گے لیکن آج کل پاکستانی بچوں کو بتایا جا رہا ہے کہ داغ تو اچھے ہوتے ہیں۔

روزنامہ "دن" لاہور 10 نومبر 2011ء

دی نیشن لندن 2011ء

قابل غور

☆ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں اکثریت مسلمانوں کی اور اقلیت جنونی مسلمانوں کی ہے۔یہ دنیا کی واحد ریاست ہے جس میں بسنے والی اکثریت اوراقلیت تھوڑے سے فرق کے ساتھ ایک ہی مذہب سے تعلق رکھتی ہے۔

☆ خنزیر کھانے والوں میں آج تک کبھی قبر کھود کر لاشوں کے ساتھ جنسی تسکین پوری کرنے کا شرمناک واقعہ نہیں دیکھا گیا۔

☆ مگر اس وقت کے ڈکٹیٹر حکمران کا قریبی رشتہ دار ہونے کی وجہ سے اس کو ذہنی مریض قرار دے کر چھوڑ دیا گیا۔

☆ میں آج یہ سوچنے پر مجبور ہوں کے چودہ سو برس قبل وہ کفار جن کے عہد کو دورِ جہالیت کہا جاتا ہے وہ تو صرف بیٹیوں کو زندہ دفن کرتے تھے لیکن یہ کیسی قوم ہے جو مردہ بیٹیوں کو قبروں سے نکال کر اُن کے ساتھ زنا کی مرتکب ہو رہی ہے؟

☆ اگر ہم نے اب بھی نہ سیکھا تو ہم سب تاریخ میں بدنما داغ بن کر رہ جائیں گے لیکن آج کل پاکستانی بچوں کا بتایا جا رہا ہے کہ داغ تو اچھے ہوتے ہیں۔

جہالت کی "وحشت گردی"

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات اور قابل عمل دین ہے۔جس کی تعلیمات میں زندگی کے تمام امور کے اصول،قوانین اور ضوابط وضع کیے گئے ہیں۔جن پر عمل پیرا ہو کر ہم چاہیں تو دنیا اور آخرت دونوں سنوار سکتے ہیں۔اس عالم گیر دین کی یہ اعلیٰ ترین خوبی ہے کہ اس میں انسان کو اچھے برے،حلال و حرام میں تمیز بتائی گئی ہے۔اللہ تعالیٰ نے برائی اور حرام چیزوں سے اپنے نفس عمارہ کو بچا کر جہاد کرنے کا حکم دیا ہے۔ان حرام چیزوں میں شراب اور خنزیر بھی شامل ہیں۔شراب کے استعمال سے صرف صحت کا نقصان ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے نشے میں دھت ہو کر انسان میں حیوانیت آ جاتی ہے۔اپنے پرائے، اچھے برے اور دوست دشمن تک کی تمیز بھول جاتا ہے جس سے انسان برائی کی طرف راغب ہوتا ہے۔اسی طرح خنزیر کا گوشت بھی مضر صحت ہے اس کو کھانے والے میں اس کی فطرت اور خواص سرایت کر جاتے ہیں۔ہر شے دنیا میں اپنی فطرت کے تابع ہوتی ہے۔ماحول، آب و ہوا، خوراک، تہذیب و تمدن، علاقائی رسم و رواج بھی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہے۔خنزیر کی فطرت ہے کہ وہ غلیظ اور ناپاک ہے، کھانے میں دنیا کی ہر چیز حتیٰ کہ اپنا فضلہ تک کھا جاتا ہے مگر آفرین ہے ان پر جو اس کو بھی کھا جاتے ہیں۔آج مغربی معاشرے میں بہت سی برائیوں میں خنزیری صفات کی جھلک نظر آتی ہے۔اسلامی جمہوریہ پاکستان اکثریت مسلمانوں کی اور اقلیت جنونی مسلمانوں کی ہے۔یہ دنیا کی واحد ریاست ہے جس میں بسنے والی اکثریت اور اقلیت تھوڑے سے فرق کے ساتھ ایک ہی مذہب سے تعلق رکھتی ہے۔سب اسی کرپٹ نظام کا حصہ ہیں جہاں حرام کرنا یا حرام کھانے میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔مگر "خنزیر" کے معاملے میں سارے یکجا ہو کر اس پر "لعنت" بھیجتے ہیں۔مگر جب ہمارے اعمال کو دیکھا جائے تو

اس میں ایسے کئی "افعال" جھلکتے ہیں جو نہ تو "خنزیر" میں نظر آتے ہیں اور نہ خنزیر کھانے والوں میں......!خنزیر یا خنزیر کھانے والوں میں آج تک کبھی قبر کھود کر لاشوں کے ساتھ جنسی تسکین پوری کرنے کا شرمناک واقعہ نہیں دیکھا گیا۔حال ہی میں وطن عزیز میں قبروں سے عورتوں کی لاشوں کو نکال کر ان کی بے حرمتی کرنے کا واقعہ منظر عام پر آیا، پھر اسی شہر میں قبروں سے معصوم بچوں کی لاشوں سے اعضاء کی چوری کا سانحہ بھی رونما ہوا۔اس نوعیت کے متعدد واقعات پہلے بھی رونما ہو چکے ہیں۔آج میڈیا اتنا متحرک ہو چکا ہے کہ ایک منٹ میں خبر ساری دنیا میں پھیل جاتی ہے۔1987ء میں وزیر آباد میں اسی نوعیت کا واقعہ ہوا تھا جب ایک جنونی عاشق نوجوان نے ایک لڑکی کو دفن ہونے کے کچھ دیر بعد قبر سے نکال کر اس کی لاش سے اپنی جنسی ہوس پوری کی۔مگر اس وقت کے ڈکٹیٹر حکمران کا قریبی رشتہ دار ہونے کی وجہ سے اس کو ذہنی مریض قرار دے کر چھوڑ دیا گیا۔ہمارے ملک میں زندہ لڑکیوں کو دفن بھی کیا گیا، مردہ لڑکیوں سے زیادتی بھی کی گئی، زندہ انسانوں کو ہلاک کر کے ان کا گوشت کھانے والے وحشی "آدم خور" بھی منظر عام پر آئے۔یہاں تک کے قبروں سے مردے نکال کر انہیں پکا کر کھانے والے ملزمان بھی میڈیا نے پیش کر دیے، کتوں کا گوشت بیچنے والے قصاب بھی پکڑے گئے، معصوم بچوں سے زیادتی کے بعد ان کی لاشیں کوڑے کے ڈھیر پر بھی ملیں، نومولود بچوں کا ہسپتال سے اغواء ہوا، جادو ٹونے کرنے والے نام نہاد عامل بھی دیکھے گئے جو اپنی دکان داری چمکانے کے لیے جاہل اور بے شعور لوگوں کو انسانی اعضاء لانے کا کہتے ہیں۔جس کے حصول کے لیے کچھ لوگوں نے اپنے خونی رشتے داروں کے معصوم بچوں کا خون بہانے میں بھی دریغ نہ کیا۔اگر ایسے لوگوں کو ذہنی مریض قرار دے کر رہا کرنے کی بجائے ان کو سخت سزا دے کر عبرت کا نشان بنایا جائے تو آئندہ ایسے کئی مریض اس مرض میں مبتلا ہونے سے پہلے اپنے انجام کا سوچ کر ہی "صحت مند" رہنے میں اپنی عافیت سمجھیں گے۔یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کوئی ذی شعور انسان ایسا مکروہ اور گھناؤنا فعل کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔یہ حرص، ہوس اور خواہش کی تکمیل کا جنون ہی ہوتا ہے

جوان کو اس حد تک لے جاتا ہے جہاں پر انسانیت ختم ہو جاتی ہے۔ دیکھا جائے تو ہر برائی کے پیچھے ذہنی ہیجان کا مرض ہی کارفرما ہوتا ہے۔ کوئی دولت کی خاطر کسی بھی حد کو پار کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے، کوئی شہرت کی بلندیوں کو چھونے کی خاطر لاشوں کے مینار پر بھی کھڑا ہونے سے نہیں گھبراتا۔ کوئی جھوٹی شان و شوکت، رعب و دبدبے کے لیے ظلم و بربریت کی انتہاء کرنے کو عیب محسوس نہیں کرتا۔ کوئی جنسی ہوس کی تسکین کے لیے زندہ تو درکنار مردہ کو بھی نہیں چھوڑتا۔ ان تمام مریضوں کو کسی بھی قسم کا کوئی قانونی استثناء نہیں ہونا چاہیے۔ مغربی معاشرے میں جہاں جنسی بے راہ روی عام سی بات ہے مگر یہاں پر جنسی آزادی کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی کسی سے زبردستی کرے۔ اس میں تو بیوی کی رضامندی کے بغیر میاں جی بھی ہاتھ لگا دیں تو بیوی کی شکایت پر میاں پر قانونی چارہ جوئی ہو جاتی ہے۔ کم عمر اور نابالغ کو بھی قانونی تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ میں آج یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ چودہ سو برس قبل وہ کفار جن کے عہد کو دورِ جہالیت کہا جاتا ہے وہ تو صرف بیٹیوں کو زندہ دفن کرتے تھے لیکن یہ کیسی قوم ہے جو مردہ بیٹیوں کو قبروں سے نکال کر اُن کے ساتھ زنا کی مرتکب ہوتی ہے؟ کیا یہ اُن جاہل کفار سے بھی گئے گزرے ہیں؟ کیا ہمارا ذہنی سفر آگے کے بجائے پیچھے بلکہ بہت پیچھے غار کے زمانے سے بھی پہلے انسان کی طرف جا رہا ہے۔ جہاں مذہب، اخلاقیات، انسانیت، معاشرہ، ریاست اور دوسرے اداروں جیسے کوئی نام نہ تھے؟ زندہ لوگوں کی تو بات ہی کیا ہمارے ہاں تو مردہ بھی محفوظ نہیں رہے اور خدا جانے کہ آنے والے دنوں میں ہمیں ابھی اور کیا کیا دیکھنا پڑے گا۔ کچے اور پکے گوشت کی حرص اور ہوس میں کچھ لوگ پستی کی اس انتہاء کو پہنچ جاتے ہیں جہاں حیوانیت بھی شرمسار ہو جاتی ہے۔ علمی پستی کی وجہ سے ہم کب تک جہالت کے اندھے کنویں کے مینڈک بنیں رہیں گے؟ دہشت گردی کے خلاف دنیا کے مہذب لوگ جنگ لڑنے اور جیتنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں لیکن سوال تو یہ ہے کیا تعلیم عام کیے بغیر کسی بھی قسم کی "گردی" کا خاتمہ ممکن ہے تو اس کا جواب یقیناً نفی میں ہو گا لیکن ابھی ان عالمی شعبدہ بازوں کی بصارت اور بصیرت اپنے مفادات سے

آگے نہیں دیکھ پا رہی۔ ہمارے ملک میں دہشت گردی کے خلاف جنگ لڑی جا رہی ہے جس میں آج تک 35 000 افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔ مگر "جہالت کی دہشت گردی" کے خلاف آج تک جنگ کا اعلان نہیں کیا گیا جس سے سارا ملک متاثر ہو رہا ہے۔ جہالت اور بے شعوری کی وجہ سے ہم اپنے پرائے، اچھے برے، حرام حلال میں تمیز نہیں کر پا رہے ہماری جہالت سے ایک خاص طبقہ فائدہ اٹھا رہا ہے جو یہ نہیں چاہتا کہ عوام میں شعور بیدار ہو کیونکہ اس طرح ان کی حکمرانی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ جہالت ہی ہماری ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ہم اسلامی تعلیمات کے نور سے محروم ہو کر جہالت کے اندھیرے میں بے راہ روی کا شکار ہیں۔ اتنا وقت اور سرمایہ ہم نے دفاعی نظام کو مضبوط اور بہتر بنانے میں خرچ کیا مگر پھر بھی ہم آج دہشت گردی کی لپیٹ میں ہیں۔ اگر کچھ توجہ ہم نے جہالت دور کرنے میں کی ہوتی تو آج ہم اتنے باشعور ضرور ہو چکے ہوتے کہ ہم "دہشت گردی" کا شکار نہ بنتے۔ پاکستان کے موجودہ حالات اور نظام میں ایک عام انسان کے لیے زندگی ایک عذاب بن گئی ہے۔ کسی کے فوت ہو جانے پر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ بیچارے کی عذاب زندگی سے جان چھوٹ گئی۔ کیونکہ قبر میں جا کر اپنے اعمال کا جواب دہ ہونا پڑتا ہے مگر دنیا خاص طور پر پاکستان میں تو غریب عوام کو ہر پل ناکردہ گناہوں کی سزا ملتی ہے۔

مرنے والے کی خاموشی یہ ظاہر کرتی ہے ..... کہ عذاب قبر سے بڑھ کر ہے عذاب زندگی اب تو ہمارے ملک میں مرنے والوں کو بھی چین کی ابدی نیند سے محروم کیا جا رہا ہے۔ شاید اسی موقع کے لیے غالب نے کہا تھا کہ

اب تو گھبرا کہ یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے؟

اگر ایسا ہی چلتا رہا اور اس کا سدباب نہ کیا گیا تو وہ دن دور نہیں جب قبرستانوں سے سارے مردے اٹھ کر کوئی احتجاجی ریلی نکال رہے ہوں گے۔ اگر انہوں نے ملک میں دھرنا دے دیا تو تل دھرنے کی جگہ نہیں ہو گی۔ قانون نافذ کرنے والے

اداروں کو اب اس بارے میں بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔اس کی بنیاد ہی جہالت پر ہے۔لہٰذا عوام میں شعور بیدار کرنے کے لیے موجودہ تعلیمی نظام کو بہتر کیا جائے لیکن اُسے بہتر کرنے سے "سیانے حکمرانوں" کی اپنی دکانداری بند ہونے کا سو فیصد روشن امکان ہے۔سو ابھی بہتر نظام تعلیم اور نصاب تعلیم اُن کی پالیسی میں شامل نہیں ہے لیکن افسوس کہ اس کے سوا اس دہشت گردی کے خاتمے کا کوئی دوسرا طریقہ بھی نہیں ہے۔ ہماری افسر شاہی اور نوکر شاہی سب دوسرے طریقوں سے بخوبی واقف ہیں لیکن تعلیم کے لیے جب بھی کوئی کوشش صرف اس سماج کی بہتری کے لیے کرنا ہوگی تو صرف اور صرف ایک نمبر اور ایک ہی طریقے سے ممکن ہے۔ورنہ ہمیں اس دن کا انتظار کرنا چاہیے جب ہم اپنی ہی جہالتوں کی وجہ سے کسی دن اپنی کسی بڑی حماقت کے پاؤں تلے روندے جائیں گے یا پھر اس طرح کے بدترین، خوفناک اور مکروہ افعال کے نتیجہ میں قدرت کی طرف سے ہمیں کسی سزا کا سامنا کرنا ہوگا۔یا پھر قدرت یہ سب کچھ ہمیں سزا کے طور پر ہی دکھا رہی ہے اور ہم اس کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔

روزنامہ "دن" لاہور 14 نومبر 2011ء

دی نیشن لندن 25 نومبر 2011ء

قابلِ غور

☆ دنیا کے بڑے تہذیب یافتہ ممالک سے سرمایہ دارانہ نظام کیخلاف اٹھنے والی لہر آہستہ آہستہ ایک تحریک کا روپ دھارتی جا رہی ہے کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام متوسط طبقے کو برق رفتاری سے غربت کے تحت الثریٰ میں دفن کرنے لے جا رہا ہے۔

☆ اس سال اگست میں ہونے والے برطانیہ کے فسادات نے یہ ثابت کر دیا کہ عوام خاص طور پر نوجوان نسل موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کی وجہ سے اپنے حال اور مستقبل سے اس قدر مایوس ہو چکی ہے کہ وہ لوٹ مار پر اتر آئی ہے۔بھوک آداب کے سانچوں میں ڈھلنے کے بجائے برطانیہ کے کوچ و بازار میں وحشیانہ رقص کرنا شروع ہوگئی۔

☆ اب تو برطانیہ میں صرف پاکستان کے بالا دست طبقات کے لوگوں کے بچے ہی تعلیم حاصل کر سکیں گے کل تک جنھوں نے مشترکہ ہندوستان کے مضبوط ترین پرائمری سکول سسٹم بنایا تھا جب مفادات بدلے تو انہوں نے تعلیم کیلئے اپنے پرانے غلاموں کیلئے بھی اپنے ملک کے دروازے بند کرنے کی پالیسی تیار کر لی۔

برطانوی پولیس کا رویہ ایشیائی باشندوں کے حوالے سے انتہائی ہتک آمیز ہے

دنیا کے معاشی نظام کی ناؤ سرمایہ دارانہ نظام کے بھنور میں اتنی پھنس چکی ہے کہ اس کا مزید آگے بڑھنا تو دور کی بات اب یہاں سے نکالنا بھی ناممکن دکھائی دے رہا ہے۔دنیا کے بڑے تہذیب یافتہ ممالک سے سرمایہ داررانہ نظام کے خلاف اٹھنے والی لہر آہستہ آہستہ ایک تحریک کا روپ دھارتی جا رہی ہے کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام متوسط طبقے کو برق رفتاری سے غربت کے تحت الثریٰ میں دفن کرنے لے جارہا ہے۔امریکہ میں وال سٹریٹ پر قبضے کی تحریک بھی اس نظام کے خلاف اٹھنے والی آواز کی ایک کڑی ہے۔جس میں شریک افراد نے حکومتی ہتھکنڈوں اور شدید سرد موسم کے آگے بھی ہتھیار نہ ڈال کر اپنے مضبوط اور ناقابلِ شکست ارادوں کا مظاہرہ کر کے دنیا کے دوسرے ممالک پر اس کے مثبت اثرات مرتب کیے ہیں جو امریکہ سے لے کر برطانیہ اور جو کچھ اس کے درمیان میں ہے، تک محسوس کیے گئے ہیں۔برطانیہ میں گزشتہ سال یونیورسٹیوں اور کالجوں کی ٹیوشن فیسوں میں تین گنا اضافے کے خلاف لندن میں بھرپور مظاہرے کیے گئے۔جب حکومت نے مطالبات تسلیم نہ کیے تو نرم احتجاجی مظاہرے توڑ پھوڑ، فسادات اور پُرتشدد احتجاج میں تبدیل ہو گئے۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فیسیں تو کم نہ ہوئیں البتہ سینکڑوں طلباء کو گرفتار کر کے ان مظاہروں کا خاتمہ کر دیا گیا اور یوں وقتی طور پر ریاستی جبر نے اپنے تمام ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے ان مظاہرین کو منتشر کر دیا۔اس سال اگست میں ہونے والے برطانیہ کے فسادات نے یہ ثابت کر دیا کہ عوام خاص طور پر نوجوان نسل موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کی وجہ سے اپنے حال اور مستقبل سے اس قدر مایوس ہو چکی ہے کہ وہ لوٹ مار پر اتر آئی ہے۔بھوک آداب کے سانچوں میں کہاں ڈھلتی ہے سو برطانیہ کے کوچ و بازار میں وحشیانہ رقص کرنا شروع ہوگئی۔ان فسادات میں

پکڑے جانے والوں کے جب انٹرویو کیے گئے تو انھوں نے حالات اور نظام کو اس کا ذمہ دار قرار دیا جس کی وجہ سے وہ لوگ غیر یقینی صورتحال، خوف، اضطراب، پریشانی اور ہیجان کی اس کیفیت میں مبتلا ہوتے جا رہے تھے کہ اپنی بنیادی خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے ان کے قدم مجرمانہ افعال کرنے پر مجبور ہو گئے۔ 9 نومبر 2011ء کو بھی طلباء نے فیسوں اور بجٹ کٹوتیوں کے خلاف ایک بھرپور احتجاج کرنے کی کوشش کی جس میں 10 ہزار سے زائد افراد نے شرکت کی۔ برطانوی پولیس نے ٹیوشن فیسوں میں اضافے کے خلاف احتجاجی مارچ کرنے والے طلباء کی جانب ٹریفالگر اسکوائر میں کیمپس لگا کر دھرنا دینے کی کوشش ناکام بنا دی۔ طلباء کے کیمپس کو پولیس نے اکھاڑ کر پھینک دیا اور مزاحمت کرنے والے 30 طلباء کو گرفتار بھی کر لیا۔ دراصل اس مرتبہ احتجاجی کال دینے پر پولیس نے اس سے نپٹنے کے لیے پہلے سے حکمت عملی طے کر رکھی تھی۔ پولیس والوں کو بھی بتا دیا گیا تھا کہ اس بار ہنگامی حالات سے نپٹنے کے لیے بوقت ضرورت ربڑ کی گولیاں بھی چلائی جا سکتی ہیں جن کو چلانے کی اجازت مخصوص پولیس آفیسرز کو دے دی گئی تھی۔ ڈیوڈ کیمرون نے بھی انتہائی ہنگامی حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے پولیس کے ربڑ کی گولیاں چلانے کی حمایت کر دی تھی۔ حالیہ احتجاجی مظاہروں کو ناکام بنانے میں اسکارٹ لینڈ یارڈز کی معاونت کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ ان حالات میں تو ایسا لگتا ہے کہ اب یہاں بھی تعلیم غریب یا متوسط افراد کی دسترس میں نہیں رہی۔ اگر یہاں کے مقامی لوگ اس اضافے کو برداشت نہیں کر سکتے تو غریب ملکوں کے غریب اور ہونہار طالب علموں کے لیے یہاں کے تعلیمی اداروں کے دروازے بالکل بند ہو جائیں گے۔ پہلے تو یہاں غریب ممالک کے ہونہار طالب علم میرٹ پر ایڈمشن لے کر پڑھائی کے لیے آ جاتے تھے۔ اپنا خرچہ پڑھائی کے ساتھ کام کر کے پورا کر لیتے تھے مگر موجودہ حکومت کی پالیسی اور نئی ترامیم سے طلباء کے کام کرنے کے دورانیے کو اتنا محدود کر دیا گیا ہے کہ اب وہ کام کر کے فیس بھی ادا کرنے کے قابل نہیں رہے۔ برطانیہ میں صرف پاکستان کے بالا دست طبقات کے لوگوں کے بچے ہی تعلیم حاصل کر سکیں گے، کل تک

جنھوں نے مشترکہ ہندوستان کے مضبوط ترین پرائمری سکول سسٹم بنایا تھا جب مفادات بدلے تو انہوں نے تعلیم کیلئے اپنے پرانے غلاموں کیلئے بھی اپنے ملک کے دروازے بند کرنے کی پالیسی تیار کر لی مگر ایسا کرتے ہوئے شاید انہوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ گلوبل دنیا میں کسی دوسرے ملک کے بچوں کو تعلیم کیلئے اپنے ملک میں آنے سے روکنے کیلئے اگر تعلیم کو مہنگا کیا گیا تو اس کے اثرات اُن کے اپنے معاشرے پر بھی مرتب ہوں گے اور ایسا ہی ہوا۔ موجودہ پالیسی اور ترامیم سے سب سے زیادہ نقصان ساؤتھ ایشیاء سے آنے والے طلباء کا ہوا ہے۔ کئی پرائیویٹ اداروں کو ڈگری دینے کے اختیارات دینا بھی سرمایہ دارانہ نظام کو تقویت دینا ہے۔ برطانیہ میں یونیورسٹی اور کالجز معاشی نظام کے پہیے میں محور کا کردار ادا کرتے ہیں کیونکہ ساری دنیا سے لوگ یہاں تعلیم حاصل کرنے آتے ہیں مگر حالیہ ترامیم اور فیسوں میں اضافے سے سرمایہ داروں کی اولادوں کو ہی پڑھنے لکھنے کے مواقع میسر آئیں گے۔ دیکھنا یہ ہے آخر کب تک غریبوں کے حقوق کو طاقت کے بل بوتے پر سلب کیا جاتا رہے گا؟

اسی سال برطانیہ میں موسم گرما کی تعطیلات کے دوران موسم بڑا ٹھنڈا اور خشک تھا کہ اس میں اچانک ایسی آگ لگی کہ دیکھتے ہی دیکھتے پورا دارالحکومت اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ ایسٹ لندن سے اٹھنے والی اس چنگاڑی کو چند موقع شناس اور مجرمانہ صفات کے حامل افراد نے انتشار کی ایسی ہوا دی کہ فسادات، لوٹ مار، لاقانونیت کی یہ آگ برطانیہ کے دوسرے شہروں میں بھی پہنچ گئی۔ ان میں کچھ عادتاً اور فطرتاً تاثیرے تھے، کچھ پیشہ ور اور کچھ شوقیہ جو صرف تفریح کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ سب نے مل کر اور دل کھول کر لوٹ مار کی۔ جس سے یہاں کی انشورنس کمپنیوں کا بھی اچھا خاصا نقصان ہوا۔ ایک عرصہ تک دنیا کے ایک بڑے حصے پر حکومت کرنے والے گوروں کو مٹھی بھر بگڑے ہوئے نوجوانوں کو قابو کرنے میں تین دن لگ گئے۔ اس کے لیے کئی بڑی سیاسی شخصیات کو اپنی چھٹیاں منسوخ کر کے وطن واپس آنا پڑا۔ ساری برطانوی پولیس کی چھٹیاں فوری منسوخ کر کے ڈیوٹی پر حاضر ہونے کا حکم بھی جاری کیا گیا۔ دارالحکومت میں صورت حال

کو قابو میں لانے کے لیے 16ہزار اضافی پولیس والوں کو لندن میں بلانا پڑا۔ابتدائی تخمینے کے مطابق اس میں 200 ملین پاؤنڈ سے زیادہ کا نقصان ہوا۔اس میں تین پاکستانیوں سمیت پانچ افراد کی ہلاکت بھی ہوئی۔حیرانگی کی بات یہ ہے کہ ان پاکستانیوں کی ہلاکت کی خبر کو مقامی میڈیا میں کوئی خاص جگہ نہ دی گئی۔اگر خدانخواستہ کوئی ایک بھی پاکستانی کسی ہلاکت میں مشکوک بھی پایا جاتا تو اس کا چرچا ویسے ہی ہوتا تھا جیسے دو سال قبل چند بے گناہ پاکستانی طالب علموں کو کمانڈو ایکشن کر کے گرفتار کرنے کے بعد ان کی میڈیا پر خوب تشہیر کر کے واپس وطن ڈیپورٹ کر دیا گیا حالانکہ ان پر کوئی جرم بھی ثابت نہ ہو سکا تھا۔ان بے چاروں کو تعلیم بھی مکمل نہ کرنے دی گئی۔برمنگھم میں ہلاک ہونے والے ان نوجوان پاکستانیوں کے لواحقین سے اعلیٰ حکام کی طرف کوئی رابطہ بھی دیکھنے میں نہ آیا۔اس موقع پر پاکستانی کمیونٹی کے تمام لارڈز، ایم پیز اور پاکستانی ہائی کمشنر نے ساری کمیونٹی سے پر امن رہنے اور قانون ہاتھ میں نہ لینے اور حکومت سے تعاون کی اپیل کی۔سب سے زیادہ قابل ستائش بات یہ کہ مقتولین کے ورثاء نے بھی ساری کمیونٹی سے درخواست کی کہ ایسا کوئی کام نہ کیا جائے جس سے پاکستانی قوم کا نام منفی الفاظ میں آئے۔تینوں مقتولین کے نماز جنازہ میں ہزاروں سوگواروں جن میں حکومتی عہدیداروں کے علاوہ کمیونٹی کے ہر طبقے نے شرکت کی۔پولیس نے سات افراد کو ان کے قتل کے شبہ میں گرفتار کیا ہے۔اب تک ان ہنگاموں میں ملوث ایک ہزار سے زیادہ افراد پر فرد جرم عائد کی جا چکی ہے۔

ان ہنگاموں کا آغاز ایک 29 سالہ سیاہ فام شخص کو پولیس کی گولی لگنے سے ہلاک ہونے پر ہوا جب ٹوٹن ہیم کے تھانے کے آگے تقریباً دو سو افراد احتجاج کر رہے تھے۔ان کا مطالبہ تھا کہ کوئی سینئر پولیس آفیسر اس کا جواب دے۔ان کے مطابق یہ دو طرفہ فائرنگ نہیں تھی بلکہ یک طرفہ پولیس کی زیادتی تھی۔اسی دوران موقع کا فائدہ اٹھانے والے جرائم پیشہ نوجوانوں نے جلاؤ، گھیراؤ، لوٹ مار اور توڑ پھوڑ کا بازار گرم کرنا شروع کر دیا۔ کچھ دیسی مبصرین نے اس کو کراچی کے موجودہ واقعات سے تشبیہ دی۔ویسے کراچی کا مقابلہ لندن سے کسی بھی طرح نہیں کیا جا سکتا کیونکہ کراچی کی تو فضا

ہی بارودی ہو چکی ہے۔جتنی لاشیں ادھر ایک دن میں گرتی ہیں اتنی ہلاکتیں تو 7/7 کے تاریخی دہشت گردی کے واقعے میں نہیں ہوئیں تھیں۔ادھر تو حالات کو معمول پر لانے کے لیے تمام بڑی سیاسی شخصیات اپنی چھٹیاں منسوخ کر کے وطن واپس لوٹے جبکہ ہمارے ہاں تو اس سے کہیں ابتر حالات ہیں اور ہمارے سیاسی اکابرین تو رہتے ہی چھٹیوں پر ہیں۔ادھر تو فسادات کی وجہ سے صرف کلب لیول کے میچوں کو منسوخ کرنا پڑا۔اس کے بعد بڑے پر امن ماحول میں انڈیا سے ٹیسٹ میچ بھی کروا دیا گیا۔ہمارے ہاں تو کھیل کا کوئی مقابلہ تو ممکن نہیں مگر جھوٹے پولیس مقابلے اور خونی ہولی کھیلنے کے مقابلے عروج پر پہنچتے جا رہے ہیں۔سیاسی قائدین کو کراچی کے حالات کی اتنی فکر نہیں جتنی فکر حکومتی جوڑ توڑ کرنے کی ہے۔کرسی بچاؤ تے عوام مرواؤ ------ کی پالیسی جاری ہے۔کراچی کے حالات کو برطانوی اخباروں نے پر لیثر لگر کہا ہے۔جہاں پر حکومت ٹارگٹ کلرز پر صرف نظر رکھ کر ہی وقت گزار رہی ہے۔کچھ ولائتی مبصرین نے اس کو نومبر 2005ء میں ہونے والے فرانس کے فسادات کی طرح خیال کیا مگر وہاں پر حکومت کو ایمرجنسی نافذ کرنا پڑی تھی جسے پارلیمنٹ کے اجلاس میں مزید چار ہفتے کی توسیع کرنا پڑی تھی۔یہ اس نوعیت کا پہلا واقعہ نہیں تھا جو برطانیہ میں وقوع پزیر ہوا ہو۔اس سے پہلے بھی اس قسم کے متعدد واقعات میں برطانیہ کے مختلف علاقے میدان جنگ کا منظر پیش کر چکے ہیں۔اپریل 1979ء کو ساؤتھ ہال لندن میں جہاں گورے اقلیت میں ہیں۔نیوزی لینڈ میں پیدا ہونے والے ایک ٹیچر Blair Peach کی پولیس کے ہاتھوں بربریت کا شکار ہو کر ہلاک ہونے کی وجہ سے علاقے میں احتجاج کیا گیا۔بعد ازاں پولیس نے 1989ء میں Peach کے بھائی سے out of the court settlement کر کے اپنی جان چھڑوائی۔ستمبر 1985ء کو برکسٹن میں پولیس نے ایک سیاہ فام نوجوان Michel Groce کو پکڑنے کے لیے بغیر اطلاع کے اس کی ماں Mrs Groce کے گھر چھاپہ مارا۔بستر پر لیٹی Groce جو کبھی جوانی کے ایام میں جمیکا سے آ کر برطانیہ آباد ہوئی تھی۔پولیس کی گولیوں کا نشانہ بن گئی۔جس سے اس کا کمر سے نچلا حصہ ہمیشہ کے لیے مردہ ہو گیا۔اس واقعے کے بعد سارے علاقے کے کالے

نوجوان سراپا احتجاج بن کر گلیوں میں نکل آئے۔جس کے بعد گورے پولیس والوں اور کالے نوجوانوں کے درمیان ایک تاریخی محاذ آرائی ہوئی۔لوٹ مار،توڑ پھوڑ،جلاؤ گھیراؤ کے علاوہ ایک مقامی صحافی کی ہلاکت کا واقعہ بھی پیش آیا۔مادام کوروں کو ہرجانے کی ایک کثیر رقم دی گئی۔پولیس آفیسر Duglas Lovelock کو بالآخر بری کر دیا گیا۔

اکتوبر 1985ء کو Broadwater Farm میں ایک سیاہ فام عورت Cynthia Jarretپولیس کی گھر آ کر تلاشی لینے کے دوران دماغ کی شریان پھٹ جانے سے مرگئی۔جس کے بعد سیاہ فام نوجوانوں اور گورے پولیس والوں کے درمیان لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔اس میں ایک پولیس آفیسر Blacklock کی ہلاکت بھی ہوئی۔اس کیس میں پولیس آفیسرز کو بری کر دیا گیا جبکہ پولیس آفیسر کی ہلاکت میں ملوث چھ میں سے تین بالغ افراد کو عمر قید کی سزا دی گئی۔ایک نابالغ کو چار سال بعد اور دو نابالغوں کو اٹھارہ سال بعد رہائی ملی۔13دسمبر 1995ء کو 26 سالہ سیاہ فام Wayne Duglas کی پولیس تحویل میں پر اسرار موت سے پولیس اسٹیشن کے آگے احتجاج ہوا شروع ہوا جو ایک انتشار کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔اس میں بھی کالے نوجوانوں نے لوٹ مار،توڑ پھوڑ اور تشدد میں بھر پور حصہ لیا۔بعد ازاں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے ثابت ہوا کہ ڈگلاس کی موت ہارٹ فیل ہونے کی وجہ سے ہوئی۔شامل تفتیش پولیس آفیسرز کو بری کر دیا گیا۔جولائی 2005ء کو ایک برازیلین سیاہ فام Jean charles کی ہلاکت پولیس کے ہاتھوں ہوئی۔جس کے لواحقین کو بعد میں برطانوی پولیس کی طرف سے ہرجانے کے علاوہ معافی بھی مانگنا پڑی۔22اکتوبر 2005ء میں سیاہ فام لڑکی کی عصمت دری کے الزام میں پاکستانی کمیونٹی اور سیاہ فاموں کے درمیان نسلی فساد نے جنم لیا جو دو دن تک جاری رہا۔حالانکہ وہ لڑکی چوری کے الزام میں پکڑی گئی تھی۔لڑکی سے زیادتی ثابت نہ ہو سکی مگر پاکستانی کمیونٹی کو شہ سرخیوں میں جگہ دی گئی۔اگر ان واقعات کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے اکثر آغاز پولیس کی جانب سے ہوا اور انتہاء کالوں نے کی۔متعدد بار یہ واقعات مخصوص جگہوں پر ہی ہوئے۔ہر بار احتجاج کو فسادات میں تبدیل کر کے گورے پولیس والوں کے سامنے کالے چوروں نے

لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔ترقی یافتہ دور میں برطانیہ جیسے جمہوریت کے علمبردار ملک میں ایسے واقعات ہونا اس بات کی علامت ہے کہ نظام میں کچھ خرابیاں ہیں جن کی وجہ سے ایک خاص قسم کے واقعات کا بار بار رونما ہوتے ہیں۔ان سب واقعات میں امن اور سکون برباد کرنے والے ہمیشہ نوجوان طبقہ ہی کیوں ہوتا ہے؟اس بار تو حد ہو گئی کہ گیارہ سالہ لڑکی جو کروڑ پتی کی اولاد ہے وہ بھی اس لوٹ مار میں اپنا حصہ ڈال رہی تھی۔اس میں زیادہ تعداد بارہ سے چوبیس سالہ افراد کی تھی جن کا ٹارگٹ برقی آلات تھے بعض تو کھانے پینے کی اشیاء پر بھی ہاتھ صاف کرتے نظر آئے۔

اس کی چند وجوہات ہیں۔پچھلے دس سال میں 15سے 24سال کے نوجوانوں میں ایک ملین سے زیادہ اضافہ ہوا ہے۔نوجوانوں کی موجودہ تعداد 1980ء میں بھی اس حد تک تھی مگر اس وقت ان کو روزگار کے مواقع اور تعلیمی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لیے زیادہ سہولیات میسر تھیں۔اب بے روزگاری میں اضافہ ہوا ہے۔یونیورسٹی کی فیسوں میں اس سال بہت اضافہ کیا گیا حالانکہ اس کے خلاف کافی احتجاج بھی کیا گیا مگر موجودہ حکومت نے ایک نہ سنی۔لندن میں برطانیہ کے دیگر شہروں کی نسبت سب سے زیادہ ان خاندانوں کی تعداد ہے جن کی زندگی کا دارومدار ہی حکومتی مراعات پر ہوتا ہے۔ان میں چھ لاکھ وہ نوجوان ہیں جن کی عمر 25سال سے کم ہے اور انہوں آج تک کبھی ایک دن بھی کام کر کے نہیں کھایا۔لندن میں مخصوص علاقوں میں ایک خاص کمیونٹی کی اکثریت آباد ہونے سے بھی علاقے میں مساوات نہیں رہتی۔جس سے ہر علاقہ ایک خاص نسل اور کمیونٹی کی تصویر کشی کرتا ہے۔مشرقی یورپ کے بعض غریب ممالک کا یورپی یونین میں شامل ہو کر برطانیہ اور خاص کر لندن میں آ کر تمام مراعات سے فائدہ اٹھانا۔پھر جدید ملک کی تمام سہولیات کے مزے لوٹنے کے لیے گینگ بنا کر جرائم کی وارداتیں کرنا۔وہ اپنے آپ کو اس نظام کا حصہ بنانے کی زیادہ کوشش نہیں کرتے اور ابھی تک اس میں پوری طرح ضم بھی نہیں ہو سکے۔اس گینگ میں اکثر مقامی نوجوان بھی شامل ہو جاتے ہیں جو پر ستائش زندگی گزارنے کے لیے بے راہ روی کا شکار ہو جاتے ہیں۔حالانکہ ترکی یورپی یونین میں شامل ہونے کے لیے بہت پرانا اور موزوں امیدوار

ہے مگر محض اس ڈر سے اس کو شامل نہیں کیا کہ کہیں وسط ایشیاء خصوصاً پاکستان، افغانستان، بنگلہ دیش، وغیرہ کے باشندے پیدل ہی چلتے ہوئے ترکی کے راستے ادھر کا رخ کر کے ان کا امن خراب نہ کر دیں۔ اپنے امن کو مزید پر امن رکھنے کے لیے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں برطانیہ امریکہ کا سب سے بڑا حلیف ہے۔ اس کے علاوہ بھی دیگر ممالک اس میں شامل ہیں جو اس نام نہاد جنگ میں کثیر رقم برباد کر کے اپنے ملک کی معاشی حالی ابتر کر رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کا اپنا معاشی اور سماجی نظام متاثر ہو رہا ہے۔ معاشی، سماجی اور سیاسی محرومیاں ان کی نوجوان نسلوں کو جرائم کی دلدل میں دھکیل رہی ہے۔ دہشتگردی کے خلاف جنگ میں اب تک ٹیکس ادا کرنے والوں کا کتنا پیسہ ضائع کیا جا چکا ہے۔ جس دن سے یہ جنگ شروع ہوئی اس نے صرف افغانستان، پاکستان، عراق کے علاوہ کئی اور ممالک کی معاشی اور اقتصادی حالت تباہ نہیں کی بلکہ اس کے بعد اب تک دنیا کے "چوہدری ممالک" کو بھی اس کے اثرات محسوس کرنے پڑے۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت مالی بحران (recession) کا ددھا گ ہے۔ جس نے یورپ، برطانیہ کے علاوہ امریکہ کو بھی ڈسا ہے۔ اس کے زہر کا اثر اب عوام خاص طور پر نوجوان نسل کی رگوں میں بھی اترنا شروع ہو چکا ہے۔ جنھوں نے انفارمیشن اینڈ ٹیکنالوجی کے اس دور میں آنکھیں کھولیں جب appleاور blackberry کھانے کے لیے کم اور کانوں و آنکھوں کے آگے رکھنے کے لیے زیادہ استعمال کیا جانے لگا۔ آج کا نوجوان موجودہ دور کی تمام ٹیکنالوجی کو استعمال کر کے تفریح کے کسی موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ اس کے لیے معاشی حالات آڑے آتے ہیں جو ان کو جرائم کی دنیا میں قدم رکھنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اگر وہ سارا پیسہ جو نام نہاد دہشت گردی کے خلاف جنگ میں استعمال ہو رہا ہے وہ ملک میں تعمیری کاموں میں خرچ ہو جس سے نوجوان نسل کی مایوسی (Frustation) کم ہو۔ ان کو روزگار میسر آئے، تعلیم کے مناسب مواقع ملیں تو ان کا ذہن شیطانی کاموں کی طرف کم جائے گا۔ ورنہ یہ واقعات دوبارہ بھی ہو سکتے ہیں۔ آج تو بات بازاروں اور تھانوں تک رہی کل پارلیمنٹ ہاؤس کا جلاؤ گھیراؤ بھی ہو سکتا ہے۔ ویسے اس طرح کی کئی چنگاریاں پہلے بھی اٹھتی رہیں ہیں جو ایسی آگ کا پیش

144

خیمہ تھیں۔ پچھلے سال دو پاکستانی نژاد برطانوی بھائیوں کا ان کی چھوٹی سی دوکان میں قتل کر دیا گیا۔ وجہ یہ تھی کہ کچھ نوجوان اس دوکان سے چاکلیٹ اٹھا کر رفو چکر ہونا چاہتے تھے۔ دوکان پر کھڑے ایک بھائی نے کچھ مزاحمت کی تو اس کو چاقوں سے مارنا شروع کر دیا گیا۔ جب بچانے کے لیے دوسرا بھائی آگے بڑھا جس کی ایک ہفتے بعد شادی بھی ہونے والی تھی اس کو بھی نوجوانوں کے اس گینگ نے چاقو مار کر ہلاک کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ میں تقریباً تمام Off Licence Shopsاور Pound land Shopsکے باہر اکثر لکھ کر لگایا جاتا ہے کہ ایک وقت میں تین سے زیادہ teenagersداخل نہ ہوں۔ پچھلے کچھ سالوں میں برطانیہ خصوصاً لندن میں چاقو زنی کی وارداتوں میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ یہ تمام حقائق اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ نوجوان نسل کی ایک کثیر تعداد کا ذہنی رجحان جرائم کی طرف مائل ہو رہا ہے۔ جن کے ہاتھ میں کل ملک کا مستقبل ہوگا آج وہ چاکلیٹ یا جنسی تسکین کے لیے کسی کو جان سے مارنے سے دریغ نہیں کرتے تو کل کو ملک کا کیا حال کریں گے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ سلطنت برطانیہ نے اپنے عروج کا وقت پورا کر لیا ہے؟ کیونکہ ایک زمانے میں مملکت روما جس کا شمار اس وقت کی عظیم اور طویل ترین مملکتوں میں ہوتا تھا۔ جب زوال پزیر ہوئی تو اس کے اسباب میں چند وہ باتیں بڑی مماثلت رکھتی ہیں جو آج کی برطانوی مملکت میں پائی جاتی ہیں۔ جن میں علم و حکمت میں کم دلچسپی رکھنا، فنون لطیفہ، خطابت، موسیقی، کھیل تماشے وغیرہ شامل ہیں۔ جبکہ پڑھنے لکھنے میں رجحان کم ہو گیا۔ آج ادھر کی نوجوان نسل کے بھی یہی مسائل ہیں۔ ایک خاص بات کہ وسط ایشیاء سے آ کر آباد ہونے والے لوگوں کے بچوں کا پڑھائی لکھائی میں رجحان یہاں کے مقامی لوگوں کے بچوں کی نسبت بہت زیادہ ہے۔ اگر اسی تناسب سے سارا نظام چلتا رہا تو آنے والے وقتوں میں ملک کی ترقی کا زیادہ دارومدار ایشین نژاد بچوں پر ہوگا۔

حالیہ واقعات سے پہلے موجودہ حکومت نے پولیس کی تعداد کو کم کرنے کا اعلان کیا تھا۔ حیرانگی کی بات ہے کہ اب بھی حکومت اس فیصلے کو برقرار رکھے ہوئے

ہے۔جبکہ لندن کے میئر نے موجودہ تعداد کو بڑھانے کی اپیل ہے۔بڑھتے ہوئے جرائم میں پولیس کی تعداد کم کرنا جرائم پیشہ افراد کی حوصلہ افزائی کے مترادف ہوگا۔حالیہ واقعات کے بعد ای پٹیشن کے ذریعے کچھ دیر میں لاکھوں افراد نے اس بات پر اتفاق کیا کہ جرائم میں ملوث پائے جانے افراد کی تمام حکومتی مراعات ختم کر دی جائیں۔سوچنے کی بات یہ ہے کہ جو افراد تمام مراعات حاصل کرنے کے باوجود لوٹ مار کا بازار گرم کر دیتے ہیں اگر ان کی مراعات ہی ختم کر دی جائیں تو کیا وہ آرام سے گھر بیٹھ جائیں گے؟اب واقعی ہی برطانوی تھنک ٹینک کے لیے ایک کڑی آزمائش کا وقت ہے۔قانون کی بالا دستی قائم رکھنے کے لیے موجودہ قانون میں کچھ اصلاحات کرنا لازمی ہوتا جا رہا ہے جس میں پولیس کے اختیارات کا معاملہ بھی سب سے اہم ہے۔یہ بڑا حساس مسئلہ ہے کیونکہ اختیارات اور ان کا استعمال ہی اکثر فسادات کا موجب بنا ہے۔قانون میں کم ازکم ایسی اصلاحات اب ناگزیر ہوگئی ہیں جن کے نفاذ سے نوجوان نسل کو قانون کے خوف کے ساتھ اس کا احترام کرنا بھی آئے۔موجودہ قانون میں تو سارے اختیارات ہی نوجوان نسل کے ہاتھ میں ہیں والدین ،اساتذہ اور قانون نافذ کرنے والے ادارے بچوں کے آگے ایسے بے بس ہوتے ہیں جیسے وڈیرے کے آگے مزارعے......!کیونکہ ادھر کا قانون ہی ایسا ہے کہ سارے حقوق بچوں کو اور فرائض کا خانہ خالی......!والدین اپنے بچے کو کسی غلط کام کی وجہ سے مارنا تو دور کی بات ڈانٹ بھی نہیں سکتے ۔اگر غلطی سے بچوں کی غلطی سدھارنے کے لیے ان کو ڈانٹ دیں اور کوئی ان کو دیکھ لے یا ان کا بچہ ہی ان کی شکایت درج کروا دے تو یہ ان کی آخری غلطی ثابت ہوتی ہے۔کیونکہ آئندہ کبھی ایسی غلطی کی نوبت آنے کے لیے بچہ ہی اُن کے پاس نہیں رہتا۔یہ کڑوا سچ ہے جس کو یہاں سب پی رہے ہیں۔دیارِ غیر میں کئی لوگ بچوں کو ڈانٹنے یا سختی کرنے کے جرم میں بچوں سے محروم ہو چکے ہیں۔اکثر نے اس کا ذکر کبھی پاکستان جا کر نہیں کیا۔ایسے قانون بھی ملک کی نسل کو بے راہ روی کے اندھے کنوئیں میں دھکیل رہے ہیں۔ماں باپ ،اساتذہ اور پولیس والوں کی بے بسی کا اندازہ یہاں کے بچوں کو

اچھی طرح سے ہے۔جس کا وہ ناجائز فائدہ بھی خوب اٹھاتے ہیں۔کہتے ہیں کہ نئی نسل ہی ملک کا مستقبل ہوتی ہے اگر یہ نسل ایسے قانون کی آڑ میں بگڑتی رہی تو ملک زوال پزیر ہونا شروع ہو جائے گا۔ملک بچانا اور سنوارنا ہے تو اس نسل کو تباہ ہونے سے بچانا ہوگا۔ان کو جائز حقوق دینے ہونگے۔روزگار کے مواقع ،تعلیم کے لیے سازگار حالات پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ بڑوں کی قدر کرنا بھی سکھانا ہوگا۔یہ سب باتیں تو اخلاقیات سے تعلق رکھتی ہیں مگر اہم بات تو یہ ہے کہ اب جو نوجوان فیسوں میں کمی کا مطالبہ لے کر نکلے ہیں اس بار برطانوی ریاست کا اُن کے ساتھ رویہ کیا ہوگا۔نوجوان باہمت اور اپنی بات پر ہمالہ کی طرح کھڑے ہونے والے ہوتے ہیں اور تعلیم حاصل کرنے کا شوق اور بنیادی حق انہیں ایک بار پھر سڑکوں پر لے آیا ہے اگر برطانوی حکومت نے اس معاملے کو فوری طور پر ختم نہ کیا تو برطانیہ کے جرائم پیشہ ،فیسوں میں کمی کا مطالبہ کرتے نوجوان ،سرمایہ داری نظام کے حامی اور برطانوی پولیس کا رویہ مل کر کسی بڑے حادثے کو جنم دے سکتا ہے۔تعلیم حاصل کرنا دنیا کے ہر بچے کا پیدائشی حق ہے بجائے اس کے کہ یہ حق ہر بچے کہ گھر کی دہلیز تک پہنچاتا تاجدارِ برطانیہ جیسی ریاست نے صرف اور صرف خزانہ بھرنے اور زیادہ سے زیادہ وسائل اکٹھے کر کے امریکہ کی کسی نئی جنگ میں اُن کو جھونکنے کا تہیہ کرلیا ہے سوایسے میں زیادہ امکان یہی ہے کہ ان طلباء کا احتجاج دن بدن شدت اختیار کرتا جائے گا کیونکہ انسانی شعور ایک حاصل حد تک جانے کے بعد کبھی واپسی کے سفر پر روانہ نہیں ہوتا۔

روزنامہ ”دن“ لاہور 16 نومبر 2011ء

قابل غور

☆ سیاح کے بتانے پر جاپانی نے جیب سے اتنے پیسے نکال کر اس کے ہاتھ میں رکھ دیے اور ساتھ کہا کہ جناب اب میری قوم کو برا نہ کہنا ورنہ مجھ سے برداشت نہ ہوگا۔

☆ شرط یہ تھی کہ جاپانیوں کا نظامِ تعلیم اور نصاب تعلیم بھی امریکی طے کریں گے جس کو ماننے سے شکست خوردہ شاہ نے بھی

انکار کر دیا۔ شاہ کا کہنا تھا کہ ہم اپنا نظام تعلیم اور نصاب تعلیم کسی غیر قوم کے حوالے کسی صورت نہیں کر سکتے۔

☆ فاتح امریکہ کی سڑکوں پر چلنے والے گاڑیوں سے لے کر امریکی بچوں کے کھلونوں تک امریکہ نے جاپان سے درآمد کیے۔

☆ اگر کسی کے ماں باپ میں سے ایک بھی ''خالص جرمن'' نہ ہو تو اس کو کسی حساس ادارے کا خاص عہدہ نہیں دیا جاتا۔

☆ ہمارے ساتھ المیہ یہ ہے کہ جب تک ہم ایک قوم تھے ہمارے پاس اپنا ملک نہ تھا جب ملک نصیب ہوا تو ہم ''قوم'' نہ رہے۔

☆ آج ہمارے نظر نہ آنے والے قائدین ان خارجی اور سامراجی قوتوں کو ملک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔

☆ خاص ٹائمنگ سے لگایا گیا الزام ----- بے وقت کے ثابت شدہ جرم سے زیادہ اثر دکھاتا ہے۔

سیاسی پنڈت اور ان کے اوتار

ساؤتھ ایشین سیاح جاپان میں سیر و سیاحت کے دوران ایک بس پر سفر کر رہا تھا۔راستے میں بس کچھ دیر کے لیے ایک مقام پر رکی تو سیاح نے نیچے اتر کر چائے پی اور فروٹ والے سٹال سے ''کیلے'' خرید کر دوبارہ اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔بس چلنے کے کچھ دیر بعد سیاح نے کیلوں والے بیگ سے کیلا نکال کر کھانے لگا تو دیکھا کہ کیلے کا کچھ حصہ خراب تھا۔باقی کیلوں میں سے دو تین کیلوں کے ساتھ یہی معاملہ تھا۔اس پر سیاح نے غصے میں آ کر جاپانیوں کو برا بھلا کہہ دیا۔ساتھ والی نشست پر بیٹھے ایک جاپانی مسافر کو جب ساری بات کا پتہ چلا تو وہ اس سیاح سے پوچھتا ہے کہ آپ نے کتنے پیسوں میں یہ کیلے خریدے تھے؟ سیاح کے بتانے پر جاپانی نے جیب سے اتنے پیسے نکال کر اس کے ہاتھ میں رکھ دیئے اور ساتھ کہا کہ جناب اب میری قوم کو برا نہ کہنا ورنہ مجھ سے برداشت نہ ہوگا۔قوم پرستی کا یہ عالم دیکھ کر سیاح کو حیرانگی بھی ہوئی اور اپنے فعل پر شرمندگی بھی۔سیاح نے جاپانی سے معافی مانگ کر اس کے پیسے واپس کر دیئے۔جس ملک کا ایک عام شہری اپنی قوم کے بارے میں کوئی برا لفظ برداشت نہ کرے تو اس ملک کی قیادت کیسی ہوگی؟ کسی قوم پر اس سے زیادہ برا وقت کیا ہوگا کہ اُس کے دو شہروں پر ایٹم بم گرا کر نیست و نابود کر دیئے جائیں اور امریکی صدر ایک ذلت آمیز صلح نامہ لے کر شاہِ جاپان کے پاس پہنچ جائے۔شاہ نے صلح نامہ بغور پڑھا اور اُس میں سے ایک شق کاٹ دی۔امریکی صدر نے کہا کہ وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ آپ کے دو شہروں پر ایٹم بم گرا دیئے گئے ہیں آپ صلح میں بھی اپنی شرط رکھ رہے ہیں۔'' شاہِ جاپان نے جواب دیا ''میں نے کوئی شرط نہیں رکھی صرف آپ کی ایک ایسی شرط صلح نامے سے خارج کی ہے جس کو تسلیم کر کے ہم ویسے بھی مر ہی جائیں گے تو کیونکہ آپ کے ساتھ

لڑ کر باوقار طریقے سے موت کو گلے لگا لیا جائے۔'' شرط یہ تھی کہ جاپانیوں کا نظامِ تعلیم اور نصابِ تعلیم بھی امریکی طے کریں گے جس کو ماننے سے شکست خوردہ شاہ نے بھی انکار کر دیا۔شاہ کا کہنا تھا کہ ''ہم اپنا نظامِ تعلیم اور نصابِ تعلیم کسی غیر قوم کے حوالے کسی صورت نہیں کر سکتے'' اور پھر اقوامِ عالم نے دیکھا کہ اُسی نظامِ تعلیم اور نصابِ تعلیم کی بدولت امریکہ کو معاشی میدان میں ایسی شکست دی کے دنیا حیران پریشان ہو گی۔فاتح امریکہ کی سڑکوں پر چلنے والے گاڑیوں سے لے کر امریکی بچوں کے کھلونوں تک امریکہ نے جاپان سے درآمد کیے۔جنگِ عظیم دوئم کی تباہ کاریوں کے باوجود اپنی معاشی حالت سنوارنے میں جاپانیوں نے ایک قوم بن کر اتنی محنت کی کہ آج کے سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کے دور میں جاپان اور ٹیکنالوجی میں ایسا تعلق نظر آتا ہے جو قلب و نبض میں ہوتا ہے۔حالیہ قدرتی آفات میں بھی جاپان نے کسی قسم کی بیرونی امداد لینے سے انکار کر کے خود انحصاری پر یقین کرنے والی قوم ہونے کا منہ بولتا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔جاپان کی طرح جرمنی بھی جنگِ عظیم کے دوران کھنڈرات میں بدل گیا تھا۔مگر وہاں کی عوام نے ''قوم'' بن کر چار دہائیوں میں جرمنی کی معاشی حالت کو اتنا مضبوط بنا دیا کہ اس کا شمار دنیا کے مضبوط معاشی نظام والے ممالک میں ہونے لگا۔آسٹریا سے آ کر جرمن قوم پر مسلط ہونے والے ''ہٹلر'' کے بعد جرمن لوگ اس قدر قوم پرست ہو گئے کہ انہوں نے اپنے قوانین میں ایسی تبدیلیاں کیں کہ آئندہ کوئی ''غیر قوم'' کا باشندہ ان پر مسلط ہی نہ ہو سکے۔کسی بھی حساس ادارے میں کلیدی عہدے یا کسی خاص آسامی پر تعینات ہونے کے لیے خالصتاً ''جرمن'' ہونا بنیادی شرط قرار دیا گیا۔اگر کسی کے ماں باپ میں سے ایک بھی ''خالص جرمن'' نہ ہو تو اس کو کسی حساس ادارے کا خاص عہدہ نہیں دیا جاتا۔معمولی سے معمولی آسامی کو پر کرتے وقت بھی ''سب سے پہلے جرمن'' کا قانون ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔اس آسامی کے لیے اگر جرمن باشندہ میسر نہ ہو تو یورپی یونین کے باشندوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔اگر کوئی یورپی یونین کا باشندہ بھی نہ ملے تو جرمنی میں آباد وہ جن کے پاس وہاں رہنے اور کام کرنے کا قانونی حق ہے ان کو موقع

دیا جاتا ہے۔ان قوانین کی وجہ سے اکثر جرمنی کو متعصب اور قوم پرست ہونے کا طعنہ بھی دیا جاتا ہے مگر ان کا ہر قانون اور اصول اپنے ملکی مفاد کے لیے ہے۔ جاپان اور جرمنی جنگ عظیم میں تباہ و برباد ہو کر بھی آج دنیا میں معاشی طور پر اس لیے مستحکم ہیں کہ یہ اپنے ملک کے وفادار ہیں ۔اپنے گھر کے معاملات خود حل کرنا ان کے خون میں شامل ہو چکا ہے۔الزام لگانا تو دور کی بات اگر کوئی ان کی قوم کو برا کہے تو عام شہری بھی اس کا دفاع کرتا نظر آتا ہے۔آیئے اب اُس وطن عزیز کی حالت زار بھی دیکھیں جس کے حصول کے لیے قربانیوں کی انگنت داستانیں سناتے ہمارے باب اور نصاب تھکتے نہیں ہیں۔ہمارے ساتھ المیہ یہ ہے کہ جب تک ہم ایک قوم تھے ہمارے پاس اپنا ملک نہ تھا جب ملک نصیب ہوا تو ہم "قوم" نہ رہے۔جن کے تسلط سے آزاد ہونے کے لیے ہمارے بڑوں نے آزادی کی تحریکوں میں جانی و مالی قربانیاں دے کر آزاد ملک کی تعبیر حاصل کی تھی۔آج ہمارے نظر نہ آنے والے قائدین ان خارجی اور سامراجی قوتوں کو ملک کے اندرنی معاملات میں مداخلت کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔کیا خودداری اور خود انحصاری کو چھوڑ کر ہم کبھی ایک قوم نہیں بن سکتے؟ ملک سے وفاداری ایک ایسا مرض ہے اگر یہ ملک کے سربراہ کو لاحق ہو جائے تو اس کا وائرس ایسے پھیلتا ہے کہ اس سے کوئی شہری بھی بچ نہیں سکتا۔جس ملک میں یہ وبا پھیل جائے تو اس پر کسی ڈرون کا سپرے تو چھوڑیں برسات بھی کر دی جائے تو اس کا اثر نہیں ہوتا۔مگر ہمارے سربراہان کو اپنے آپ پر، ملکی وسائل اور اداروں پر اتنا بھروسہ نہیں ہوتا۔یہی وجہ ہے کہ وہ داخلی معاملات خارجی قوتوں سے حل کروانے کی عادی ہو چکے ہیں۔پتھر کی مورتیوں کو پوجنے والے کافر بھی اقتدار میں آنے، کسی کو اقتدار سے گرانے یا اقتدار کو بچانے کے لیے کسی زندہ شخص کو بھگوان بنا کر نہیں پوجتے۔یہ ایک تلخ حقیقت اور کڑوا سچ ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں بہت سے سیاسی پنڈت اقتدار میں آنے کے لیے، کسی کو اقتدار سے محروم کرنے کے لیے یا اپنا اقتدار بچانے کے لیے جیتے جاگتے بھگوانوں کے درشن کے لیے اکثر لندن اور واشنگٹن کی "یاترا" کے لیے جاتے رہتے ہیں۔کچھ تو ان کا آشیرباد لینے

کے لیے معصوم جانوں کا نذرانہ دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔"سب سے پہلے پاکستان" کا نعرہ لگانے والے اقتدار سے محروم کیے جانے کے غم کو بھلانے کے لیے لندن کی لمبی یاترا پر آئے ہیں۔جہاں پر پہلے سے ہی کچھ سیاسی پنڈت پکا ڈیرہ لگائے بیٹھے ہیں۔ہمارے ملک میں۔۔۔۔۔الزام لگاؤ۔۔۔۔جان چھڑاؤ کی ہوا آج کل کچھ زیادہ ہی تیز چل رہی ہے۔ہر پارٹی دوسرے پر الزام لگا رہی ہے جن کی نوعیت اتنی سنگین ہوتی ہے کہ اگر الزام ثابت ہو جائے تو قانون میں اس کی سزا موت ہے۔مگر آج تک جب ان الزامات کا کبھی کسی نے کوئی نوٹس ہی نہیں لیا تو سزا دینے کا جواز ہی کیا رہ جاتا ہے۔الزامات کی اس بہتی گنگا میں باہر والے صرف ہاتھ ہی نہیں دھوتے بلکہ کئی چیزوں پر ہاتھ صاف بھی کر جاتے ہیں۔حقانی نیٹ ورک سے تعلقات رکھنے کا الزام جب ثابت نہ ہو سکا تو حسین حقانی اور "میمو" کا الزام منظر عام پر آ گیا۔جس میں فائدہ کس کا ہے اور کس کا نقصان یہ تو شاید کبھی منظرِ عام پر اتر آئے مگر ابھی تک تو اس میں ہمیشہ سیاسی پنڈتوں اور ان کے اداروں ہی فائدے میں رہے ہیں۔سیاسی پنڈتوں کی اپنے اداروں سے وابستگی ہر دور میں رہی ہے۔جس کو ذہن میں رکھ کر "میمو سازش" تیار کی گئی۔ ملکی مفاد کی خاطر یہ ضروری ہے کہ الزامات کی اس وبا پر قابو پایا جائے جو اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا جب تک الزام لگانے والے کے دل میں یہ ڈر پیدا نہ ہو کہ اگر اس نے الزام ثابت نہ کیا تو اس کے خلاف بھی قانونی کارروائی ہو سکتی ہے۔دنیا کے ہر کام میں ٹائمنگ کو بڑی خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے۔اچھے باورچی کو پتہ ہوتا ہے کس کھانے میں کیا کب ڈالنا ہے اور کتنی آنچ پر کتنی دیر پکانا ہے، کسی بلے باز کی شارٹ کی ٹائمنگ ٹھیک نہ ہو تو اس کے آؤٹ ہونے کے چانس زیادہ ہوتے ہیں، سیاسی کھیل میں بھی ٹائمنگ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔خاص ٹائمنگ سے لگایا گیا الزام ------بے وقت کے ثابت شدہ جرم سے زیادہ اثر دکھاتا ہے۔جس "میمو" کی پہلے تردید کی گئی------ اس کی اب تصدیق کرنے میں سب سے اہم بات ٹائمنگ ہے مگر سوال تو یہ ہے کہ جس ٹائمنگ کو مدنظر رکھتے ہوئے سازش کرنے والوں نے سازش کی کیا وہ ٹائمنگ واقعی کسی

بڑی تبدیلی کا پیش خیمہ بن سکتی ہے؟ میمو گیٹ سکینڈل بظاہر بہت سے اداروں کے خلاف سازش دکھائی دے رہی ہے لیکن اس کا اصل ہدف میرے خیال کے مطابق افواجِ پاکستان ہے اور اس کے بعد وقت اور مقام کے حوالے سے بھی یہ کام جس سر زمین پر جن لوگوں نے سرانجام دیا ہے اُن کا اپنا ماضی افواج پاکستان اور پاکستان میں جمہوریت کے حوالے سے اتنا معتبر نہیں ہے۔ یہ حملہ اُسی ذہن کی کارستانی ہے جو اس سے پہلے بھی افواج پاکستان کے سامنے اپنے ناجائز مطالبات پیش کر کے انکار سن چکا ہے۔ اب حقانی نیٹ ورک اگر ان کے دائرہ قدرت سے باہر تھا تو ہمیں یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہیے کہ حسین حقانی اُن کی دسترس میں تھا۔ حسین حقانی کے استعفے کے بعد یہ بات ختم نہیں ہوئی بلکہ شروع ہوئی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ سازش پاکستان کو مقتدر کرنے میں اہم کردار ادا کر دے اور ہم امریکی دوستی سے ہمیشہ کے لیے دست بردار ہو کر اپنے وسائل میں رہتے ہوئے اپنی چادر کے مطابق پاؤں پھیلائیں۔ ورنہ یہ میمو کیا پورے پورے رجسٹر ڈ نکل آئیں گے۔

روزنامہ ”دن“ لاہور 24 نومبر 2011ء

دی نیشن لندن 2 دسمبر 2011ء

قابل غور

☆ یہ جرمن قوم کی ایک اعلیٰ ترین صفت ہے کہ وہ شاعروں، ادیبوں، سائنسدانوں، دانشوروں، فلاسفروں اور اچھے سیاستدانوں کو اپنے معاشرے میں ایک خاص مقام دیتی ہے۔

☆ ہائیڈلبرگ میں جہاں شاعرِ مشرق قیام پزیر رہے ان کے

نام ایک سڑک اقبال اُفر ”Iqbal Ufer“ منسوب کر دی ہے۔

☆ اپنے ضمیر اور قلم کا سودا نہ کرنے والے کچھ شعراء کو زندگی میں پابند سلاسل رکھا۔ جب دنیا سے چلے گئے تو ان کے شعر جلسے اور ریلیوں میں پڑھ کر اپنے آپ کو محبِ وطن ثابت کرنے کا ڈرامہ رچایا جاتا ہے۔

☆ ہم نے تو آج تک عروج دیکھا ہی نہیں، علم و تدریس اور معلم کے ساتھ ہمارا رویہ عروج سے پہلے ہی ہمیں زوال کی طرف لے جا رہا ہے۔

☆ جس انقلاب کی بات آج پاکستان میں ہو رہی ہے اُس کی حالت بھی ایسے ہی ہے جیسے استاد کے بغیر کلاس روم اور الفاظ کے بغیر کتاب۔

نظامِ تعلیم انقلاب اور معلم کا مقام

تقریباً چودہ برس قبل میں جرمنی کے شہر شوائن فورٹ میں انجینئرنگ میں داخلے کے لیے ایک سکول میں جرمن زبان سیکھ رہا تھا۔ہماری ٹیچر مادام و ول فورتھ (Wolfarth) نے کمرہ جماعت میں بتایا کہ کل اس کی سالگرہ ہے۔میں نے چھٹی کے بعد گھر جاتے ہوئے ایک سالگرہ کا کارڈ خریدا۔شام کو اپنی ٹیچر کی شخصیت کو سامنے رکھ کر جرمن زبان میں ایک نظم اس کارڈ پر لکھ دی۔اگلے روز کلاس میں کارڈ والا لفافہ مادام وول فورتھ (Wolfarth) کو دیا اور ساتھ ان کو سالگرہ کی مبارکباد بھی دی۔یہاں کے کلچر کا یہ حصہ ہے کہ تحفہ کی پیکنگ تحفہ دینے والے کے سامنے کھول کر شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ہماری ٹیچر نے بھی فوراً کارڈ والا لفافہ کھولا۔کارڈ میں اپنی شخصیت کے حوالے سے لکھی نظم پڑھ کر وہ اس قدر جذباتی ہوئیں کہ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔پھر میرے تمام کلاس فیلوز کے سامنے انہوں نے بڑے ترنم کے ساتھ وہ نظم پڑھی۔آخر میں انہوں نے کہا ”مجھے آج تک بہت سے تحائف ملے ہیں مگر میں ساری زندگی اس تحفے کو نہیں بھول سکتی یہ بہت قیمتی ہے کیونکہ یہ پیسوں سے نہیں خریدا گیا بلکہ اس میں خلوص کا وہ جذبہ شامل ہے جو کہیں سے خریدا ہی نہیں جا سکتا۔اس میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ کسی غیر ملکی نے میری ذات کے متعلق جرمن زبان میں لکھا ہے“۔سچ تو یہ ہے کہ مجھے بھی آج تک ان کی حوصلہ افزائی اور عزت افزائی نہیں بھولی۔دراصل یہ جرمن قوم کی ایک اعلیٰ ترین صفت ہے کہ وہ شاعروں، ادیبوں، سائنسدانوں، دانشوروں، فلاسفروں اور اچھے سیاستدانوں کو اپنے معاشرے میں ایک خاص مقام دیتی ہے۔اس بات کا ثبوت جرمنی کے سب سے زیادہ یونیورسٹیوں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں والے شہر ہائیڈلبرگ میں جہاں شاعرِ مشرق قیام پذیر رہے ان کے نام ایک سڑک اقبال اُفر

"Iqbal Ufer" منسوب کردی ہے۔جو قوم غیر ملکی فلاسفر سے متاثر ہو کر اس کی اتنی عزت افزائی کر سکتی ہے تو اس کا اپنے ہیروز کو خراج تحسین پیش کرنے کا انداز کیسا ہو گا؟ جرمنی کے ہر شہر میں اکثر سڑکوں کے نام ایک جیسے ہی ہیں مثلاً ہر شہر کے انڈسٹریل ایریا میں اکثر سائنسدانوں اور موجدوں کے نام استعمال کیے گئے ہیں۔جن میں البرٹ آئن اسٹائن، پاسکل، اوہم، اوٹو ہاہن، روڈولف ڈیزل، ماکس پلانک، گستاف ہرٹس، ہیکو Siemens،وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اس کے علاوہ شہر کے وسط میں اپنے کسی قومی سائنسدان، شاعر، فلاسفر یا ادیب وغیرہ کا مجسمہ بھی نصب کیا ہوا ہے۔اندرون شہر کے اردگرد کی گلیوں یا سڑکوں کو اپنے فلاسفروں، ادیبوں، اور شاعروں کے علاوہ کچھ اچھے سیاستدانوں کے ناموں سے بھی منسوب کیا گیا ہے۔جن میں کینٹ، گوئٹھے، جارج ولیم، فریڈرش ہیگل، کونراڈ آڈے ناور CDU کے بانی فریڈرش ایبرٹ SPD پارٹی کے بانی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ظاہر ہے جو قوم علم اور علم والوں کی قدر کرے ان کے نام سے سارے ملک کی سڑکیں منسوب کر دیں جائیں تو علوم عقلیہ کی برکات اُس پر نازل ہوتی رہیں گی۔دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی، سب سے متبرک اور معتبر کتاب کا جب نزول شروع ہوا تو سب سے پہلا لفظ ہی "اقراء" تھا۔یعنی ......پڑھ......!! آپ ﷺ کی حدیث بھی ہے کہ علم حاصل کرو خواہ اس کے لیے تمھیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔مگر ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم آج بھی جہالت کے سمندر میں غرق ہیں۔وطن عزیز کی موجودہ حالت کی سب سے بڑی وجہ "علمی پستی" ہے۔یہی وجہ ہے ہمارے معاشرے میں سائنسدان، فلاسفر، ادیب، شاعر وغیرہ کی وہ قدر اور عزت افزائی نہیں کی جاتی جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں۔سال میں ایک بار اقبال ڈے منا کر ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے اقبال پر بڑا احسان کر دیا ہے۔ان کا فلسفہ حیات آج بھی قابل عمل ہے مگر شاید ہم آج اس قابل بھی نہیں رہے کہ اس کو سمجھ سکیں بلکہ صرف پڑھ ہی سکیں۔ڈاکٹر عبدالسلام سے فائدہ نہ اٹھایا گیا۔ڈاکٹر قدیر خان نے فائدہ پہنچا دیا تو اس کا صلہ جو دیا گیا ہے وہ بھی ایک کھلی اور کڑوی حقیقت ہے۔زندہ سے کام نہیں لیا جب

کوئی دنیا سے کوچ کر جائے گا تو اس کو کسی ایوارڈ سے نواز دیا جائے گا۔اپنے ضمیر اور قلم کا سودا نہ کرنے والے کچھ شعراء کو زندگی میں پابند سلاسل رکھا۔جب دنیا سے چلے گئے تو ان کے شعر جلسے اور ریلیوں میں پڑھ کر اپنے آپ کو محبِ وطن ثابت کرنے کا ڈرامہ رچایا جاتا ہے۔کسی کو سائنسدان، ادیب، فلاسفر یا شاعر بننے کے لیے تخلیق کے سمندر میں غوطہ خوری کرنی پڑتی ہے۔جس کے لیے ایک مناسب تعلیمی نظام اور استاد ہونا لازمی ہیں۔ہمارا تعلیمی نظام ناقص تو ہے ہی مگر ریلوے کی طرح برق رفتاری سے زوال پزیر بھی ہو رہا ہے۔معلم کی قدر اس کی تنخواہ سے لگائی جا سکتی ہے۔حالیہ دنوں میں کوئٹہ میں اساتذہ نے بھوک ہڑتال کی اور مطالبات تسلیم نہ ہونے تک بھوک ہڑتال جاری رکھنے کا عندیہ بھی دیا۔المیہ یہ ہے کہ اساتذہ جن کا درجہ ماں باپ کے برابر تصور کیا جاتا ہے ان کے حقوق اس حد تک سلب کیے گئے کہ بیچارے سڑکوں پر آ گئے۔بھوک سے تو ویسے یہ پہلے ہی مر رہے تھے اب اگر بھوک ہڑتال سے مر جائیں گے تو کسی کو کیا پروا......؟جن کو پروا کرنی چاہیے ان کے بچے تو کیڈٹ سکول، گرامر سکول یا بیرون ممالک تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔تاریخ میں روما اور مغلیہ سلطنت کے زوال کے اسباب میں ایک قدر مشترک ہے کہ ان دونوں قوموں میں بہترین کھلاڑی، ایکٹر، سپاہی، اعلیٰ افسر، مقرر، شاعر وغیرہ تو موجود تھے مگر تعلیم و تدریس کے معاملے میں دلچسپی ختم ہو چکی تھی۔پڑھنے لکھنے کا کام غلاموں کے سپرد کر دیا گیا تھا۔چنانچہ غلام ہی معلم ہوا کرتے تھے۔جو شب و روز اپنے آقا کی خدمت کرنے کے ساتھ ساتھ بچوں کو بھی پڑھاتے تھے۔غلاموں کو کوڑے مارنا اور سزائیں دینا عام تھا اور اکثر شاگرد اپنے غلام استادوں کو کوڑے مارتے تھے۔علم و حکمت کی اس توہین کے اثرات بہت جلد اس قوم کے زوال کی صورت میں رونما ہوا۔ہم نے تو آج تک عروج دیکھا ہی نہیں، علم و تدریس اور معلم کے ساتھ ہمارا رویہ عروج سے پہلے ہی ہمیں زوال کی طرف لے جا رہا ہے۔اب تک کوئی روٹی کپڑا اور مکان کا نعرہ لگاتا رہا، کوئی اسلام کا، کوئی روشن پاکستان کا، اب نیا نعرہ انقلاب کا لگایا جا رہا ہے۔یہ بھی حقیقت ہے کہ کبھی جاہل اور بے شعور لوگ انقلاب نہیں

لائے۔شعور کے لیے تعلیم کا ہونا بہت ضروری ہے اور تعلیم کے لیے تعلیمی نظام کو دورِ حاضر کی ضرورت کے مطابق ڈھالنا ہوگا۔اس کے ساتھ ساتھ معلم کو اتنی عزت اور مراعات ضرور دی جائیں کہ ان کو بھوک ہڑتال اور پریس کلب کے سامنے احتجاج نہ کرنا پڑے۔اگر تعلیمی نظام ٹھیک کرلیا جائے تو روٹی، کپڑا اور مکان کے ساتھ ساتھ خودی اور عزت بھی ہمارا مقدر آپ بن جائے گی۔مگر جس انقلاب کی بات آج پاکستان میں ہو رہی ہے اُس کی حالت بھی ایسے ہی ہے جیسے استاد کے بغیر کلاس روم اور الفاظ کے بغیر کتاب۔جن کے خلاف انقلاب آنا تھا وہ وہی انقلاب میں شامل ہو چکے ہیں۔اب جو انقلاب پاکستان میں آئے گا اُس کے لیے کسی پیشگی اطلاع کی ضرورت نہیں۔اچھے استاد نہ ہونے کی وجہ سے پاکستانی عوام ایک بار پھر دھوکا کھانے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوچکی ہے یا تیار کرلی گئی ہے۔

روزنامہ "دن" لاہور یکم دسمبر 2011ء

دی نیشن لندن 9 دسمبر 2011ء

قابلِ غور

☆ بلی کے ساتھ ساری قوم کی یکجہتی اور ہمدردی دیکھ کر مس بیل کے خلاف فوری قانونی چارہ جوئی کی گئی، باقاعدہ مقدمہ چلا اور سزا سنائی گئی۔

☆ یہ "مغربی عامل" دوہرے معیار کا ایسا چشمہ لگا کر دیکھتے

ہیں کہ انھیں کچھ ملکوں میں بسنے والے انسان یا حیوان بھی نہیں بلکہ کسی دوسرے سیارے کی جناتی مخلوق دکھائی دیتی ہے۔

☆ اکیسویں صدی کے اس اہم ترین موڑ پر انسانی حقوق کے دعوی دار ایک طرف تو جانوروں کی دیکھ بھال کر رہے ہیں یا اُن کے حقوق کے تحفظ کے لیے سرگرم عمل ہو جاتے ہیں لیکن دوسری طرف اُن کی اخلاقی پستی کی یہ حالت ہے کہ اقوام متحدہ کے تسلیم شدہ انسانی بنیادی حقوق کی دھجیاں اڑانے میں لمحہ بھر کی تاخیر نہیں کرتے۔

☆ حقیقت تو یہ ہے کہ طاقتور کا کمزور سے کوئی معاہدہ ہوتا ہی نہیں بلکہ کمزور مصلحت کا شکار ہو کر ہر معاہدے کو مان لیتا ہے اور اُس پر اتنی دیر تک قائم رہتا ہے جب تک وہ خود طاقتور نہیں ہو جاتا۔

قومی سلامتی ”سلامت“ کیسے رہ سکتی ہے؟

دسمبر 2006ء کی شدید برف باری کے دوران میں جرمنی کے ایک چھوٹے سے شہر شوٹن (Schotten) سے گریبن ہائن (Grebenhain) جو سردیوں کی کھیلوں (winter sports) کے حوالے خاص مقام رکھتا ہے کی طرف بذریعہ کار رواں دواں تھا کہ راستے میں ایک جگہ پولیس کی گاڑیاں اور ایمبولینس کھڑی ہونے کی وجہ سے ایک طرف کا راستہ بند تھا۔کچھ پولیس والے ٹریفک کنٹرول کر رہے تھے۔میں جب اس جگہ کے پاس سے گزرا تو نیچے گہری کھائی میں ایک کار الٹی ہوئی دکھائی دی۔ریسکیو والے مخصوص یونیفارم پہن کر کھائی میں اتر رہے تھے۔شدید برف کی وجہ سے سارا پہاڑی علاقہ سفید تھا اور سردی بھی عروج پر تھی۔کچھ دیر بعد ریڈیو پر ٹریفک اپ ڈیٹس میں اس ایکسیڈنٹ کی وجہ سے سڑک عارضی طور پر بند کر کے متبادل راستے کا اعلان کیا گیا تا کہ ریسکیو ٹیمیں اپنا کام آسانی سے کر سکیں۔چند گھنٹوں بعد ریڈیو پر نیوز اپ ڈیٹ ہوئی کہ ریسکیو کی ٹیم نے اس کار سے ایک جرمن عورت اور ایک 3 سالہ بچے کی لاش نکال لی ہے۔کار میں بچوں والی 2 سیٹیں موجود تھیں۔دوسری سیٹ پر کوئی بچہ موجود نہ تھا۔اس عورت کو شناخت کرنے کے بعد پتہ چلا کہ وہ اپنے خاوند اور 2 بچوں کے ہمراہ اسی علاقے کی رہائشی تھی۔خاوند نیم مردہ حالت میں گھر پایا گیا جبکہ ایک پانچ سالہ بچہ نہ گھر ملا اور نہ ہی کار سے برآمد ہو سکا۔اندھیرے اور مزید خراب موسم کی وجہ سے رات کو بچہ ڈھونڈنے کا عمل روک دیا گیا۔اگلے دن بھرپور طریقے سے یہ عمل دوبارہ شروع کیا گیا۔اس کارروائی کی لمحہ بہ لمحہ ریڈیو پر رپورٹنگ ہو رہی تھی۔علاقے کا میئر بھی جائے وقوع پر سارا دن موجود رہا اور میڈیا بھی۔شام کو پولیس کے کتوں کی مدد سے بچے کی لاش قریب کے ایک قصبے گیدرن (Gedern) کی ایک جھیل سے ملی۔تفتیش کے

بعد پتہ چلا کہ عورت نے بچوں اور خاوند کو نیند کی دوا کھلائی۔ بڑے بچے کو جھیل میں پھینکا اور چھوٹے بچے کے ساتھ کار کو پہاڑی سے نیچے گرا کر خودکشی کر لی۔ پانچ سال کے ایک معصوم کی جان بچانے یا لاش ڈھونڈنے کے لیے 34 گھنٹوں میں حکومت نے سینکڑوں پولیس والوں اور امدادی ٹیموں پر لاکھوں پونڈ خرچ ڈالے۔ اپریل 2010ء میں برطانوی وزیر اعظم گورڈن براؤن کو ایک بوڑھی پنشنر عورت کو (Bigoted woman) متعصب عورت کہنے پر ساری قوم کے سامنے اس عورت سے معافی مانگنا پڑی۔ اکتوبر 2010ء میں برطانیہ میں ایک 45 سالہ خاتون جو بینک میں ملازمہ تھی۔ اپنی بلی کو کوڑے دان میں پھینکتے ہوئے سی سی ٹی وی کی نظر میں آ گئی۔ بلی کے ساتھ ساری قوم کی یکجہتی اور ہمدردی دیکھ کر مس بیل (Bale) کے خلاف فوری قانونی چارہ جوئی کی گئی، باقاعدہ مقدمہ چلا اور سزا سنائی گئی۔ اپنے ملکوں میں حقوق کی پاسداری کرنے والے یہ لوگ خصوصاً بچے، بوڑھوں اور جانوروں کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہوتے ہیں۔ اپنے سفارت خانے پر حملہ ہونے ......یا کروا کر......اپنے شہریوں کو وہاں سے واپس بلانا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے ہر شہری کی جان و مال، عزت و ناموس کی حفاظت کرنا اپنا مقدس فریضہ سمجھتے ہیں۔ انسانیت کا پاٹ پڑھانے اور پڑھنے والے یہ "مغربی عامل" دوہرے معیار کا ایسا چشمہ لگا کر دیکھتے ہیں کہ انھیں کچھ ملکوں میں بسنے والے انسان یا حیوان بھی نہیں بلکہ کسی دوسرے سیارے کی جناتی مخلوق دکھائی دیتی ہے۔ 32 ممالک کی نیٹو فورس جدید ہتھیاروں سے لیس ہو کر بارودی دھوئیں سے ان "بھوتوں" کو بھسم کرنے کے لیے حملہ آور ہوتی رہتی ہے۔ قابل غور امر یہ ہے کہ اگر جناتی مخلوق میں سے کوئی ان کے دیس میں آ کر "ڈیرا" کر لے تو پھر ان کو بھی مکمل انسانی حقوق سے نوازہ جاتا ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس خطے میں بسنے والوں سے زیادہ اس خطے کے جغرافیے اور وسائل کی اہمیت ہے......ورنہ ان کو اس خطے والوں سے کوئی لینا دینا نہیں۔ صاف دکھائی دے رہا ہے کہ اس خطے میں جو کچھ ہو رہا ہے ایسا کرنے کا موقع فراہم کیا گیا ہے۔ وطن عزیز پاکستان کی سالمیت اور خودمختاری کو خارجی

قوتوں سے زیادہ اندرونی مخفی طاقتوں سے زیادہ خطرہ لاحق ہے۔ جو بیرونی طاقتوں کی آلہ کار بن کر ان کے لیے راستہ ہموار کرتی ہیں۔ اگر کوئی وبائی مرض پھیلا ہو تو اس سے بچنے کے لیے حفاظتی تدابیر کی جاتی ہیں۔ جسم یا جلد پر ان کا اثر ہو بھی جائے تو فوری طبیب سے رجوع کر کے اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے مگر اپنے جسم کے اندر ہی اگر "ناسور" بننا شروع ہو جائے تو تشخیص میں دیر چاہے غفلت، لاپرواہی یا ضرورت سے زیادہ اعتماد کے نتیجے میں ہو "جان لیوا" ثابت ہوتی ہے۔ لہٰذا صحت مند جسم کے لیے ضروری ہے کہ اسے اندرونی بیماریوں سے بھی پاک رکھا جائے۔ اگر کسی بیماری کا پتہ چل جائے تو اس کا بلا تاخیر علاج کیا جائے۔ ورنہ یہ "ناسور" بن کر سارے جسم کو اپاہج کرنے کا موجب بن سکتی ہیں۔ جسم کو اپاہج ہونے یا جان بچانے کی خاطر بعض اوقات جسم کے متاثرہ حصے کو کاٹنا بھی پڑ جاتا ہے۔ جب جسم کو ایسی خطرناک اندرونی بیماریاں لاحق ہو جائیں تو کمزوری کے باعث قوت مدافعت یا دفاعی نظام بھی بری طرح متاثر ہو کر کمزور ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ جس سے بیرونی وباؤں کے حملوں میں بھی شدت آ جاتی ہے۔ موجودہ صورت حال میں ہمیں ایسے سرجن کی ضرورت ہے جو ان "ناسوروں" کو جڑ سے کاٹ کر باہر پھینک دے اور جلد شفایاب کرنے کے لیے "ایمانی ٹانک" بھی پلائے۔ دین اسلام میں "جہاد" ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض قرار دیا گیا ہے مگر اس میں "جہاد اکبر" کرنے کی زیادہ تلقین کی گئی ہے یعنی اپنے آپ سے......اپنے نفس سے جہاد۔ اس کے برعکس بیرونی جارحیت کا جواب دینا "جہاد اصغر" کہا گیا ہے۔ اگر ہم "جہاد اکبر" کرنے والے اصلی جہادی بن جائیں تو ہم اتنے مضبوط ہو جائیں گے کہ خارجی قوتیں کوئی ایسا قدم اٹھانے کی جرات ہی نہیں کریں گی کہ ہمیں "جہاد اصغر" کرنا پڑے۔ ورنہ موجودہ حالات بھی آپ کے سامنے ہیں اور آنے والے دنوں کا بھی کوئی نا کوئی نقشہ آپ کے ذہنوں میں محفوظ ہوگا۔ اکیسویں صدی کے اس اہم ترین موڑ پر انسانی حقوق کے دعوی دار ایک طرف تو جانوروں کی دیکھ بھال کر رہے ہیں یا اُن کے حقوق کے تحفظ کے لیے سرگرم عمل ہو جاتے ہیں لیکن دوسری طرف اُن کی

اخلاقی پستی کی یہ حالات ہے کہ اقوام متحدہ کے تسلیم شدہ انسانی بنیادی حقوق کی دھجیاں اڑانے میں لمحہ بھر کی تاخیر نہیں کرتے۔عالمی طاقت کے شعبدہ باز ایک طرف معاہدے کرتے ہیں تو دوسری طرف خود ہی اُن کی پاسداری سے بھاگ جاتے ہیں۔حقیقت تو یہ ہے کہ طاقتور کا کمزور سے کوئی معاہدہ ہوتا ہی نہیں بلکہ کمزور مصلحت کا شکار ہو کر ہر معاہدے کو مان لیتا ہے اور اُس پر اتنی دیر تک قائم رہتا ہے جب تک وہ خود طاقتور نہیں ہو جاتا۔ہم اگر چاہتے ہیں کہ ہمیں دنیا میں وہی مقام ملے جس کے ہم اپنے آپ کو مستحق خیال کرتے ہیں تو ہمیں بہت زیادہ طاقتور ہونے کی ضرورت ہے اور طاقت ہمیشہ اندرونی ہوتی ہے کیونکہ اندرونی تصویر ہی بیرونی دنیا کے پاس جاتی ہے جس کے بعد آپ کے معاشرتی مقام کا تعین کیا جاتا ہے۔یہی آپ کی قومی سلامتی کی ضمانت ہے اور یہی آپ کے قومی وجود کی اہمیت کا تعین کرے گی۔ورنہ یہ تو طے شدہ ہے کہ جن کے ساتھ ہم معاہدے بھی کرتے ہیں اور پھر وہ ہمارے ملک میں دہشتگردی سے لے کر فضائی حملوں تک ہر معاملے میں پیش پیش رہتے ہیں۔اُن کے نزدیک اُن کے وطن کے جانور بھی ہم سے زیادہ حقوق رکھتے ہیں۔قومی سلامتی کا تو اُسی وقت سوچا جائے گا جب ہم ایک قوم کی حیثیت سے ابھر کر اقوام عالم کے سامنے آئیں گے۔بے ہنگم ہجوم،صوبہ پرستی کی لعنت میں غرقاب،لبریشن آرمیوں کا قیام،سندھ اور پنجاب کارڈز کا استعمال، صوبوں کے درمیان وسائل کی نا منصفانہ تقسیم یہ سب کیا ایک قوم ہونے کی نشانیاں ہیں یا متحارب اور متصادم گروہوں کی۔جس دن ہم ایک قوم بن کر عالمی برداری کو پیغام دینے میں کامیاب ہو گئے اُس دن کے بعد کوئی بیرونی ہاتھ پاکستان میں مداخلت نہیں کرے گا،کوئی نیٹو پاکستان کی افواج پر حملہ آور نہیں ہو گی،کوئی لیاقت علی خان، ذوالفقار علی بھٹو اور بے نظیر شہید نہیں کیے جائیں گے،کوئی فوج بغاوت نہیں کرے گی اور کوئی سورما ہمیں پتھر کے عہد میں پہنچانے کی بات نہیں کرے گا۔قومی سلامتی تو اُسی وقت ممکن ہے جب ہم ایک قوم ہو کر اپنی سلامتی کی حفاظت کریں گے۔محرم کے مقدس مہینے میں بھی اگر ہم نے حق گوئی سے کام نہیں لیا تو سارا سال ہماری حالت کیا ہو گی؟ نا جانے

کیوں ہم حق گوئی کرتے ہوئے جرات سے کام نہیں لیتے حالانکہ حق گوئی ہی واحد رستہ ہے جس پر سفر کرتے ہوئے ہم ایک قوم بھی بن سکتے ہیں اور اپنی قومی سلامتی کی حفاظت بھی کر سکتے ہیں لیکن یہاں تو ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ دوسرا شخص تو حق و صداقت میں یکتا ہونا چاہیے لیکن خود وہ سچ اور حق گوئی سے اجتناب برتنے میں ہی عافیت سمجھتا ہے۔جب ہم قوم بننے کے لیے حق گوئی سے کام نہیں لے رہے تو پھر کسی اور قوم کے لیے ہماری اخلاقیات کیا ہوں گی اس کا اندازہ ہم موجودہ ملکی صورت حال دیکھ کر ہی لگا سکتے ہیں۔کربلا کا درس کسی فرد یا کسی خاص گروہ سے منسوب نہیں ہے یہ تو سب کے لیے ہے اور بقول شاعر

کس نے کہا ہے یہ کہ ہماری ہے کربلا
حق بات تم کہو تو تمہاری ہے کربلا

روزنامہ ”دن“ لاہور 9 دسمبر 2011ء
دی نیشن لندن 23 دسمبر 2011ء

قابل غور

☆ شاید افغانستان اور عراق میں ''نیٹو گردی'' کر کے وہ یہ بھول گیا تھا کہ اب وہ برطانیہ واپس آ چکا ہے، جہاں انسان بستے ہیں۔

☆ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انسانی حقوق کے تحفظ کے قوانین

جگہ، ماحول اور فرد کی بنیادی اور ریاستی اہمیت دیکھ کر لاگو کیے جاتے ہیں۔

☆ دراصل ہمارے ساتھ آج تک جو کچھ ہوتا رہا ہے، جو کچھ ہو رہا ہے-----اور جو کچھ ہونے جا رہا ہے اس میں ''قصور وار'' کرنے والا نہیں بلکہ ''کروانے والا'' ہے۔

☆ ریلوے کی حالت زار پر تو انگریز بھی خون کے آنسو بہا رہا ہو گا کہ جس ادارے کو ہم نے اتنے ارمانوں اور محنت سے مشترکہ ہندوستان میں متعارف کروایا اس کو تباہی کی دلدل میں دھکیلنا ان کے خلاف سازش ہو ہے۔

موجودہ حالات کا ذمہ دار کون۔۔۔؟

چند ماہ قبل برطانوی اخبار میں ایک عدالتی فیصلے کی تفصیل شائع ہوئی۔ جس کی رپورٹ کے مطابق ایک برطانوی شخص کو عدالت میں پیش کیا گیا جو ایک مقامی کونسل کا ملازم تھا۔ کونسل کی گاڑی کے ساتھ جا کر مکانوں اور فیکٹریوں کے باہر کوڑے دانوں کو خالی کرنا اس کی ذمہ داری تھی۔ ایک دن وہ کسی سمال انڈسٹری (چھوٹی فیکٹری) سے کوڑا کرکٹ اٹھانے گیا تو اس نے دیکھا کہ کوڑے دانوں میں پڑا ہوا کچرا حکومت کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق نہ تھا۔ کوڑے کے ڈبوں کے مخصوص رنگ کا مطلب اس میں صرف مذکورہ کچرا ہی پھینکنا ہوتا ہے مگر فیکٹری والوں نے اس میں احتیاط نہ برتی اور تمام کوڑے دانوں میں مکس کچرا پھینک دیا۔ اس پر کونسل کے ملازم نے کوڑے کے ڈبوں کو خالی نہ کیا بلکہ ان کوڑے دانوں پر ایک نوٹس چسپاں کر کے چلا گیا جس پر تحریر تھا "کوڑے کو گورنمنٹ کے بتائے اصول کے مطابق نہیں جمع کیا گیا لہٰذا اسے نہیں اٹھایا جائے گا" اس نے اپنے مقدمے کو مضبوط بنانے کے لیے کچرے کے ڈبوں کی تصاویر بھی لے لیں۔ اس کے جانے کے بعد جب فیکٹری کے مالکان نے کوڑے دانوں پر چسپاں نوٹس پڑھا تو انہوں نے کونسل کے ملازم کی شکایت کر دی اور معاملہ عدالت تک پہنچ گیا۔ جج نے کونسل کے ملازم کا جب سابقہ ریکارڈ دیکھا تو اس کو پتہ چلا کہ کونسل میں ملازمت سے قبل یہ برٹش آرمی میں سروس کر چکا تھا اور عراق و افغانستان کی جنگوں میں حصہ بھی لے چکا تھا۔ جج صاحب نے اس کو کہا کہ کوڑے کے ڈبے خالی کرنا تمہاری ڈیوٹی تھی اور اگر ڈبوں میں قوانین کے مطابق کوڑا نہیں پھینکا گیا تھا تو تمہارا کام تھا کہ اس کی شکایت اپنی کونسل کو دیتے۔ مگر تم نے اپنا قانون بنا کر خود ہی فیصلہ کر ڈالا برطانوی شہری کے حقوق کا خیال نہیں رکھا گیا۔ کچرا وہیں چھوڑ جانا تحفظ صحت کے اصولوں کے

منافی تھا۔ لہٰذا ملازم کو نوکری سے نکالنے کا حکم جاری کیا گیا اور ساتھ اس کو جرمانہ بھی کیا گیا۔ شاید افغانستان اور عراق میں "نیٹو گردی" کر کے وہ یہ بھول گیا تھا کہ اب وہ برطانیہ واپس آ چکا ہے، جہاں انسان بستے ہیں۔ اسی طرح سی آئی اے کے ایجنٹ رایمنڈ ڈیوس کو امریکہ میں ایک امریکی شہری سے الجھنے کی بنا پر عدالت کے سامنے پیش ہونا پڑا۔ جس کو شاید پاکستان میں رہ کر 'امریکن گردی' کی عادت پڑ گئی تھی۔ عجیب بات ہے کہ دنیا میں انسانی حقوق کا پرچار کرنے والے جب ہمارے خطے میں ہوتے ہیں تو ان کو سب "خون معاف" ہوتے ہیں اور یہی لوگ جب اپنے ممالک میں کوئی معمولی نوعیت کا جرم بھی کریں تو ان کو انسانی حقوق پامال کرنے کی سزا دی جاتی ہے۔ پاکستانی کرکٹرز کو برطانوی عدالت نے جس جرم کی سزا دی اس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ آج تک کسی کھلاڑی کو جوئے یا سٹے بازی میں ملوث پائے جانے کی وجہ سے پابند سلاسل نہیں کیا گیا۔ عدالتی کارروائی اور فیصلہ دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ کھلاڑیوں کا جوئے یا سٹے بازی میں ملوث پائے جانے سے بڑا یہ جرم تھا کہ وہ پاکستانی تھے۔ ورنہ کرکٹ میں جوئے کا ہیڈ آفس تو بھارت میں ہے۔ جہاں کئی کھلاڑی اس گھناؤنے جرم میں مرتکب پائے گئے ہیں۔ مگر اتنی سخت سزا کسی کو نہیں ہوئی۔ کتنی عجیب بات ہے کہ انسانیت کا پرچار کرنے والے، انسانی حقوق کے علمبردار ہونے کا دعویٰ کرنے والے اپنے ملک میں تو قانون اور انصاف کی بالادستی قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے چاہے ان کو غیر ملکی کھلاڑیوں کو عبرت کا نشان ہی کیوں نہ بنانا پڑے۔ رائمنڈ ڈیوس ہو یا کوئی کونسل کا ملازم (سابقہ برٹش فوجی) اگر وہ پاکستان، عراق یا افغانستان میں انسانیت کی دھجیاں بکھیریں یا انسانی اعضاء کے لوتھڑے فضاء میں بکھیرتے رہیں ...... ان کو کھلی چھٹی دے دی جاتی ہے بلکہ ان کو ایسا کرنے کا لائسنس دیا جاتا ہے۔ وہی لوگ جب ان کے اپنے ملک میں کوئی معمولی نوعیت کا جرم بھی کرتے ہیں تو قانون کی غیرت جاگ جاتی ہے۔ ان کو انصاف کے کٹہرے میں لایا جاتا ہے، جرمانے اور سزائیں دی جاتی ہیں۔ ان کرائے کے غنڈوں کو اپنے ممالک میں کسی قسم کا کوئی استثناء نہیں دیا جاتا۔ اس سے صاف ظاہر

ہوتا ہے کہ انسانی حقوق کے تحفظ کے قوانین جگہ، ماحول اور فرد کی بنیادی اور ریاستی اہمیت دیکھ کر لاگو کیے جاتے ہیں۔ بھلا ہم بیرونی قوتوں سے حق اور انصاف کی کیسے امید کر سکتے ہیں ......؟ جب ہمارا اپنا نظام ہی تباہی کی ساری حدود پار کر چکا ہے۔ یہ ایک فطری عمل ہے اگر کسی ملک میں ظالم حکمران رعایا کے حقوق سلب کریں گے تو بیرونی طاقتیں ان حکمرانوں کو رعایا سمیت اپنی وحشت کے لیے تختہء مشق بنا لیتے ہیں۔ دراصل ہمارے ساتھ آج تک جو کچھ ہوتا رہا ہے، جو کچھ ہو رہا ہے......اور جو کچھ ہونے جا رہا ہے اس میں "قصور وار" کرنے والا نہیں بلکہ "کروانے والا" ہے۔ یہ وہ ملک دشمن عناصر ہیں جو "مادیت پرستی" میں بے غیرتی کے اتھاہ گہرائیوں میں غرق ہونے سے بھی نہیں گھبراتے۔ بگرام جیل میں کچھ پاکستانیوں کے قید ہونے کی تصدیق ہوئی ہے۔ ان کو قید میں ڈالنے والے امریکی قصوروار ہیں یا بردہ فروش جنہوں نے اپنے ملک سے ان کو پکڑ کر امریکیوں کے حوالے کیا......! ہو سکتا ہے وہ کسی ممنوعہ فعل میں ملوث ہی ہوں مگر اس کی سزا پاکستان میں کیوں نہ دی گئی؟ سلالہ چیک پوسٹ پر پاک فوج پر حملہ کر کے ان کو دہشت گردی کے خلاف جنگ میں فرنٹ لائن اتحادی بننے کا انعام دیا جاتا ہے۔ اس میں قصور نیٹو فورس کا ہے یا ان کا جنہوں نے ان سانپوں کو آستین میں جگہ دی؟ ڈرون حملوں کے خلاف قرارداد منظور کرنے کا ٹوپی ڈرامہ رچایا گیا۔ اب حقیقت کھل کر سامنے آ چکی ہے کہ ڈرون حملہ کرنے والوں کا قصور ہے یا ان غداروں کا جنہوں نے محض اقتدار کی ہوس کو پورا کرنے کے لیے نہ صرف اس کی اجازت دی بلکہ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے اپنے ایربیس بھی عنایت کیے۔ تقریباً 2 دہائیوں سے دہشت گردی نے وطن عزیز کی فضاء ایسی آلودہ کی ہوئی ہے کہ بارودی گھٹائیں چھٹنے کا نام ہی نہیں لے رہیں۔ کیا قصور صرف دہشت گردی کرنے والوں کا ہی ہے یا ان کا بھی جو ایسے حالات پیدا کرنے کے موجد ہیں؟ یہ ایک کڑوا سچ ہے کہ کوئی خارجی قوت ہماری زبوں حالی کی ذمہ دار نہیں بلکہ اس کے ذمہ دار ہم خود ہیں۔ اسٹیل ملز آف پاکستان کو امریکیوں نے ہڑپ نہیں کیا اس کو ڈکارنے والے ہم میں ہی موجود ہیں۔ دنیا کی بہترین ایرلائنز

میں شمار ہونے والی پی آئی اے کے جہازوں کو نیٹو فورسز کے فائٹر ایر کرافٹس نے لنگڑا لولا نہیں کیا۔ اس ادارے کو تباہ کرنے والے آج بھی اشرافیہ میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ ریلوے کی حالت زار پر تو انگریز بھی خون کے آنسو بہا رہا ہوگا کہ جس ادارے کو ہم نے اتنے ارمانوں اور محنت سے مشترکہ ہندوستان میں متعارف کروایا اس کو تباہی کی دلدل میں دھکیلنا ان کے خلاف سازش ہو ہے۔ اس کا ستیاناس کرنے والے بھی ہم خود ہیں۔ الیکشن لڑنے کے لیے "ڈگری" کی شرط رکھی گئی۔ پھر کسی کو جعلی ڈگری کی وجہ سے وزارت چھوڑنی پڑی تو وہی "جعلی ڈگری ہولڈر" ڈگری کی شق ختم ہونے کے بعد دوبارہ الیکشن میں حصہ لیتا ہے اور کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ اس میں کامیاب ہونے والے کا کمال ہے یا اس کو کامیاب کروانے والوں کا قصور......؟ کچھ عرصہ قبل اسرائیل نے اپنا ایک صحافی آزاد کروانے کی خاطر درجنوں فلسطینیوں کو آزاد کرنے کی کڑوی گولی نگل لی۔ ایران کے شہروں کے تمام چوک ان کے لیڈروں کی تصاویر سے سجائے گئے ہیں جو عوام میں ان کی مقبولیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہ عوامی طاقت ہی ہے جو ان کے لیڈروں کو ایٹمی طاقت نہ ہونے کے باوجود بیرونی طاقتوں سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ ان کی سمندری حدود میں کوئی میرین خلاف ورزی کرے یا کوئی ڈرون ان کی فضائی حدود پار کرنے کی جسارت کرے تو اس کو قابو میں کر کے اپنے ملک سے وفاداری کا ثبوت دیتے ہیں۔ ایسا کرنے کے لیے لیڈر کو عوامی ہونا پڑتا ہے۔ جس ملک میں لیڈر اپنی عوام کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم رکھیں تو یہ کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ دنیا میں اس ملک اور اس میں بسنے والوں کی عزت افزائی ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے جیسی قوم ہو میں ان پر ویسے ہی حکمران مسلط کر دیتا ہوں۔ ان حکمرانوں کو اپنے حقوق سلب کرنے کے لیے کندھوں پر بیٹھا کر اقتدار کے ایوانوں تک ہم خود لاتے ہیں۔ ہمارے سیاسی شعور کی حالت یہ ہے کہ ہم چار سالوں تک جس کو برا بھلا کہتے ہیں پانچویں سال الیکشن میں اُسی کی انتخابی مہم کا حصہ ہوتے ہیں۔ لوٹے ہمیشہ سیاست دان بنتے ہیں لیکن اگر پاکستان کی سیاسی جماعتوں کے ورکرز یہ طے کر لیں کہ وہ

صرف اُسی کی انتخابی مہم کا حصہ بنیں گے جس نے پاکستان کو خدمات فراہم کی ہیں تو ہمارا ہر مسئلہ حل ہو سکتا ہے لیکن پسے ہوئے طبقات کے پاس لے دے کر اک انا ہی ہوتی ہے جس پر وہ کبھی سودا بازی نہیں کرتے اور جس پارٹی کا حصہ بن جائیں ہمیشہ اُسی کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔اور پسے ہوئے طبقات کی یہ انا بھی بالادست طبقات کے اقتدار کو طوالت بخشنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔کاش پاکستان میں تعلیم کو ہر خاص وعام کے لیے عام اور لازمی کر دیا جائے تو شاید پاکستان کی تقدیر بھی کسی دن بدل جائے ورنہ ہم ہمیشہ ایک سوال کے ملبے تلے ہی دبے رہیں گے کہ پاکستان کو ان حالات تک پہنچانے والے پاکستان کے بالادست طبقات ہیں یا وہ لوگ جو ان کو ہر انتخاب میں گنگا آشنان کروا کر اسمبلیوں میں بھیج دیتے ہیں۔کیا یہ بات درست نہیں کہ اگر ہم خود ٹھیک ہوں تو ایسے حکمران ہم پر مسلط نہیں ہو سکتے۔تو پھر سوچنے والی بات تو یہ ہے کہ اصل "قصور وار کون" حکمران یا عوام......؟؟؟

دی ایشٹر 10 دسمبر 2011ء

❀.....❀.....❀

قابل غور

☆ جیسے روزہ رکھ کر کسی بھوکے کی تکلیف اور درد کا احساس ہوتا ہے اسی طرح کچھ عرصہ فوج میں رہ کر عوام کو یہ پتہ چل جاتا ہے کہ.....فوج میں موج نہیں.....!!!!

☆ میاں محمد نواز شریف پرویز مشرف کو اسی آئینی شق کے

تحت سزا دلوانے کے خواہشمند ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی چاہتے ہیں کہ اس کا اطلاق جنرل ضیاء الحق اور اُن پر نہ ہو۔اسی طرح عمران خان ساری کائنات سے اثاثے طلب کر رہے ہیں لیکن اولاد سے بڑا اثاثہ کوئی نہیں ہوتا ٹیرن خان کے حوالے سے انہوں نے قوم کو آج تک کچھ نہیں بتایا۔

☆ جماعت اسلامی کو ضیاء الحق پسند تھا لیکن جنرل مشرف کو وہ سزا دلوانا چاہتے ہیں۔پیپلز پارٹی جنرل ضیاء الحق کو ام الخبائث ڈکلیئر کرتی ہے لیکن جنرل مشرف کو ریڈ کارپٹ فراہم کر دیتی ہے۔

☆ پاک فوج کے 26 جوانوں کو بغیر کسی وجہ کے شہید کر دیا جاتا ہے مگر ان کے لیے ایک گھنٹے کے سوگ کا اعلان بھی نہیں کیا جاتا۔ آج تک کبھی 26 سیاستدان، دانشور یا صحافی بھی اکٹھے قربان ہوئے ہیں؟

فوج میں موج نہیں۔۔۔سیاست میں منافقت نہیں

دوسری جنگ عظیم کے بعد جرمنی میں مردوں کی شرح عورتوں کے مقابلے میں بہت کم ہوگئی تو جرمنی کو از سر نو تعمیر کرنے کے لیے ترکی سے کافی تعداد میں مرد حضرات ”برآمد“ کیے گئے۔جنہوں نے جرمنی کو دوبارہ اپنے پاؤں میں کھڑا کرنے میں بڑی مدد کی۔یہی وجہ ہے کہ آج جرمنی کے ہر شہر میں ترکوں کی ایک کثیر تعداد دکھائی دیتی ہے۔ ان کو دوسرے غیر ملکیوں پر یہ فضیلت حاصل ہے کہ انھیں غیر ملکی نہیں بلکہ ”Gastarbaiter“ یعنی ”کام کرنے والے مہمان“ کہا جاتا ہے۔اپنے دفاعی نظام کو مضبوط بنانے کے لیے جولائی 1956ء میں جرمنی نے فوج میں جبری بھرتی کا نظام لاگو کیا۔جسے 1968ء میں جرمنی کے بنیادی قانون میں شامل کرلیا گیا۔جس کے تحت ہر جرمن نوجوان کو 18 سے 23 برس کی عمر تک فوج میں شامل ہو کر کم از کم 6 ماہ کی تربیت حاصل کرنا لازمی تھا لڑکیاں اور معذور افراد اس سے مستثنیٰ قرار دیے گئے۔اگر کوئی صنف نازک اپنی مرضی سے فوجی تربیت کے لیے فوج میں شمولیت اختیار کرنا چاہے تو اس پر کوئی پابندی نہ لگائی گئی۔اس لازمی فوجی تربیت کا خرچہ جرمن حکومت اٹھاتی اور دوران تربیت وظیفہ بھی دیا جاتا۔اس لازمی تربیت کے لیے کمپنی مالکان کو اس چیز پر بھی پابند کیا گیا تھا کہ اگر کسی نوجوان کو کام کے دوران فوجی تربیت کے لیے جانا مقصود ہو تو اس کو اتنا عرصہ کے لیے رخصت دی جائے اور ٹریننگ کے اختتام پر اسے کام پر دوبارہ رکھنا بھی لازمی قرار دیا گیا۔حالیہ معاشی بحران سے جرمنی بھی محفوظ نہ رہ سکا لہٰذا جرمن چانسلر انجیلا مرکل (Angela Merkel) نے پارلیمنٹ کی باہمی مشاورت سے فوج میں جبری بھرتی کے اس قانون کو ختم کر دیا۔گزشتہ 54 برس سے جرمنی میں اس قانون کے تحت 8.5 ملین نوجوانوں کو فوجی تربیت دی گئی۔جس کا سارا خرچ حکومت کو برداشت

کرنا پڑا۔اب اس خرچے کو بچا کر حکومت اس رقم کو ملک کے تعمیری کاموں میں استعمال کرنا چاہتی ہے۔یوں جرمنی بھی ان 99ملکوں میں شامل ہو گیا ہے جہاں فوج میں شمولیت فرد کے منشاء کے تابع ہوتی ہے۔پاکستان کا نام بھی ان 99ممالک کی فہرست میں شامل ہے جہاں فوجی تربیت لازمی قرار نہیں دی گئی۔بلکہ لوگ اپنی مرضی سے یہ پیشہ چنتے ہیں۔ریاستِ پاکستان کو آج تک اپنے لوگوں کو فوج میں جبری بھرتی کرنے کی نوبت نہیں آئی۔لوگ اپنی مرضی اور جذبے سے پاک فوج میں شمولیت اختیار کرتے ہیں۔خدا تعالیٰ کے خاص فضل سے پیشہ وارانہ مہارت کے اعتبار سے ہماری فوج کا دنیا کی سات بہترین افواج میں شمار کیا جاتا ہے۔آج بھی دنیا میں بہت سے ایسے ممالک ہیں جہاں ہر نوجوان کو کچھ عرصہ فوج میں گزارنا لازمی ہے۔اس نظریے کے تحت عام شہری کو کچھ عرصہ فوج میں تربیت دینے کا مقصد دفاعی نظام کو مضبوط بنانا ہوتا ہے۔اس کے ساتھ دورانِ تربیت سب سے ایک جیسا سلوک کر کے مساوات کا درس بھی دیا جاتا ہے۔ہر کسی کو اپنا کام خود کرنے کا عادی بنایا جاتا ہے۔کسی امیر کو غریب پر کوئی فوقیت نہیں دی جاتی۔عوام الناس کو فوج میں تربیت حاصل کر کے فوجی زندگی کی مشکلات اور اہمیت کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے جوان کی حفاظت کے لیے سرحدوں پر انحصار ہے ہوتے ہیں۔جو بلا شبہ بڑی "tough and rough" ہوتی ہے۔جیسے روزہ رکھ کر کسی بھوکے کی تکلیف اور درد کا احساس ہوتا ہے اسی طرح کچھ عرصہ فوج میں رہ کر عوام کو یہ پتہ چل جاتا ہے کہ.....فوج میں موج نہیں.......!!!!ہماری مسلح افواج بھی ان تکلیفوں کو برداشت کر کے اپنا قومی فریضہ جوش و جذبے سے سرانجام دیتی ہیں۔سیاچین کی یخ بستہ پہاڑی چوٹیاں ہوں یا تپتے صحرا، ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہو یا بلند و بالا فضاء، وسیع و عریض میدان ہوں یا گھنے جنگلات ہر جگہ چاک و چوبند نظر آتے ہیں۔وطنِ عزیز میں کچھ عرصے سے ایک خاص طبقہ صرف اس بات کی تشہیر کر رہا ہے کہ ملک کی موجودہ قابلِ رحم صورتحال کی ذمہ دار پاک فوج ہے۔اس مکروہ کام میں کچھ سیاسی اکابرین، چند دانشور حضرات اور کچھ میڈیا کے نمائندگان بھی شامل ہیں۔اگر ان حضرات کو زندگی میں ایک

بار آگ برستے سورج تلے گرم ریگستانوں میں فوجی مشق میں ساتھ شامل کر لیا جائے تو فوج کے خلاف ان کا سارا بخار اتر جائے۔پاکستان کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ آج تک جب بھی کسی آمر نے شب خون مارا ہے اس کے لیے راستہ ہموار سیاستدانوں نے کیا ہے۔موجودہ جمہوری حکومت کو بھی ختم کرنے کے لیے انہی سیاستدانوں نے کئی بار جی ایچ کیو کو نہ صرف بآوازِ بلند خوش آمدید بلکہ لبیک کہتے ہوئے اپنے وفاداری کا یقین بھی دلا چکے ہیں۔موجودہ دور کی کونسی ایسی سیاسی جماعت ہے جس کا کبھی ان آمروں سے تعلق نہ رہا ہو؟ ان میں سے اکثریت ان لوگوں کی ہے جو آمریت کی گود میں کھیل کود کر ہی "سیاسی کھلاڑی" بنے۔جنہوں نے نہ صرف آمریت کو قبول کیا بلکہ اس کی بھرپور حمایت بھی کی۔چند آمروں کی "مہم جوئیت" کا ذمہ دار ساری فوج کو نہیں کہا جا سکتا۔ملک میں آمریت کے ذمہ دار بھی جمہوریت کے یہ نام نہاد علمبردار ہیں۔اس کے نتیجے میں جو نقصانات ہوئے ان میں بھی یہ برابر کے شریک ہیں۔یہ سیاستدان آپکو آئین کی آرٹیکل 6 (1) کا حوالہ دیتے نظر آئیں گے لیکن ان کے منہ سے کبھی آپ آرٹیکل 6 (2) کا ذکر نہیں سنیں گے۔آئین کی آرٹیکل 6(1) کچھ یوں ہے کہ "کوئی شخص جو طاقت کے استعمال یا طاقت سے یا دیگر غیر آئینی ذریعے سے دستور کی تنسیخ کرے یا تنسیخ کرنے کی سعی یا سازش کرے،تخریب کرے یا تخریب کرنے کی سعی یا سازش کرے سنگین غداری کا مرتکب ہو گا۔یہ ہے وہ آرٹیکل 6(1) جس پر عملدرآمد کرنے کا مطالبہ سیاستدان کرتے دکھائی دیتے ہیں لیکن بدیانتی یہ ہے کہ یہ عوام کو آدھا سچ بتاتے ہیں اس آئین کی اسی آرٹیکل 6(2) پر بھی ایک نظر ڈالتے ہیں جس سے کچھ حقیقتیں اور بھی آشکار ہو جائیں گی۔آرٹیکل 6(2) کے مطابق کوئی شخص جو شق (1) میں مذکورہ افعال میں مدد دے یا معاونت کرے، اسی طرح سنگین غداری کا مرتکب ہو گا۔اب آپ خود ہی ملاحظہ فرمائیں کہ یہ سیاستدان آرٹیکل 6(1) کا مطالبہ کیوں کرتے ہیں اور آرٹیکل 6(2) کا اطلاق کیوں نہیں چاہتے۔اگر آئین کی آرٹیکل 6 کی تمام شقوں پر مکمل عملدرآمد ہو جائے تو پاکستان کی تمام سیاسی جماعتوں کے قائدین بدترین غدار اور

غداری کی سزا پاکستان پینل کوڈ میں سزائے موت لکھا ہے۔اب تو اس میں وہ جج صاحبان بھی شامل ہو چکے ہیں جو کسی آمر سے پی سی او کے تحت حلف اٹھائیں گے۔میں کسی صورت بھی کسی آمر کا حامی نہیں ہوں لیکن اگر انصاف کرنا ہے تو پھر سب کے ساتھ ایک جیسا ہونا چاہیے۔میاں محمد نواز شریف پرویز مشرف کو اسی آئینی شق کے تحت سزا دلوانے کے خواہشمند ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی چاہتے ہیں کہ اس کا اطلاق جنرل ضیاءالحق اور اُن پر نہ ہو۔اسی طرح عمران خان ساری کائنات سے اثاثے طلب کر رہے ہیں لیکن اولاد سے بڑا اثاثہ کوئی نہیں ہوتا۔ ٹیرن خان کے حوالے سے انہوں نے قوم کو آج تک کچھ نہیں بتایا۔مجھے تو یہ بھی ڈر ہے کہ کہیں کسی جماعت نے عمران اور ٹیرن کا ڈی این اے ٹیسٹ کروا کر الیکشن کمیشن میں جمع کروا دیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ایم کیو ایم ہمیشہ ہر جرنیل کے ساتھ رہی بلکہ جرنیل اقتدار میں نہ بھی ہوں تو یہ جرنیلوں کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔جماعت اسلامی کو ضیاءالحق پسند تھا لیکن جنرل مشرف کو وہ سزا دلوانا چاہتے ہیں پیپلز پارٹی جنرل ضیاءالحق کو ام الخبائث ڈکلیئر کرتی ہے لیکن جنرل مشرف کو ریڈ کارپٹ فراہم کردیتی ہے۔سیاستدانوں کے یہ دوہرے معیارات ہی دراصل جمہوریت کے رستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہیں اور حقیقت تو یہی ہے کہ ان سیاستدانوں کے ذاتی مفادات کی پالیسی نے آج بیرونی قوتوں کو اتنا حوصلہ بخش دیا ہے کہ وہ ہمارے سویلین اور فوجی جوانوں کو اپنی بربریت کا نشانہ بنا کر معافی تو درکنار انہیں ملال بھی نہیں ہوتا۔ملک کی سرحدوں کی حفاظت پر مامور پاک فوج کے 26 جوانوں کو بغیر کسی وجہ کے شہید کردیا جاتا ہے مگر ان کے لیے ایک گھنٹے کے سوگ کا اعلان بھی نہیں کیا جاتا ۔کیا آج تک کبھی 26 سیاستدان، دانشور یا صحافی بھی اکٹھے قربان ہوئے ہیں؟ ان قربانیوں کے باوجود ایک خاص گروہ عوام الناس کو پاک فوج سے بدظن کرنے کی کوشش میں سرگرداں ہے۔کہتے ہیں کہ ”یہ بندوق نہیں اس کے پیچھے انسان ہے جو اس کو چلا رہا ہے۔یہ انسان نہیں اس کا جذبہ ہوتا ہے جو اس کو بندوق اٹھا کر چلانے کی طاقت دیتا ہے۔یہ طاقت قوم کی دعاؤں اور بھروسے کی مرہون منت

ہوتی ہے“۔ ہماری فوج کو صرف قومی حمایت اور اعتماد کی ضرورت ہے۔نیٹو فورس کے حالیہ حملے نے دہشت گردی کے خلاف بلکہ دہشت گردی کی جنگ سے نکلنے کا ایک جواز فراہم کردیا ہے۔جس کو بنیاد بنا کر ہم Do more کا جواب No more میں دے کر ایک نئے باب کا آغاز کرسکتے ہیں جو یقیناً ہمیشہ ہمیشہ کے لیے امریکی تسلط سے رہائی کا پروانہ ہوگا۔دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اتحادی بن کر جو نقصان ہم نے اٹھایا ہے اس سے زیادہ نقصان اس اتحاد سے نکل کر کسی صورت نہیں ہو سکتا۔اس کے لیے تمام اداروں کو صرف پاکستان کی سلامتی اور خودمختاری کو مدنظر رکھ کر الزامات کے ناپاک کھیل کو ترک کرکے مستقل بنیادوں پر فیصلے کرنے ہونگے۔اس کے لیے محض قرارداد منظور کرنے سے کچھ نہیں ہوگا بلکہ عملی طور پر کچھ کرکے دکھانا ہوگا۔اس بار بھی اگر قرارداد یا کوئی بل منظور کرلیا گیا یا ماضی کی طرح کمیشن تشکیل دے کر معاملہ ہمیشہ کے لیے دبا دیا گیا تو ایسے حملے شدت اختیار کرتے جائیں گے۔دنیا میں آج بھی تقریباً 19 ممالک ایسے موجود ہیں جہاں ان کی اپنی کوئی فوج نہیں مگر پاکستان کی جغرافیائی صورت حال ایسی ہے کہ اسے صرف فوج ہی نہیں بلکہ نہایت ہی پیشہ وارانہ فوج کی ضرورت ہے۔یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل، ذوالفقار علی بھٹو کی دیانت اور پاک فوج کی پیشہ وارانہ صلاحیتوں کا نتیجہ ہے کہ ہم ایٹمی صلاحیت والا اسلامی پاکستان ہیں۔یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ نہ تو فوج میں ......موج ہے اور نہ ہی حقیقی سیاست میں منافقت چلتی ہے خواہ اس میں جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔!!!!!

روزنامہ ”دن“ لاہور 14 دسمبر 2011ء

دی نیشن لندن 16 دسمبر 2011ء

قابل غور

☆ جرائم کی شرح سب سے زیادہ ہونے والے پہلے دس ممالک میں ایک بھی مسلمان ملک شامل نہیں۔

☆ جہاں پر جرم رپوٹ ہونے کی شرح سب سے کم ہے ان میں اکثریت اسلامی ملکوں کی ہے۔

☆ انسان اپنی غلطی دوہرانا چھوڑ دے تو دنیا کے کسی خطے میں تاریخ اپنے آپکو نہیں دوہرائے گی۔

☆ اور اس سے بڑی غلطی اور کیا ہوگی کہ ہم اب بھی امریکہ کو اپنا دوست سمجھیں!

☆ ممکن ہے دینا کی کسی دوسری قوم کے پاس ابھی بہت سی غلطیاں کرنے کی گنجائش ہو لیکن ہمارے پاس اب غلطی کی کوئی گنجائش نہیں

☆ آمرانہ ادوار میں ملنے والی امداد ہے جو جمہوری حکومتوں کے دور سے زیادہ ہے

پاکستان امریکہ سے خلاصی کرائے بغیر ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہوسکتا

نسل انسانی کی مجموعی تاریخ کو اگر غور سے دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے خفیہ منصوبہ کے ذریعے ایک ایسا سیاسی آئین نافذ کرنا چاہتی ہے جس میں انسان کو عطا کی ہوئی تمام صلاحیتوں کی پوری طرح نشوونما کی ضمانت موجود ہو۔نوع انسان کی ترقی کے لیے ایسے معاشرے کی ضرورت ہے جو نہ تو سخت گیر ہو اور نہ بالکل آزاد۔معاشرہ ایسا ہونا چاہیے جس میں افراد کو زیادہ سے زیادہ آزادی فکر بھی حاصل ہو اور ایک دوسرے پر تنقید کرنے کا حق بھی۔لیکن اس کے ساتھ اس آزادی کی حدود نہایت صاف طور پر متعین کردی جائیں تاکہ ایک فرد کی آزادی دوسرے فرد کی آزادی سے متصادم نہ ہو بلکہ دونوں ایک ساتھ قائم رہ سکیں۔لیکن یہ کافی نہیں کہ اس قسم کا معاشرہ صرف ایک ملک یا چند ممالک میں قائم ہو جائے اور باقی دنیا میں دوسری قسم کا معاشرہ اپنے مکمل وجود کے ساتھ موجود رہے گا۔لہٰذا ضروری ہے کہ یہ متوازن اور ترقی پسند معاشرہ بین الاقوامی سطح پر قائم کیا جائے یعنی اقوام عالم کا اتحاد قائم ہونا چاہیے، جو اخلاقی اور ترقی پسندانہ اصولوں پر قائم ہو اور تمام ممبر ممالک اس کے فیصلوں کے پابند ہوں۔ بین الاقوامی طور پر انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے ادارے قائم کیے گئے جن کا مقصد دنیا میں متوازن معاشرے کو فروغ دینا ہے مگر ان اداروں میں اجارہ داری ان ملکوں کی ہے جو معاشی اور اقتصادی لحاظ سے طاقتور ہیں۔انسانی تاریخ اس چیز کی بھی گواہ ہے کہ طاقتور کمزور کا استحصال تو کرسکتا ہے مگر اس کو معاشرے میں ایسے مقام پر پہنچنے سے روکے گا جہاں سے اس کو یہ محسوس ہونا شروع ہو جائے کہ کمزور طاقتور ہونا شروع ہو رہا

ہے جو اس کی "چودھراہٹ" کے لیے خطرے کی علامت بن سکتا ہے سوائے عبرت کا نشان بنانے کے لیے ہر قسم کا غیر انسانی ہتھکنڈا استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔افسوس کی بات یہ ہے کہ ظلم کدہ میں بیٹھے اکثر ان کو ایسے جلاد نما ساقی مل جاتے ہیں جو اپنے ملک سے بے وفائی کرکے اپنے آقا کو خوش کرنے کے لیے غریبوں کا لہو پیمانے میں ڈال کر پیش کرتے ہیں۔جس کے نشے میں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ان سے پہلے بھی ایسی قومیں آئیں جن کو اپنی طاقت پر بڑا ناز تھا مگر قانون قدرت یہ بھی ہے ہر دن کے بعد رات کا اندھیرا، عروج کے بعد زوال، زندگی کے بعد موت ضرور آتی ہے۔ مملکت روما ہو یا سلطنت عثمانیہ، آخر زوال پزیر ہوئیں۔آج جب انسان ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا اس مقام پر پہنچ چکا ہے جہاں دنیا سمٹ کر حقیقی معنوں میں گلوب بن گئی ہے۔اس پر اپنی حکمرانی کا تاج سر پر سجانے کا شوق ہی دراصل دنیا میں معاشی بحران کی اصل جڑ ہے۔اقوام متحدہ کہنے کو تو عالمی ادارہ ہے جس کا کام دنیا میں امن وامان قائم رکھنا ہے مگر اس میں ذمہ داری اور اختیارات کا توازن ملک کی معاشی اور اقتصادی حالت دیکھ کیا گیا ہے۔اس وقت تو حالت یہ ہے کہ امریکہ ہی اقوام متحدہ بنا بیٹھا ہے۔جو اس وقت خود بھی زوال پذیری کے دور سے گزر رہا ہے۔اپنی معاشی اور اقتصادی حالت کو مکمل تباہ ہونے سے بچانے کے لیے وہ کسی نہ کسی ملک کے قدرتی وسائل پر قبضہ کرکے اپنا آخری وقت گزارتا جا رہا ہے۔قدرتی وسائل کے خزانوں پر بیٹھنے والا یہ ناگ جہاں بھی تیل، معدنیات، قدرتی گیس کے ذخائر دیکھے وہاں اپنے ساتھی سانپولیوں کی فوج لے کر پہنچ جاتا ہے۔اکثر اس کا ہدف اسلامی ممالک ہی بنے ہیں جو اس کو دودھ بھی پلاتے ہیں اور اس سے ڈسواتے بھی ہیں۔بدقسمتی اسے اتحاد کی پٹاری میں بند نہیں کرتے بلکہ اس کو جب بھی موت کی آخری ہچکی آنے لگتی ہے کچھ آب حیات اسے مہیا کردیا جاتا ہے۔جس سے اس کی عرصہ حیات کچھ عرصہ کے لیے اور دراز ہو جاتا ہے۔اس وقت دنیا میں معاشی بحران کے ساتھ دہشت گردی بھی عروج پر ہے۔اصل میں معاشی بحران اور دہشت گردی ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔اس کو پھیلانے کے ذمہ دار ہی وہ

ہیں اس کا سدباب کرنا چاہیے۔اس وقت اگر ان ممالک کا تجزیہ کیا جائے جو اس وقت دنیا کی نظر میں خطرناک ترین ملکوں میں شمار کیے جاتے ہیں تو اس میں یہ بات قابل غور ہے کہ دنیا کے 10 خطرناک ترین ممالک کی فہرست میں اکثریت اسلامی ممالک کی ہے۔ان میں وہ ملک شامل ہیں جو قدرتی وسائل سے مالا مال ہیں یا جغرافیائی لحاظ سے خاص اہمیت کے حامل یا ایٹمی طاقت ہیں یا ایٹمی طاقت بن سکتے ہیں۔ان کو اس حالت تک پہنچانے میں کسی نہ کسی طرح امریکہ کا ہاتھ ہے۔اگر دنیا میں ان ممالک کا جائزہ لیا جائے جہاں جرائم کی شرح سب سے زیادہ ہے تو ان میں پہلے 10 ممالک میں کوئی اسلامی ملک شامل نہیں۔اس میں اکثریت ان ممالک کی ہے جن کی اقوام متحدہ میں اجارہ داری ہے جس میں امریکہ کا اپنا نمبر سب سے پہلے آتا ہے۔اگر ان ممالک کی بات کی جائے جہاں پر جرم رپورٹ ہونے کی شرح سب سے کم ہے ان میں اکثریت اسلامی ملکوں کی ہے۔آج جن ممالک کو دنیا کا خطرناک ترین ملک قرار دیا جارہا ہے کیا وہ شروع سے ہی ایسے تھے یا ان کو ایسی حالت میں پہنچایا گیا ہے۔وہ کیا محرکات تھے؟ ان کو اس حالت سے بچانے یا نکالنے کے لیے اقوام متحدہ یا امریکہ کا اپنا کیا کردار رہا؟ امریکہ کا ان ممالک سے رویہ کیسا رہا؟ کیا آنے والے وقت میں خطرناک ترین ممالک کی فہرست میں مزید اسلامی ملکوں کا اضافہ ہونے والا ہے؟

صومالیہ:10 خطرناک ملکوں کی فہرست میں سب سے پہلا نمبر صومالیہ کا ہے جہاں بسنے والوں کی اکثریت مسلمان ہیں۔یکم جولائی 1960ء میں امریکہ نے صومالیہ کو تسلیم کیا۔امریکہ نے صومالیہ سے اپنے سفارتی تعلقات باضابطہ طور پر کبھی نہیں توڑے۔ 1991ء میں Said Barre کی حکومت کے خاتمے کے بعد صومالیہ میں امریکی سفارت خانہ بند کر دیا گیا۔ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے صومالیہ کی عبوری حکومت کو تسلیم کیا ہے جسے اقوام متحدہ کی بھی حمایت حاصل ہے مگر موجودہ عبوری حکومت کو امریکی اسلحہ خریدنے پر پابندی ہے۔خانہ جنگی پھیلنے کے بعد جب پر تشدد واقعات بہت بڑھ گئے تو ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے صومالیہ میں امدادی کارروائیوں کے انعقاد کے لیے ایک

محفوظ ماحول پیدا کرنے کے لیے ایک فوجی اتحاد کا اعلان کیا۔یہ اتحاد Untied Task Force (UNITAF) دسمبر 1992ء میں امن بحال کرنے صومالیہ داخل ہوتا ہے اور مئی 1993ء میں اس کی جگہ اقوام متحدہ کے (UNISOM II) نے صومالیہ میں آپریشن کے لیے لے لی۔موغادیشو میں جب اس آپریشن کے دوران 1000 سے زائد سویلین سمیت 19 امریکی فوجی ہلاک ہو گئے تو 3 مارچ 1995ء کو Operation United Shield روک کر فوج کو واپس بلا لیا گیا۔صومالیہ میں امن اب تک بحال نہ ہو سکا جس کی وجہ سے صومالی عوام کی بہت بڑی تعداد پناہ کی تلاش میں ان ممالک میں پہنچ گئی جہاں جنیوا کنونشن کے تحت پناہ دی جاتی ہے۔اس وقت دنیا میں عراق اور افغانستان کے بعد صومالیہ کے مہاجروں کی تعداد دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔صومالیہ میں امن وامان قائم کرنے میں امریکہ سمیت اقوام متحدہ تا حال اپنا کردار نبھانے میں ناکام ہے۔

عراق: 1963ء میں امریکہ نے عراق کی حکومت کے خاتمے کے لیے جنرل عبدالکریم قاسم کا بھرپور ساتھ دیا۔جنرل قاسم کی ہلاکت کے بعد اس کے جانشین سے بھی اپنے تعلقات بڑے اچھے رکھے۔1967ء میں عراق سے امریکہ نے اپنا سفارتی تعلق توڑ دیا۔1968ء میں ال باقر Al Baker نے اقتدار پر قبضہ کیا مگر ان تعلقات میں کوئی پیش رفت نہ ہوئی۔یہ تعلقات 16 سال تک منقطع رہے۔1980ء میں جب عراق نے ایران پر حملہ کیا تو اسے امریکی حمایت حاصل تھی۔صدر ریگن اور جارج ڈبلیو بش انتظامیہ نے اپنے تعلقات صدام انتظامیہ سے بہتر رکھے۔1991ء میں عراق کو خلیج جنگ کے لیے پہلے اکسایا گیا پھر حسب روایت امریکہ اور اس کے اتحادی ثالثی کا کردار نبھانے تیل کے ذخائر تک رسائی حاصل کرنے کے پلان میں کامیاب ہو گئے۔ریگن اور بش انتظامیہ نے متعدد دوہرے استعمال کی اشیاء مثلاً ایسے کیمیکل جو کیمیائی ہتھیار بنانے کے علاوہ زندہ وائرس یا بیکٹیریا کی تیاری میں بھی استعمال ہو سکتے تھے عراق کو فروخت کیے۔جن سے ادویات کے ساتھ حیاتیاتی ہتھیار تیار کیے جا سکتے تھے۔اسی کو

بنیاد بنا کر امریکہ نے عراق پر چڑھائی کی۔عراق جس کا تعلق ان اسلامی ممالک میں تھا جو تیل کو دولت سے مالا مال تھے۔آج امریکی جارحیت کی وجہ سے عراقی باشندوں کی ایک بھاری تعداد دوسرے ممالک میں مہاجروں جیسی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔یوں دیوالیہ ہوتا ہوا امریکہ مکاری سے خلیج میں پاؤں جما کر کم از کم ایک دہائی کے لیے اپنے فوجی بجٹ کی سرد دختم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

افغانستان:امریکی صدر آئزن ہاور نے دسمبر 1959ء کابل کا دورہ کیا۔ 1950ء سے 1979ء تک افغانستان کو 500 ملین ڈالر کی امداد دی گئی۔1960ء میں افغانستان کے آخری شہنشاہ ظاہر شاہ نے امریکہ کا دورہ کر کے امریکی صدر جان کینڈی سے ملاقات کی۔اپریل 1978ء میں Saur انقلاب کے بعد ان دونوں ممالک میں تعطل آ گیا۔1979ء میں افغانستان میں امریکی سفیر کے قتل ہونے کے بعد سفارتی تعلقات میں مزید کشیدگی آ گئی۔سوویت یونین کے حملے کے بعد ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے سوویت یونین کی فوج کو افغانستان سے نکالنے کے لیے افغانستان کی حمایت کی۔جس کے لیے پاکستان کو آلہء کار اور ضیاء الحق کو مہرہ بنایا گیا۔افغانستان سے سوویت یونین کی فوج تو نکل گئی مگر اس دور میں بوئے گئے بیج آج تناور درخت بن چکے ہیں جن کی مضبوط جڑیں افغانستان سمیت سارے پاکستان بھی پھیل چکی ہیں۔اب امریکی فوج اپنے اتحادیوں کے ساتھ یہاں ڈیرہ ڈالے ہوئے ہے۔پاکستان کو مشرقی سرحد سے زیادہ اندرون خانہ اور شمالی سرحد پر فوج اور رینجرز کی ضرورت زیادہ رہتی ہے۔ جب سے نیٹو فورسز نے افغانستان میں اپنا ڈیرہ ڈالا ہے افغانستان کا شمار بھی دنیا کے ان خطرناک ترین ممالک میں کیا جاتا ہے جہاں عوام کی کثیر تعداد اپنی جان بچانے کے لیے مہاجروں جیسی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔پتھریلی چٹانوں میں خوار ہوتے ہوئے نیٹو فورسز پر اتنا کثیر سرمایہ خرچ ہو رہا ہے کہ دنیا معاشی بحران کا شکار ہو گئی ہے۔سوویت یونین کی فوج سے زیادہ نیٹو فورسز نے افغانستان میں انسانی خون کی ہولی کھیلی ہے۔

ہیٹی:1804ء میں فرانس کے تسلط سے آزاد ہونے والے ہیٹی کو امریکہ نے

1862ء میں تسلیم کیا۔ 1857ء سے 1913ء تک امریکی بحریہ نے 19بار اپنے بحری جہاز ہیٹی بھیجے۔بالآخر 1915ء کو ہیٹی پر قبضہ کر لیا۔1934ء میں جب ہیٹی کے باشندوں نے متحد ہو کر مزاحمت کی تو امریکی فوج کو یہاں سے نکلنا پڑا۔1957ء سے 1971ء تک ہیٹی پر فرینکوئس ڈیولیئر Francois Duvalier کا آمرانہ دور رہا۔جس کو امریکی حمایت اس لیے حاصل تھی کیونکہ فرینکوئس کی پالیسی کمیونزم کے خلاف تھی یوں سرد جنگ کے دوران کیوبا کے کمیونزم کے خلاف یہ حمایت ایک مخالف ہتھیار کے طور پر استعمال کی گئی۔جب فرینکوئس ڈیولیئر کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا جین کلاوڈے Jean Cluade اس کا جانشین بن گیا۔جسے امریکی آشرباد حاصل تھا۔بعد ازاں ریگن انتظامیہ نے اسے اقتدار چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔اس کے بعد ہیٹی کی امداد بھی معطل کر دی گئی۔جارج ڈبلیو بش انتظامیہ نے بھی ہیٹی کو دی جانے والی امداد پر بندش کا سلسلہ جاری رکھا۔ماسوائے انسانی بنیادوں پر دی جانے والی امداد کے۔ 1991ء سے 1994ء تک کلنٹن انتظامیہ نے ہیٹی پر معاشی امداد کی پابندی لگائے رکھی۔جس سے ملک میں غربت بہت بڑھ گئی۔1994ء میں امریکہ نے Artistede کی حکومت کو بحال کروانے کے لیے فوجی مداخلت کی۔جسے 2004ء میں کرپشن کی وجہ سے مسلح باغیوں نے جلاوطن ہونے پر مجبور کر دیا۔امریکی پالیسی اور مداخلت کی وجہ سے ہیٹی کی مالی ابتر ہوتی گئی۔اقوام متحدہ کا روح رواں ہونے کی وجہ سے امریکہ کا یہ فرض تھا کہ اپنی پالیسی ایسے بناتا جس سے جمہوریت کو فروغ ملتا،ادارے مضبوط ہوتے،غربت،ناخواندگی اور غذائی قلت کا خاتمہ کیا جا سکتا،انسانی حقوق کا احترام کیا جاتا،دوطرفہ تجارت کو فروغ ملتا،مگر معاملہ اس سے برعکس تھا۔جس کی وجہ سے 67% ہیٹی مہاجرین سے 60% مہاجرین امریکہ کی وجہ سے بنے۔گزشتہ 2برس میں امریکی کوسٹ گارڈز نے ایک لاکھ سے زائد ہیٹی باشندوں کو غیر قانونی طریقے سے سمندری سرحد عبور کرتے ہوئے پکڑا۔2010ء میں زلزلے سے ہیٹی میں غربت اور معاشی بحران میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔جس سے شدت پسندی اور جرائم کے واقعات میں بھی تیزی آئی ہے۔

پاکستان: پاکستان کے ساتھ امریکی تعلق قمیض میں لگے کاج اور بٹن کی طرح ہے۔ جو بنے تو ایک دوسرے کی خاطر ہوتے ہیں مگر بعض اوقات سیاسی موسم، حالات اور مصلحت کی بنا پر کاج اور بٹن بند اور کھلتے رہتے ہیں۔ بس اس میں بٹن کا کردار امریکہ کا ہوتا ہے جو ہر حال میں کاج کے اوپر ہی رہتا ہے۔ امریکہ سے باقاعدہ سفارتی تعلقات کا آغاز لیاقت علی خان نے اس وقت کیا جب انہوں نے روس کا سرکاری دورہ منسوخ کر کے امریکہ جانے کو ترجیح دی۔ آج تک ان تعلقات میں مدو جزر آتا رہا ہے۔ جمہوریت کو مضبوط بنانے کا نعرہ لگانے والے امریکہ نے ہمارے آمروں کو جمہوری رہنماؤں پر زیادہ فوقیت دی۔ اپنے زیادہ تر غلیظ کام بھی آمروں سے کروائے۔ جس کے انعام میں آمرانہ ادوار میں ملنے والی امداد جمہوری حکومتوں کے دور سے زیادہ ہے۔ افغانستان اور سوویت یونین کی جنگ میں امریکہ کی کٹھ پتلی بننے کا خمیازہ ہم آج بھگت رہے ہیں۔ جب سے امریکی فوج اور اس کے اتحادیوں نے ہمارے خطے میں قدم رکھا ہے پاکستان بھی دنیا کے خطرناک ترین ممالک کی صف میں کھڑا ہو گیا ہے۔ ہم انگریزوں کے تسلط سے آزاد ہو کر "آزاد ریاست" بنانے میں تو کامیاب ہو گئے مگر آج بھی ہم بالواسطہ یا بلا واسطہ غلامی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ آج ہمارے داخلی امور میں امریکہ ایسے رچ بس گیا ہے جیسے رگوں میں خون.....! آزاد ریاست میں حکومت بنانی، بچانی یا توڑنی ہو تو اس کا فیصلہ واشنگٹن میں کیوں ہوتا ہے؟ دہشت گردی کی یہ فضاء امریکی فوج اور اس کے اتحادیوں کے آنے سے پہلے تو ہمارے خطے میں کبھی نہیں دیکھی گئی۔ امریکہ کو دوست کہنے والے یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ اس کی دوستی سے آج تک ہم نے کیا کھویا کیا پایا؟ ماضی کی طرح اب بھی جمہوری حکومت کو امریکہ سے سفارتی تعلقات برقرار رکھنے میں دشواری کا سامنا ہے۔

سوڈان: امریکہ کے ساتھ سوڈان کے اچھے سفارتی تعلقات کا آغاز 1956ء میں ہوا تھا۔ امریکہ نے سوڈان کو برطانوی سامراج سے آزاد ہونے کے بعد بہت جلد تسلیم کیا۔ 1989ء تک واشنگٹن ڈی سی اور خرطوم کے درمیان تعلقات بڑے خوشگوار

رہے۔ فروری 2003ء میں خانہ جنگی کے بعد امریکہ نے اس پر اقتصادی پابندیاں لگا دیں۔ سوڈان افریقہ کا سب سے بڑا ملک ہے جس میں مسلم آبادی کی اکثریت ہے۔ جو محل وقوع اور جغرافیائی اعتبار سے افریقہ میں وہی اہمیت رکھتا ہے جو پاکستان کی ایشیاء میں ہے۔ سوڈان بحیرہ احمر (Red Sea) پر واقع ہے جس کی سرحد مصر کے علاوہ افریقہ کے سات دیگر ممالک سے بھی ملتی ہے۔ سوڈان کا مغربی علاقہ دارفور (Darfur) ہے جس کا سائز فرانس کے برابر ہے۔ مگر اس کی آبادی صرف 6 ملین ہے۔ سوڈان میں دریافت ہونے والے قدرتی وسائل امریکہ کی للچائی نظر سے بھلا محفوظ کیسے رہ سکتے تھے۔ جن میں تیل، قدرتی گیس کے علاوہ دنیا کے تیسرے بڑے یورینیم (High purity Uranium)، دنیا کے چوتھے بڑے تانبے (Copper) کے ذخائر شامل ہیں۔ سعودی عرب کے برعکس سوڈانی حکومت نے واشنگٹن کے سامنے اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا۔ قدرتی ذخائر اور وسائل کو حاصل کرنے کے لیے سوڈان نے امریکہ کی بجائے چین سے معاونت لینے کو ترجیح دی۔ تیل کے پیاسے امریکہ نے اس جرم کی سزا سوڈان میں خانہ جنگی کے دوران علیحدگی پسند تحریک کی حمایت کر دی۔ 2005ء میں اقوام متحدہ دارفور (Darfur) میں امن معاہدہ کروانے پہنچ گیا۔ آج سوڈان کا شمار بھی دنیا کے خطرناک ترین ممالک میں کیا جاتا ہے۔

جمہوریہ کانگو: جمہوریہ کانگو کو امریکہ نے 1960ء میں تسلیم کیا۔ 1965 سے 1977ء تک کانگو سے امریکہ نے اپنے سفارتی تعلقات کا سلسلہ روکے رکھا۔ 1990 میں Denis Sasson - Nguesso نے واشنگٹن کا دورہ کیا۔ جس کے بعد امریکہ سے سفارتی تعلقات میں بہتری آنا شروع ہو گئی۔ 1992ء میں وزیر اعظم Andre Milongo نے واشنگٹن میں صدر بش سے ملاقات کی۔ 1997ء میں جنگ کی وجہ سے امریکن ایمبیسی کو خالی کروایا گیا۔ 2001ء میں امریکی سفارتکار نے دوبارہ وہاں کام کرنا شروع کر دیا۔ 2006ء میں جمہوریہ کانگو میں پہلی بار جمہوری صدر منتخب کیا گیا۔ جسے امریکہ کی حمایت حاصل تھی۔ تا حال امریکہ کانگو میں امن کی فاختہ نہیں

اڑالا سکا۔

لبنان:1943ء میں آزادی پانے والے لبنان نے 1948ء میں عرب جنگ میں حصہ لیا۔ 23مارچ 1949ء کو اسرائیل کے ساتھ امن معاہدے پر دستخط کیے۔ آزادی کے بعد لبنان سیاسی بحران سے دوچار رہا۔ 1958ء میں صدر کیملی Camillie کے دور میں بغاوت کو کچلنے کی غرض سے امریکی افواج نے لبنان میں قدم رکھا۔ 1960ء کی دہائی میں لبنان میں امن رہا پھر 1970ء میں فلسطینی مجاہدوں کی وجہ سے لبنان کا امن بھی خراب ہو گیا۔ 1975ء سے 2005 تک امریکہ نے لبنان کو 400 ملین سے زائد کی امداد فراہم کی۔ 2006-2007ء میں ایک ارب ڈالر کی اضافی امداد بھی دی گئی۔ اسرائیل کو امریکہ کی مکمل حمایت حاصل تھی۔ خوشحال، پرامن اور مستحکم لبنان مشرق وسطیٰ کی سالمیت کے لیے نہایت ضروری ہے مگر فلسطین کا مسئلہ جو بڑی پلاننگ کے ساتھ تیار کیا گیا تھا کیسے ممکن ہے اس کو اقوام متحدہ اور امریکہ خود ہی حل کرے۔ اس کا مقصد تو عرب ممالک کے تیل کے ذخائر کو قابو کرنا ہے۔

زمبابوے: زمبابوے میں کالے گوروں میں نسلی امتیاز کی وجہ سے حالات کشیدہ رہتے ہیں۔ حزب اختلاف کی سفید فورسز کو امریکی اور برطانوی حمایت حاصل ہے۔ جس کی وجہ سے حالات اتنے بگڑ گئے ہیں کہ زمبابوے کا شمار بھی دنیا کے خطرناک ترین ممالک میں ہوتا ہے۔ وہاں امن کیسے ہو سکتا ہے جہاں ثالث ہی فریق بن جائے؟

فلسطین: کشمیر کی طرح فلسطین بھی مظلوموں کی آماجگاہ ہے۔ فلسطین کی ریاست کو امریکہ نے کبھی دل سے تسلیم ہی نہیں کیا۔ اسرائیل کے خالق بھلا فلسطین کی حمایت کیسے کریں گے؟ فلسطین میں امریکہ کی اپنا کوئی باقاعدہ سفارت خانہ بھی نہیں۔ اسرائیلیت اور امریکن گردی کے آگے برسوں سے معصوم جانوں کا ضیاع ہو رہا ہے۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ کرنے والوں کی دہشت گردی کا سب سے بڑا ثبوت ہی فلسطین پر ہونے والے مظالم ہیں۔ جس کا اثر پورے عالم اسلام پر پڑتا ہے۔ آزادی کی تحریکوں میں حصہ لینے والے آخر جہادی بننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ جب تک

فلسطین کا منصفانہ حل تلاش نہ کیا جائے گا تب تک دہشت گردی کے سیلاب میں بے گناہ لوگوں کی جانیں ضائع ہوتی رہیں گی۔

اسی طرح روشنیوں اور قائد کے شہر کراچی کا شمار دنیا کے ان شہروں میں کیا جانے لگا ہے جہاں مجرمانہ سرگرمیاں عروج پر ہیں۔ جس ملک میں امن و امان نہ ہو وہاں کے سب سے بڑے شہر میں ایسا حال کوئی عجیب بات نہیں۔ ظاہر ہے ملکی معیشت کو تباہ کرنے کے لیے سب سے بڑے تجارتی شہر کو جرائم پیشہ لوگوں کی آماجگاہ بنانے سے باقی ملک کا دیوالیہ خود ہی ہو جائے گا۔ اگر وطن عزیز کو خطرناک ترین ممالک کی فہرست سے نکالنا ہے تو اس کے لیے امریکی شکنجے سے آزاد ہونا بہت ضروری ہے اور اُس کیلئے اس سے زیادہ بہتر وقت ہمیں تاریخ دوبارہ فراہم نہ کرے۔ جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ تاریخ اپنے آپکو دہراتی ہے انہیں یہی بتا دینا ہی ضروری ہے کہ تاریخ نہیں انسان اپنی غلطیوں کو دوہراتا ہے۔ اور جب ہم ماضی کی غلطیوں کو مستقبل میں دوہرا کر ویسے ہی نتائج حاصل کرتے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ تاریخ نے اپنے آپ کو دوہرایا ہے حالانکہ اگر انسان اپنی غلطی دوہرانا چھوڑ دے تو دنیا کے کسی خطے میں تاریخ اپنے آپکو نہیں دوہرائے گی۔ ممکن ہے دنیا کی کسی دوسری قوم کے پاس ابھی بہت سی غلطیاں کرنے کی گنجائش ہو لیکن ہمارے پاس اب غلطی کی کوئی گنجائش نہیں اور اس سے بڑی غلطی اور کیا ہوگی کہ ہم اب بھی امریکہ کو اپنا دوست سمجھیں!

روزنامہ ''دن'' لاہور 22 دسمبر 2011ء

قابل غور

☆ ترکی کا صدر منتخب ہوا تو مجھے یقین ہی نہ آیا کہ یہ وہی شخص ہے جو چند دن قبل اپنے چند سیاسی ورکروں کے ساتھ بغیر کسی سیکورٹی کے عوام میں اشتہار بانٹ رہا تھا۔

☆ ایسے بیٹھ کر جلسہ انجوائے کر رہے تھے جیسے نیوزی لینڈ یا

آسٹریلیا کے کرکٹ میچوں کے دوران عوام گھاس پر بیٹھ کر میچ کے ساتھ پکنک انجوائے کر رہے ہوتے ہیں۔

☆ ترقی یافتہ اور مہذب معاشروں میں کوئی کسی پر بغیر ثبوت کے الزام تراشی کرنے کی جرات نہیں کرسکتا۔ کیونکہ کوکسی پر جھوٹا الزام لگانا بھی ایک جرم ہے مگر ہمارے ہاں یہ جرم "Status symbol" بن چکا ہے۔

☆ 30اکتوبر کے جلسے کے بعد سیاسی بابوں کو عمران خان کے کوٹ کی جگہ شیروانی نظر آنا شروع ہوگئی ہے۔ تبھی تو اس کو تانگہ پارٹی کہنے والے بھی اب تانگے کے بانس پر بیٹھنے کو تیار ہیں۔

انتخابی مہم کا نیا انداز اور پرانے بابے

ستمبر 1991ء میں ترکی کی سیاسی پارٹیاں الیکشن مہم بڑے بھرپور طریقے سے چلا رہیں تھیں۔میں اپنے چند دوستوں کے ہمراہ "مساجد کے شہر" استنبول میں اتاترک کلچر سینٹر دیکھنے کے بعد "Topkapi" زیرِ زمین ریلوے اسٹیشن گیا۔یہ حصہ یورپ میں شمار کیا جاتا ہے۔استنبول کا زیرِ زمین ریلوے نظام لندن کے بعد دنیا میں دوسرا قدیم ترین ریلوے نظام ہے۔ہم نے خودکار سیڑھیوں کے ذریعے زیرِ زمین پلیٹ فارم تک رسائی حاصل کی۔جہاں پر کچھ لوگ اپنی سیاسی جماعت کے اشتہار بانٹ رہے تھے۔وہ ہر آنے جانے والے کا حال احوال پوچھ کر ان کو اپنی پارٹی کا اشتہار دینے کی کوشش کرتے۔ہمارے ایک ساتھی نے جھٹ سے اپنا کیمرہ نکالا اور وہ اشتہار بانٹنے والے ان سیاسی ورکروں میں سے ایک کے پاس گیا اس سے ہاتھ ملایا اور ہم کو اس کے ساتھ اپنی تصویر بنوانے کا کہا۔تصویر بنوانے کے تھوڑی دیر بعد ہی ہماری ٹرین آ گئی اور ہم اس میں سوار ہو کر اتاترک میوزیم دیکھنے سسلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ٹرین میں سوار ہو کر ہم نے مذاقاً اپنے دوست سے پوچھا کہ اس نیم گنجے شخص میں ایسی کیا خاص بات تھی کہ تم نے اس کے ساتھ تصویر بنانے کا سوچا؟ اس نے جواب دیا کہ تم کو نہیں معلوم یہ کون تھا؟ ہم نے کہا نہیں،تو اس نے بتایا یہ ایک سیاسی پارٹی کا لیڈر "سلیمان ڈیمرل" تھا۔چند دن بعد وہی شخص ترکی کا صدر منتخب ہوا تو مجھے یقین ہی نہ آیا کہ یہ وہی شخص ہے جو چند دن پہلے اپنے چند سیاسی ورکروں کے ساتھ بغیر کسی سکیورٹی کے عوام میں اشتہار بانٹ رہا تھا۔مجھے پاکستان سے باہر پہلی بار کوئی الیکشن مہم دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔جن میں کئی ایسی چیزیں تھیں جو ہمارے ملک میں تو الیکشن کا اہم ترین حصہ سمجھی جاتی ہیں مگر ترکی میں ان کا وجود ہی نہ تھا۔ہمارے ملک میں دیواریں دیکھ کر کسی بھی سیاسی حلقے کے نمبر اور وہاں پر

انتخابات میں حصہ لینے والے امیدواروں کا پتہ "وال چاکنگ" سے لگ جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں دیواروں کو اشتہارات کے لیے سب سے موزوں ترین جگہ تصور کیا جاتا ہے۔جہاں پر مذہبی، سیاسی، کاروباری ہر قسم کے اشتہارات مختلف رنگوں میں نظر آتے ہیں۔استنبول بھر میں ہمیں کہیں بھی دیوار پر کچھ لکھا نظر نہ آیا۔پہلے تو ہمیں گمان گزرا کہ شاید ترکی میں پینٹر ہی نہیں ہوتے جو یہاں کی دیواریں الیکشن کے دنوں میں بھی صاف شفاف نظر آ رہی ہیں مگر یہاں بھی دنیا کے باقی مہذب معاشروں کی طرح ملک کو صاف رکھنے کی غرض سے "وال چاکنگ" کی ممانعت کا قانون موجود بھی تھا۔اور اس سے بھی حیران کن بات یہ تھی کہ اس پر عمل درآمد بھی کروایا جا رہا تھا اور لوگ خود بھی قانون شکن دکھائی نہیں دے رہے تھے۔اس کے ساتھ وہاں جگہ جگہ دیواروں پر اشتہار لگانے کی بجائے یورپ اور برطانیہ کی طرح مخصوص جگہ پر اشتہارات یا بینرز آویزاں کیے گئے تھے۔سڑکوں پر اکثر مختلف سیاسی پارٹیوں کے کارکن گاڑیوں میں ریلی کی شکل میں مخصوص نعرے لگاتے، میوزک پر رقص کرتے اور جوش و جذبے کا مظاہرہ کرتے گزر جاتے۔جس ہوٹل میں ہم قیام پزیر تھے اس کے قریب ایک سیاسی جلسہ ہو رہا تھا۔ہم بھی اس رونق افزاء ماحول کو انجوائے کرنے چلے گئے۔اس جلسے میں انتخابات میں حصہ لینے والے امیدوار اور ان کے سپورٹرز اپنی پارٹی کا منشور اور پالیسی بتا رہے تھے کہ کیسے یہ عوام اور ملک کے لیے بہتر ہو سکتی ہے اور کیسے اس پر عمل درآمد کیا جائے گا۔سیاسی رہنماء مخالفین کی سیاسی پالیسی پر تنقید تو کرتے مگر ذاتیات کے حوالے سے گفتگو کو سیاسی تشہیر میں معیوب اور الزامات کی تیر زنی سے گھائل کرنے کی کوشش نہ کی گئی۔تقاریر کے دوران موسیقی اور نغمات کا بھی انتظام تھا جو ہمارے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔لوگ اپنے ساتھ کھانے پینے کا سامان لائے تھے اور ایسے بیٹھ کر جلسہ انجوائے کر رہے تھے جیسے نیوزی لینڈ یا آسٹریلیا کے کرکٹ میچوں کے دوران عوام گھاس پر بیٹھ کر میچ کے ساتھ پکنک انجوائے کر رہے ہوتے ہیں۔انتخابات کے نتائج آنے کے بعد لوگوں کا اپنے سیاسی قائدین کی تصاویر کے ساتھ گاڑیوں میں ریلیاں نکالیں،شہر کے مخصوص حصوں میں

جمع ہو کر رقص و موسیقی کے ساتھ نئی آنے والی حکومت کا خیر مقدم کیا۔ ہارنے والوں نے دھاندلی کا الزام لگانے کی بجائے ان کو جیتنے کی مبارک باد دی۔

پاکستان میں کچھ عرصہ سے سیاسی منظر نامہ انتخابی مہم کی تصویر پیش کر رہا ہے۔ جہاں ہر پارٹی جلسوں، ریلیوں اور دھرنوں میں مصروف نظر آتی ہے۔ جسے دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کو الیکشن کی تاریخ کا علم ہو چکا ہے۔ تبھی تو ہر پارٹی اپنا "جمہوری حق" بڑے زور شور سے دکھا رہی ہے۔ جلسے تو پہلے بھی پاکستان میں ہوتے رہے ہیں مگر تحریک انصاف کے جلسوں کا "نیا انداز" پاکستانی عوام کے لیے تناؤ کے اس دور میں ایک انٹرٹیمینٹ سے کم نہیں۔ اب تو دنیا میں سیاست ہی نہیں کھیلوں میں بھی اس "نئے انداز" کو متعارف کروایا گیا ہے۔ جون 2006ء میں جرمنی فٹبال کے عالمی کپ کے دوران فرینکفورٹ کے وسط سے گزرنے والے دریا میں یورپ کی سب سے بڑی دو طرفہ سکرین نصب کی گئی۔ دریا کے دونوں کناروں پر لوگوں پکنک منانے کے انداز میں بیٹھ کر میچ دیکھتے، میچ سے قبل اور وقفے کے دوران دریا کے کنارے پر DJ لوگوں کا موسیقی سے دل بہلاتے۔ یہی اسٹائل انڈیا نے آئی پی ایل میں اپنایا۔ تحریک انصاف کے حالیہ جلسوں میں موسیقی، ملی نغموں کے ساتھ تقاریر کا نیا انداز عوام کے لیے اچھوتا اور پُر کشش ثابت ہوا۔ عمران خان نے روایتی سیاسی جلسوں کے انداز میں ایک نئی چیز تو متعارف کروا دی مگر باقی انداز تو وہی روایتی ہی رہا۔ کاش! سیاسی جلسوں میں پارلیمانی لوگ ایک دوسرے کے خلاف غیر پارلیمانی زبان استعمال کر کے الزامات کی توپیں چلانا بھی بند کر دیں۔ ایک دوسرے کی کردار کشی کرنے کی بجائے اگر اپنا منشور عوام کو بتایا جائے، اپنی پالیسوں کی افادیت عوام کو بتائی جائے، عوام کو یہ بتایا جائے کہ کیسے ان پر عمل درآمد ممکن بنایا جائے گا۔ کیونکہ آج تک جو بھی آئے ہیں انتخابات سے پہلے عوام کو وعدوں، تسلیوں اور یقین دہانیوں کے سپنے تو بہت دکھاتے رہے ہیں مگر اقتدار میں آ کر عوام کو سنہری سپنوں کے جال میں تڑپتا چھوڑ کر اس وقت تک غافل ہو جاتے ہیں جب تک نئے الیکشن کی تاریخ کا اعلان متوقع نہ ہو جائے۔ موجودہ سیاسی جلسوں،

ریلیوں، ٹی وی ٹاک شوز پر ہمارے "سیاسی اداکار" پنجابی فلموں کے کردار لگتے ہیں۔ جیسے مولا جٹ اور نوری نت جتھ جوڑی سے قبل بڑے ذو معنی مکالموں کا تبادلہ کرتے تھے۔ اس کام میں کھوجتی اور دارو تتی کے کرداروں کی جھلک بھی موجودہ سیاسی "اداکاروں" میں پائی جاتی ہے۔ ہمارے "سیاسی اداکاروں" میں ایک کثیر تعداد جاہل یا جعلی ڈگری والوں کی بھی ہے۔ اصلی ڈگری والوں میں ایسے بھی ہیں جن کی ڈگری تو اصلی ہے مگر دکھائی یہ دیتا ہے کہ ذاتی تعلقات کی بنا پر کہیں سے اعزازی ہی مل گئی ہے۔ جب یہ لوگ ایسا کریں تو ان کو جاہل سمجھ کر رعایت دی جا سکتی ہے مگر جب کوئی آکسفورڈ یونیورسٹی کا پڑھا لکھا بھی جلسوں میں ایسی زبان استعمال کرے.....تو گدھے گھوڑے میں کیا فرق رہ گیا؟؟؟ ہمارے دین میں یہ بات بڑی واضح بیان کی گئی ہے کہ جھوٹ تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ کسی کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ کسی کی سنی سنائی بات کو بغیر کسی تحقیق کے آگے سنا دے۔ ہمارے ہاں صرف یقین ہی نہیں کیا جاتا بلکہ اس کو بنیاد بنا کر الزام تراشیاں بھی کی جاتی ہیں۔ جمہوریت کا راگ الاپنے والے ایک دوسرے پر الزامات لگانا ہی جمہوریت کا خاصا تصور کرتے ہیں۔ ترقی یافتہ اور مہذب معاشروں میں کوئی کسی پر بغیر ثبوت کے الزام تراشی کرنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ کیونکہ کسی پر جھوٹا الزام لگانا بھی ایک جرم ہے مگر ہمارے ہاں یہ جرم "Status symbol" بن چکا ہے۔ جمہوریت کا مطلب تو ......عوام کی حکومت، عوام کے ذریعے سے عوام کے لیے ہے۔ مگر ادھر تو حکومت عوام پر حکمرانی کرنے کے لیے بنائی جاتی ہے جبکہ جمہوریت میں عوام خود حکمرانی کرتے ہیں۔ یہ کیسی جمہوریت ہے کہ عوامی لیڈر درجنوں گاڑیوں کے قافلے کی سیکیورٹی میں سفر کرے جس کی وجہ سے غریب عوام کے بچے کی ولادت قافلے کے گزرنے کے انتظار میں رکشے میں ہی پیدا ہو جائے۔ یہ کیسی جمہوریت ہے کہ غریب عوام دو وقت کی روٹی کو ترس جائیں اور ایک مخصوص طبقہ عیاشی کے سمندر میں دن رات غوطے زن رہے۔ نئے انداز سے سیاسی جلسے کرنے والے کنگ خان جو نیا پاکستان بنانے کا نعرہ لگا رہے ہیں کیا واقعی ہی وہ کچھ نیا کر پائیں گے؟؟

کرکٹ کے عالمی کپ جیتنے والی ٹیم کو دیکھا جائے تو اس میں عمران خان کے سب سے مہلک ہتھیار نوجوان تھے۔ سیاست میں بھی نوجوانوں نے عمران خان کا بڑا ساتھ دیا۔ 30 اکتوبر کے جلسے کے بعد سیاسی بابوں کو عمران خان کے کوٹ کی جگہ شیروانی نظر آنا شروع ہوگئی ہے۔ تبھی تو اس کو تانگہ پارٹی کہنے والے بھی اب تانگے کے بانس پر بیٹھنے کو تیار ہیں۔ کیا عمران خان شاطر بابوں کی ٹیم کو اپنے نئے انداز سے فیلڈنگ پر کھڑا کر پائے گا-----یا پھر یہ بابے کپتان کو 12واں کھلاڑی بنادیں۔ عمران خان کی سیاست نے تاحال ملکی سیاست کو نہیں سیاسی ٹرمینالوجی تو عطا کردی ہے۔ اور لوگ سیاست میں کرکٹ کی اصطلاحات کے استعمال سے خوب لطف اندوز بھی ہورہے ہیں لیکن کپتان کو موسم کی خبریں بھی غور سے سنی چاہئیں کیونکہ کرکٹ میں لاتعداد بار جیتے ہوئے میچ واش آؤٹ ہوتے دیکھے گئے ہیں۔ اور ہمارے عقیدے کے مطابق تو بابوں کی دعاؤں میں بہت اثر ہوتا ہے اور جب بابے گدی نشین بھی ہوں تو پھر اصل نتیجہ تو انہیں کے ہاتھ میں ہے۔ اردو کے استاد شاعر قمر جلالوی نے کہا تھا

دعا بہار کی مانگی تو اتنے پھول کھلے
کہیں جگہ نہ ملی میرے آشیانے کو
اللہ عمران خان کو ایسی بہار سے بچا کر رکھے

روزنامہ "دن" لاہور یکم جنوری 2012ء
دی نیشن لندن 6 جنوری 2012ء

قابل غور

☆ شاید یہ عوام کی سیاست اور کرکٹ میں دلچسپی کا نتیجہ ہے کہ اب کرکٹ میں سیاست اور سیاست میں کرکٹ کی جھلک نظر آنا شروع ہوگئی ہے۔

☆ ایک طرف تو ڈرون حملوں کے خلاف دھرنے دیئے گئے دوسری طرف ان لوگوں کو اپنی ٹیم کا حصہ بنایا جارہا ہے جو

"ڈرون" حملوں کا لائسنس دینے میں مرکزی کردار تھے۔

☆ عمران خان نے پہلے سیاسی باؤنسرز مار مار کر میاں جی کو گھائل کیا اب نون لیگ کو "لون" جاوید ہاشمی سے لگوایا دیا۔نون لیگ کو "لون" لگا دیکھ کر زرداری صاحب بھلا اپنے "ہارسز" سے غافل کیسے رہ سکتے تھے۔انہوں نے 27 دسمبر کو بی بی کی برسی پر اپنے وفادار اور ذہین "ہارس" کو خصوصی اہمیت دی۔

☆ حفیظ اللہ نیازی صرف اس لیے تحریک انصاف کا ترجمان ہے کہ وہ عمران کا برادرِ نسبتی اور حسان نیازی اس لیے آئی ایس ایف کا مرکزی آرگنائزر ہے کہ عمران خان اس کا ماموں ہے۔ گزشتہ سولہ سالوں سے حفیظ اللہ نیازی نہ تو تحریک انصاف کا ممبر تھا اور نہ ہی اُس نے عمران خان کے ورکروں کے ساتھ کھڑے ہو کر کسی میدان میں کوئی معرکہ سرانجام دیا۔

❁---❁---❁

سیاسی "مرتدوں" کا سلسلہء بیعت

وطن عزیز میں سیاست اور کرکٹ کی مقبولیت کا گراف ہر دور میں نقطہ عروج پر رہا ہے۔شاید یہ عوام کی سیاست اور کرکٹ میں دلچسپی کا نتیجہ ہے کہ اب کرکٹ میں سیاست اور سیاست میں کرکٹ کی جھلک نظر آنا شروع ہو گئی ہے۔سیاسی کھلاڑی ایک دوسرے کو چیلنج کرتے دکھائی دیتے ہیں۔کبھی کوئی 10 اوورز کا میچ کھیلنے کا آرزومند دکھائی دیتا ہے تو کبھی کوئی اپنی باری لینے کی التجا کرتا نظر آرہا ہے۔کسی کو ریٹائرڈ ہرٹ ہونے کا طعنہ دیا جاتا ہے تو کوئی اپنے کھلاڑی کی عمر اور فٹنس سے آگاہ کر کے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ مرد اور گھوڑا کبھی بوڑھا نہیں ہوتا بشرطیکہ خوراک اچھی اور غم فکر سے آزادی ہو۔بھلا ایسے "ہارس" کیسے بوڑھے ہو سکتے ہیں جن کی خوراکوں میں غریبوں کی محنت اور لہو شامل ہو۔جو اپنے حصے کا غم و فکر بھی غریب عوام کے ذہن میں ڈال کر خود چین کی نیند سوتے ہیں۔یہ تو وہ "ہارس" ہیں جن کی "ٹریڈنگ" مرتے دم تک جاری رہتی ہے۔اب تو زمانہ اتنی ترقی کر چکا ہے کہ یہ "ہارس" مرنے کے بعد بھی اتنے پر اثر ہو جاتے ہیں کہ اپنے اصطبل کے کسی بھی "ہارس" کی تقدیر بدل دیتے ہیں۔ملک میں "یوتھ کے ہیرو" عمران خان کی سیاسی تپسیا ڈیڑھ دہائی پر محیط ہے جس دوران انہوں نے بہت سی ملکی اور غیر ملکی "یاترائیں" کیں۔جس میں انہوں نے یوتھ کو آگے لانے کے بہت "بھجن" بھی سنائے۔ان کی شخصیت، عزم، حوصلے، کردار اور ماضی کو دیکھتے ہوئے نوجوانوں کی ایک کثیر تعداد ان کے جلسوں میں شامل ہوتی رہی۔پاکستان کرکٹ ٹیم کا کپتان بننے کے بعد انہوں نے ٹیم میں نوجوان کھلاڑیوں کو میرٹ پر موقع دینے کی روش ڈالی۔اس مقصد کے لیے ان کو کچھ ایسے پرانے اور با اثر کھلاڑیوں کو جو اپنے عروج کے دن گزار چکے تھے ٹیم سے نکالنے کی غیر معمولی جرات کا مظاہرہ بھی کیا۔اس میں انہوں

نے اپنے کزن ماجد خان کو بھی نہ بخشا جو 69 رنز مزید بنا کر ٹیسٹ کرکٹ میں اپنے چار ہزار رنز مکمل کرنے کا خواہاں تھا۔اسی طرح اپنی ریڈ مین ظہیر عباس جو ٹیسٹ کرکٹ سے تو ریٹائرڈ ہوئے مگر ابھی مزید ون ڈے میچوں میں کھیلنا چاہتے تھے مگر عمران خان نے ان کی فارم اور فٹنس کو دیکھ کر ان کا مزید ون ڈے کھیلنے کا شوق پورا نہ ہونے دیا۔ اپنی کپتانی کے زمانے میں وہ "آل اِن ون" تھے جو کسی کی نہیں سنتے تھے۔شاید اسی وجہ سے کرکٹ کے بعض حلقوں میں ان کو "مامے خان" بھی کہا جاتا تھا۔اپنی غیر معمولی قائدانہ صلاحیتوں اور خداداد بصیرت کی بدولت آخر کار وہ ملک کے لیے عالمی کپ جیتنے میں بھی کامیاب ہوئے۔اس کے بعد شوکت خانم ہسپتال اور نمل یونیورسٹی کے پروجیکٹ کی کامیابی کو دیکھ کر یہی لگتا تھا کہ کپتان سیاسی کھلاڑیوں کی ٹیم بناتے ہوئے بھی اپنی سیاسی بصیرت اور بصارت کا استعمال کرے گا۔جس پر کسی کو اعتراض کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔لاہور اور کراچی کے کامیاب جلسوں کے بعد جہاں عوام میں ان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا اندازہ ہوا۔وہاں ایک سوال ہر خاص اور عام کی زبان پر آ گیا کہ مشرف دور کے "ہارس" اب خان صاحب کے اصطبل میں آنا شروع ہو گئے ہیں۔ایک طرف تو ڈرون حملوں کے خلاف دھرنے دیئے گئے دوسری طرف ان لوگوں کو اپنی ٹیم کا حصہ بنایا جا رہا ہے جو "ڈرون" حملوں کا لائسنس دینے میں مرکزی کردار تھے۔اب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ مشرف دور کے وزیر خارجہ جناب محمود احمد قصوری کا کوئی "قصور" نہیں کیونکہ وہ اب تحریک انصاف کا حصہ بن گئے ہیں۔اب تک تین سابق وزرائے خارجہ شاہ محمود قریشی،محمود احمد قصوری اور سردار آصف احمد علی کی صورت میں تحریک انصاف میں شامل ہو چکے ہیں۔اگر سابقہ وزرائے خارجہ کا تحریک انصاف میں شمولیت کا حالیہ سلسلہ اسی رفتار سے جاری رہا تو بہت جلد تحریک انصاف "سابق وزرائے خارجہ الیون" بن جائے گی۔ جس کا سب سے بڑا مسئلہ کپتان صاحب کو انتخابات میں پیش آئے گا۔کہیں ایسا نہ ہو کہ وزیر خارجہ کے قلمدان کے لیے سابق وزرائے خارجہ کے درمیان "سنگل وکٹ" کا میچ کروانا پڑے۔بات ایک سنگل وکٹ تک ہی محدود نہیں رہے گی کیونکہ جس رفتار سے

"سیاسی مہاجر" عمران خان کے کیمپ میں شامل ہو رہے ہیں۔اس سے یہ لگتا ہے کہ آخر میں ایک ٹورنامنٹ ہی کروانا پڑے گا۔"سیاسی ہجرت" کی وبا کچھ زیادہ ہی پھیل گئی ہے جس سے صرف "ق لیگ یا مشرف لیگ" ہی متاثر نہیں ہو رہی اس بیماری میں پاکستان پیپلز پارٹی اور ن لیگ کے "ہارس" بھی مبتلا ہو رہے ہیں۔کچھ تو اس مرض میں مبتلا ہونے کے لیے خوب بد پرہیزی بھی کر رہے ہیں۔میاں صاحب تو اپنا سب سے "قیمتی ہارس" گنوا کر کچھ ہوش میں آئے ہیں۔تبھی وہ خوشامدی کا سہرے اٹھائے اپنی پارٹی کے ان رہنماؤں اور کارکنوں کے پاس پہنچ رہے ہیں جن کی "قوت مدافعت" زیادتیوں کی وجہ سے کم ہو گئی تھی۔ایسے حالات میں تو سیاسی ہجرت کی وبا ان پر آسانی سے اثر انداز ہو سکتی تھی۔عمران خان نے پہلے سیاسی باؤنسرز مار مار کر میاں جی کو گھائل کیا اب نون لیگ کو "لون" جاوید ہاشمی سے لگوایا دیا۔نون لیگ کو "لون" لگا دیکھ کر زرداری صاحب بھلا اپنے "ہارسز" سے غافل کیسے رہ سکتے تھے۔انہوں نے 27 دسمبر کو بی بی کی برسی پر اپنے وفادار اور ذہین "ہارس" کو خصوصی اہمیت دی۔کچھ "ہارس" ایسے بھی ان کے اصطبل میں نظر آئے جن کو بڑی مدت سے "گھاس" نہیں ڈالی گئی تھی مگر برسی کے موقع پر وہ زرداری صاحب کے ساتھ بیٹھ کر بادام کھاتے نظر آئے۔بادام کھانے کا سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہے اس سے دماغ تیز ہوتا ہے۔یادداشت کمزور نہیں ہوتی......ہارس کو یہ یاد رہتا ہے کہ وہ کس کا "وفادار" تھا اور کس کا "وفادار" رہنا ہے۔بدقسمتی سے یہ "بادام" اتنے مہنگے کر دیئے گئے ہیں کہ عام انسان یعنی "عوام" کی دسترس میں ہی نہیں۔اس میں بھی سیاسی پہلو یہ ہے کہ عوام نہ کھائیں بادام اور نہ ہو گی ان کی یادداشت تیز......!!! لہٰذا کمزور حافظے والی عوام کے سامنے آپ کوئی بھی وعدہ کر کے ووٹ "ہتھیا" لیں۔ووٹ دینے کے بعد ان کو کونسا یاد رہتا ہے کہ ان کے ساتھ کیا کیا وعدے کیے گئے تھے۔کمزور حافظے کی عوام کے سامنے اب عمران خان نے بھی کئی وعدے کر ڈالے ہیں۔جس میں ناممکن حد تک مشکل کام "کرپشن" کا 90 دن میں خاتمہ بھی شامل ہے۔جس معاشرے میں 98% لوگ اس مرض میں مبتلا ہوں تو ان کو

90دن میں شفایاب کیسے کیا جا سکتا ہے؟ کیونکہ کرپشن کم تو کی جا سکتی ہے مگر ختم نہیں۔ ایک "آمر" نے بھی 90دن میں انتخابات کا وعدہ کیا تھا جو وفا نہ کیا گیا۔ مگر اس کے دور میں کیے گئے مکروہ کاموں کی نحوست آج تک ہمارا پیچھا نہیں چھوڑ رہی۔ اس سے پہلے ایک نیازی نے 90 ہزار فوج گرفتار کروا دی تھی نا جانے یہ نیازی نوے کے چکر سے کیوں نہیں نکل رہے۔ عمران اس سے پہلے نوے دنوں میں کراچی کے حالات درست کرنے کے عزم کا اظہار بھی کر چکے ہیں مگر غریب عوام کو کیا پڑی ہے اتنی پرانی بات یاد رکھنے کی۔ انہیں تو روٹی کپڑا مکان۔ روشن پاکستان کا وعدہ بھی یاد نہیں رہا۔ عوام کو یہ بھی بھول گیا ہے کہ کبھی عمران خان ایم کیو ایم کے خلاف اسکارٹ لینڈ یارڈ تک گئے۔ کراچی کے مہاجروں (ایم کیو ایم) نے "سیاسی مہاجروں" کے ٹولے کو قائد کے شہر میں کامیاب جلسہ کروانے میں اُن کا آشیرباد بھی شامل تھا۔ ورنہ کراچی کے "ڈان" کے سامنے "کنگ خان" کی کہاں چلنی تھی۔ یہ بھی ایک واضح اشارہ ہے کہ آئندہ ملکی سیاست میں کون سا اتحاد بننے جا رہا ہے۔ مصائب میں گھری غریب عوام حکمران طبقے کی طرف دیکھ رہی ہے جو ان کے مسائل کو حل کرنے میں اس لیے ناکام ہیں کہ وہ "دیانتدار" نہیں۔ جس کا فائدہ "تبدیلی اور انقلاب" کا نعرہ لگانے والے عمران خان کو ہو رہا ہے۔ مایوس عوام کی آنکھوں میں عمران خان نئے پاکستان کے سپنے سجا رہے ہیں۔ دوسری طرف وہی "پٹے ہوئے ہارس" اپنے سیاسی اصطبل میں لا رہے ہیں۔ کیا عوام ان آزمائے ہوئے "ہارسز" پر اپنی نسل کی بقا کے لیے ایک اور جوا کھیلے گی؟؟ ماں، مذہب اور ملک میں ایک خاص تعلق ہوتا ہے جسے توڑنا کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔ ماں کو تو کوئی بدل ہی نہیں سکتا، مذہب تبدیل کر کے دوسرے مذہب میں جانے والے بھی اس تاریخ کا حصہ ہیں۔ اپنا ملک خواہ کسی بھی وجہ سے چھوڑنا پڑے ایسے کئی مہاجر اور جلاوطن بھی ہر دور میں رہے ہیں۔ سیاسی جماعت جو عام طور پر ایک نظریے کے تحت قائم کی جاتی ہے جس کو مان کر لوگ اس میں شامل ہوتے ہیں۔ یوں کسی کا سیاسی جماعت بدلنے سے مراد اس نظریے سے منحرف ہونا ہے۔ اس وقت وطن عزیز

میں "سیاسی مرتدوں کے سلسلہ بیعت" کا موسم عروج پر ہے۔ کیا یہ "سیاسی مرتد" عمران خان کے ہاتھ پر بیعت کر کے "سیاسی مومن" بن گئے ہیں؟ کیا ان کے ہاتھ عمران خان کے ہاتھ بیعت کرنے سے ہر گناہ سے پاک ہو گئے ہیں؟ کیا تحریک انصاف سے بھی انصاف "صاف" ہو گیا ہے؟ کیا حفیظ اللہ نیازی صرف اس لیے تحریک انصاف کا ترجمان ہے کہ وہ عمران کا برادرِ نسبتی اور حسان نیازی اس لیے آئی ایس ایف کا مرکزی آرگنائزر ہے کہ عمران خان اس کا ماموں ہے۔ گزشتہ سولہ سالوں سے حفیظ اللہ نیازی نہ تو تحریک انصاف کا ممبر تھا اور نہ ہی اُس نے عمران خان کے ورکروں کے ساتھ کھڑے ہو کر کسی میدان میں کوئی معرکہ سرانجام دیا لیکن بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے۔ اب تو انعام اللہ نیازی اور اس کے علاوہ بہت سے نیازی بھی حصوں بخروں کے لیے دانت تیز کرنا شروع ہو چکے ہیں۔ یہی وہ روایتی سیاست ہے جس کے خلاف عمران خان نے انقلاب لانا تھا مگر افسوس یہ "سیاسی مرتد" کسی کے دوست نہیں ہوتے ان کے جانے سے اچھی خاصی "انصافی" سیاسی جماعت کے اپنے ورکر نا انصافیوں کا شکار ہو گئے ہیں۔

دی ایشنز 13 جنوری 2012ء

روزنامہ "دن" لاہور 20 جنوری 2012ء

176

قابل غور

☆ برطانوی حکومت نے یہ اعلان کیا ہے کہ اگر کوئی کمپنی کسی ایسے 25 برس سے کم عمر کے نوجوان کو کام دیتی ہے جو ایک خاص مدت سے بیروزگار ہے تو اس صورت میں اس نوجوان کی آدھی تنخواہ برطانوی حکومت ادا کرے گی۔

☆ اس جنگ نے ساری دنیا میں ”معاشی بحران“ کی ایسی آگ رکھی ہے جس کی تپش ہر ملک میں محسوس کی جا سکتی ہے۔ اتنا وقت، پیسہ اور قیمتی جانیں ضائع کر کے آج تک کیا حاصل کیا گیا؟؟؟؟؟ جنگوں سے تو قومیں تباہ ہوتی ہیں اور حالتِ امن میں ہی ترقی کرتی ہیں۔

☆ ایک عظیم ماہر نفسیات کا قول ہے کہ اگر تم کسی بچے کی تربیت کرنا چاہتے ہو تو تمہیں اس عمل کا آغاز اُس کے دادا کی تربیت سے کرنا ہوگا۔

☆ اُس کے اثرات سے برطانیہ بھی محفوظ نہیں رہا اور اسی معاشی بدحالی کی جیتی جاگتی تصویریں ”تاج کی حدود“ میں ہر جگہ دیکھی جا سکتی ہیں۔

آج کا بچہ کل کا باپ

ایک عظیم ماہر نفسیات کا قول ہے کہ اگر تم کسی بچے کی تربیت کرنا چاہتے ہو تو تمہیں اس عمل کا آغاز اُس کے دادا کی تربیت سے کرنا ہو گا۔ کسی بھی قوم کے مستقبل کا دارومدار اُس کے حال کی نوجوان نسل پر ہوتا ہے کیونکہ آج کا نوجوان ہی حقیقت میں قوم کی تقدیر کا وہ ستارا ہے جس نے قوم کے مقدر کے آفاق پر چمکنا ہوتا ہے۔اس وقت دنیا میں معاشی بدحالی کی جلیبر دوڑ رہی ہے اُس کے اثرات سے برطانیہ بھی محفوظ نہیں رہا اور اسی معاشی بدحالی کی جیتی جاگتی تصویریں ''تاج کی حدود'' میں ہر جگہ دیکھی جا سکتی ہیں۔بیروزگاری کی شرح میں بتدریج اضافہ ''معاشی بحران'' کا ایک بنیادی اور خطرناک سبب ہے۔رواں سال برطانیہ میں بے روزگار نوجوانوں میں گزشتہ برس سے 12فیصد اضافہ ہوا جس سے بے روزگار نوجوانوں کی مجموعی تعداد 1.16ملین تک پہنچ گئی ہے۔ان میں سے اکثریت ان نوجوانوں کی ہے جنھوں نے آج تک برطانیہ میں کبھی کام کر کے دیکھا ہی نہیں ۔اس خطرناک صورت حال کو قابو میں کرنے کے لیے برطانوی حکومت نے یہ اعلان کیا ہے کہ اگر کوئی کمپنی کسی ایسے 25برس سے کم عمر کے نوجوان کو کام دیتی ہے جو ایک خاص مدت سے بیروزگار ہے تو اس صورت میں اس نوجوان کی آدھی تنخواہ برطانوی حکومت ادا کرے گی۔ اس ہنگامی اقدام کا مقصد نوجوان نسل کو مزید ''ناکارہ'' ہونے سے بچانا اور معاشرے کا فعال شہری بنانا ہے۔اس طرح 25سال سے کم عمر کے نوجوانوں کے کام کے مواقع تو ضرور بڑھیں گے مگر دوسری طرف 25برس سے زائد عمر کے افراد میں بے روزگاری کی شرح خطرناک حد تک بڑھ جائے گی۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ کمبل چھوٹا ہے......یا تو پاؤں ڈھانپ لو یا سر......! ایسے میں بے روزگاری کی شرح میں تو کمی نہیں ہو گی بس چہرے بدل جائیں گے۔اس اعلان کے بعد ظاہر ہے

کمپنیوں کے مالکان نئی نسل کو پرانی پر ترجیح دیں گے تا کہ ان کے 50فیصد تنخواہوں کے اخراجات کا بوجھ برطانوی حکومت اٹھا لے۔ حالانکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس مسئلے کا حل مستقل بنیادوں پر کیا جائے جس سے روزگار کے وافر مواقع پیدا ہوں۔جس سے ہر عمر کے لوگ یکساں مستفید ہو سکیں۔اس کے لیے وہ ''خطیر رقم'' جو ہر سال دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر خرچ کی جا رہی ہے اور آئندہ بھی کرتے رہنے کا وسیع پلان ہے اس رقم کو ملکی مفادات کی خاطر تعمیری اور فلاحی کاموں پر لگایا جائے۔ اس جنگ نے ساری دنیا میں ''معاشی بحران'' کی ایسی آگ رکھی ہے جس کی تپش ہر ملک میں محسوس کی جا سکتی ہے۔اتنا وقت، پیسہ اور قیمتی جانیں ضائع کر کے آج تک کیا حاصل کیا گیا؟ جنگوں سے تو قومیں تباہ ہوتی ہیں اور حالتِ امن میں ہی ترقی کرتی ہیں۔ساحر لدھیانوی نے ٹھیک کہا تھا۔

جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے
جنگ کیا مسئلوں کا حل دے گی
آگ اور خون آج بخشے گی
بھوک اور احتیاج کل دے گی

دی ایشز 18جنوری 2012ء

قابل غور

☆ نیک روح کی طرح اچھی خبر بھی ناپید ہوتی جارہی ہے۔ شاید اسی لیے ہمارا میڈیا دل ہلا دینے والی خبروں کے آخر میں جب کوئی انٹرٹینمینٹ یا اچھی خبر سناتا ہے تو یہ خبر اکثر درآمد شدہ ہوتی ہے۔

☆ فنکاروں اور گلوکاروں کی طرح اب کھلاڑیوں نے بھی ''بھارتی منڈی'' میں اپنی بولی لگوانے کی کوشش کی مگر بھارتی بورڈ کی مکارانہ چال نے سب کی بولتی بند کر دی۔

☆ سعید اجمل کے ''دوسرے'' سے تو گورے پہلے سے ہی خوف زدہ تھے مگر اس نے تو ''تیسرا'' اور ''چوتھا'' بھی متعارف کروا دیا جو گوروں کو اتنا ہی ''اوکھا'' لگا جتنی سعید اجمل کو انگریزی زبان......!

☆ اگر کرکٹ میں ادارے کے سربراہ کے اہل اور دیانتدار ہونے سے ایسی خوش کن تبدیلی آ سکتی ہے تو باقی اداروں میں اس فارمولے پر عمل کیوں نہیں کیا جا سکتا؟

☆ جاگیردار، سرمایہ دار اور مذہبی پیشوا یہ ایک ایسی تکون ہے جو مل کر صدیوں سے لوگوں کا استحصال کر رہی ہے۔

وائٹ واش نے گورے منہ کالے کر دیئے

پاکستان کو اس وقت ہر شعبے میں بحران کا سامنا ہے۔ جسے دیکھ کر جان سے عزیز پاکستان "بحرانستان" لگنا شروع ہو جاتا ہے۔ نیک روح کی طرح اچھی خبر بھی ناپید ہوتی جا رہی ہے۔ شاید اسی لیے ہمارا میڈیا دل ہلا دینے والی خبروں کے آخر میں جب کوئی انٹرٹیمنٹ یا اچھی خبر سناتا ہے تو یہ خبر اکثر درآمد شدہ ہوتی ہے۔ شاید ہماری عوام کو بھی "درآمدی" چیزوں کا چسکا اب نشے کی لت تک رگوں میں سرایت کر چکا ہے۔ اب تو حال یہ ہو گیا ہے کہ فنکار اور گلوکار جب تک باہر سے مہر لگوا کر نہ آ جائیں ان کے فن کا کوئی قدر دان ڈھونڈے نہیں ملتا۔ فنکاروں اور گلوکاروں کی طرح اب کھلاڑیوں نے بھی "بھارتی منڈی" میں اپنی بولی لگوانے کی کوشش کی مگر بھارتی بورڈ کی مکارانہ چال نے سب کی بولتی بند کر دی۔ کرکٹ کے کھیل کو اس لحاظ سے خاص اہمیت حاصل ہے کہ یہ ساری عوام کو چاہے کچھ دیر کے لیے ہی سہی "قوم" بن جانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ذہنی دباؤ، انتشار اور تناؤ کے اس دور میں آج بھی ہماری عوام کرکٹ کا میچ دیکھ کر وقتی طور پر سارے غموں سے آزاد ہو جاتی ہے۔ جہاں ملک کے سارے ادارے پستی کے بھنور میں پھنسے ہیں وہاں کرکٹ بھی کچھ سالوں سے مسلسل زوال پزیر ہو رہی تھی۔ سری لنکا کی کرکٹ ٹیم پر دہشت گردوں کے حملے کے بعد پاکستانی سرزمین پر بین الاقوامی کرکٹ کا باب تا حال بند ہے۔ ایسے میں ہماری ٹیم کو ہوم سیریز بھی بیرون ملک کھیلنا پڑ رہی ہیں۔ نامساعد حالات کے باوجود پاکستان کی ٹیم نے ورلڈ کپ میں سیمی فائنل تک رسائی حاصل کی۔ پھر بنگلہ دیش، سری لنکا اور انگلینڈ کو باری باری زیر کیا۔ انگلینڈ کی ٹیم جو آسٹریلیا، انڈیا، سری لنکا اور جنوبی افریقہ کی ٹیموں کو ہرانے کے بعد ٹیسٹ رینکنگ میں پہلی پوزیشن پر براجمان ہے۔ گوروں کی اس مضبوط ٹیم کو پاکستان کی

ٹیم نے وائٹ واش سے ایسا منہ کالا کیا ہے جس کی مثال پہلے کبھی نہیں ملتی۔ نمبر ون کے نشے میں چور گورے اپنی اس شکست کو کھلے دل سے تسلیم کرنے کی بجائے حسب روایت الزامات کے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرنا شروع ہو چکے ہیں۔ اس میں برطانوی میڈیا نے بھی کھل کر اپنا حصہ ڈالا دیا ہے۔ سعید اجمل کے "دوسرے" سے تو گورے پہلے سے ہی خوف زدہ تھے مگر اس نے تو "تیسرا" اور "چوتھا" بھی متعارف کروا دیا جو گوروں کو تا ہی "اوکھا" لگا جتنی سعید اجمل کو انگریزی زبان...... برطانوی اخبارات نے پاکستان کے جیتنے کی خبر سے زیادہ جیتنے کی وجہ یا بے بنیاد الزامات کو زیادہ شہ سرخیوں میں لکھا۔ پاکستان کی اس شاندار پرفارمنس پر بھارتی میڈیا نے اپنی ٹیم کی ذلت آمیز شکست پر پاکستانی ٹیم سے سیکھنے کا مشورہ دیا ہے۔ اگر پاکستان کی موجودہ ٹیم کا جائزہ لیا جائے تو اس میں ماضی کی طرح سپر سٹارز کا جھرمٹ دکھائی نہیں دیتا۔ فاسٹ باؤلنگ کے شعبے میں ماضی کی طرح کوئی بڑا نام نہیں، بیٹنگ میں یونس خان کے علاوہ کوئی تجربے کار کھلاڑی بھی نہیں۔ کافی عرصے سے پاکستان میں کوئی ہوم سیریز بھی نہیں ہوئی۔ ایسے واقعات بھی رونما ہوئے جس سے کھلاڑیوں کا ذہن دباؤ کا شکار بھی رہا۔ ان تمام حالات کے باوجود نتائج اتنے مثبت آنا کسی خاص چیز کو ظاہر کرتے ہے۔ نتائج کا اسباب اور محرکات سے بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اسپاٹ فکسنگ میں ملوث چند کھلاڑیوں کو سزا ہونے سے باقی کھلاڑی اپنے پیشے سے دیانتدار ہو گئے۔ سب سے اہم بات ادارے کا نااہل اور بد دیانت سربراہ کے تبدیل ہونے سے اس کے مثبت اثرات نیچے تک محسوس کیے گئے۔ اعجاز بٹ کے جانے سے ادارے سے نحوست کے بادل چھٹنا شروع ہوئے۔ ٹیم متحد ہو کر کھیلتی نظر آئی ہر کھلاڑی نے اپنی پوری جان لڑائی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ نسبتاً کمزور ٹیم اپنے سے طاقتور حریف کو زیر کرنے میں کامیاب ہو رہی ہے۔ اگر چند کھلاڑیوں کو ان کے کیے کی سزا دینے سے باقی ٹیم دیانتداری سے کھیل سکتی تھی تو یہ کام بہت پہلے کر دینا چاہیے تھا۔ خیر دیر آید درست آید......! اگر کرکٹ میں ادارے کے سربراہ کے اہل اور دیانتدار ہونے سے ایسی خوش کن تبدیلی آ سکتی ہے تو باقی اداروں

میں اس فارمولے پر عمل کیوں نہیں کیا جا سکتا؟ ملک کے سربراہ سمیت اگر تمام اداروں کے سربراہان اہل اور دیانتدار تعینات کر دیئے جائیں تو ملک کے مسائل دنوں میں کم ہونے شروع ہو جائیں گے۔ اس مقصد کے لیے عامر، آصف اور سلمان بٹ جیسی گندی مچھلیوں کو عبرت کا نشان بھی بنانا پڑے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اگر کوئی جرأت کا مظاہرہ کرے تو ان گندی مچھلیوں کے ساتھ ساتھ چند مگرمچھوں کو بھی ہاتھ ڈال دے تو باقی ان کا انجام دیکھ کر ہی بندے کے پتر بن جائیں گے۔ بدقسمتی سے نظام، اصول، قانون اور قاعدے بھی ایک خاص طبقے کو تحفظ دینے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ ایک عام شہری کو کبھی اس نظام سے فائدہ نہیں ہوا اور آئندہ ہوتا نظر بھی نہیں آتا۔ اگر قانون اور انصاف سب کے لیے برابر ہوتا تو کسی بڑے مگرمچھ کو استثناء حاصل نہ ہوتا، عدالتی فیصلوں کی دھجیاں نہ بکھیری جاتیں، یوں کھلے عام توہین عدالت کے مرتکب نہ ہوتے، عدالتی حکم ماننے سے انکار نہ ہوتا......! ہماری جیلوں میں آج بھی ایک کثیر تعداد ایسے غریبوں کی ہے جنہیں ان کے معمولی جرم کی سزا سنانے سے قبل ہی اتنی دیر تک پابند سلاسل رکھا جاتا ہے جو ان کے جرم کی سزا سے زیادہ ہوتی ہے۔ دوسری طرف اشرافیہ ہے جو تمام قوانین سے اپنے آپ کو بالاتر سمجھتے ہیں اور قانون سے کھیلنا ان کا مشغلہ ہوتا ہے۔ بقول تھاری میکس ......عدل و انصاف نام ہے حکمران طبقے کے مفادات کی نگہداشت کا اور چند طاقتور لوگوں نے کمزوروں اور غریبوں کو دبانے کے لیے قوانین بنا رکھے ہیں۔ عدل و انصاف کی یہ تعریف آج بھی ہمارے ملک میں دیکھی اور محسوس کی جا سکتی ہے۔ جاگیردار، سرمایہ دار اور مذہبی پیشوا یہ ایک ایسی تکون ہے جو مل کر صدیوں سے لوگوں کا استحصال کر رہی ہے۔ خود قرآن مجید میں جن تین بڑے کرداروں کو مطعون قرار دیا گیا ہے ان میں فرعون، قارون اور ہامان بالترتیب حکمران اشرافیہ، سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہی "تثلیث" تاریخ کے مختلف ادوار میں حکومتی معاملات اور وسائل پر قابض رہی ہیں۔ وطن عزیز میں بھی یہ تینوں کردار کروفر کے ساتھ بالواسطہ یا بلاواسطہ سیاہ و سفید کے مالک بنے ہوئے ہیں۔

رہزنوں سے لوگوں کو خوف ہو بھلا کیوں کر
راہبر بھی اپنے ہاں رہزنی ہی کرتے ہیں

نظام میں تبدیلی کبھی نیچے سے نہیں آئی اس کے لیے مفاد پرست اقلیتی ٹولے سے جان چھڑانا ہو گی جس نے اکثریتی عوام کو بے بس کر رکھا ہے۔ اگر قومی کرکٹ ٹیم گوروں کی ٹیم کو وائٹ واش کر کے اُن کا منہ کالا کر سکتی ہے تو عوام کا خون چوسنے والے جن کا اپنا خون سفید ہو چکا ہے ان کا منہ بھی کالا کیا جا سکتا ہے۔ تا کہ وہ کبھی بھی سیاست کے میدان کے اردگرد بھی منڈلاتے نظر نہ آئیں۔ پاکستان کے سزا یافتہ کھلاڑیوں کی طرح۔ بس ایک جرأت مندانہ فیصلے کی ضرورت ہے جو آج نہیں تو کل لینا ہی پڑے گا۔

روزنامہ "دن" لاہور 19 فروری 2012ء

دی نیشن لندن 17 فروری 2012ء

قابل غور

☆ چیونٹی کو دیکھیں تو محنت، جفاکشی اور ہمت کا سرچشمہ لگتی ہے۔ جو اپنے وزن سے ہزار گنا زیادہ بوجھ اٹھا کر بھی نہیں تھکتی اور ہم پر تو اپنے گناہوں کے بوجھ کے علاوہ کوئی اضافی بوجھ نہیں ہوتا مگر ہم اکثر جلد ہمت ہار جاتے ہیں۔

☆ کوے کو دیکھا جائے تو کوئی کھانے والی چیز نظر آجائے تو شور مچا کر اپنی ساری برادری کو اکٹھا کر لیتا ہے اور ہم بھی تو ہیں...... جو مل کر کھا سکتے ہیں مگر صرف اس...... ملک کو۔

☆ قناعت میں بھی کتے کا اپنا مقام ہے مگر اس کی اچھی باتیں شاید اس لیے نہیں اپناتے کہ کہیں حیوانی صفات اپنانے سے ہماری انسانیت کی توہین نہ ہو جائے۔

☆ اس وقت ہوس کے پجاریوں کا بنایا ہوا یہ شیر ہماری دھرتی پر غرا رہا ہے اور ہمارے لیڈروں کی سیاسی قلابازیاں دیکھ کر لگتا ہے وہ بھی کسی بندر یا بلی سے کم نہیں اور ہنگامی حالات میں خود تو جان بچانے کے لیے محفوظ درختوں پر چڑھ جائیں گے۔ مگر اس عوام بیچاری کا کیا ہوگا......؟

ہم حیوانوں سے کیوں نہیں سیکھتے ؟

زندگی اللہ تعالیٰ کی وہ امانت ہے جو ہر مخلوق کو کبھی نہ کبھی واپس لوٹانا ہے۔ کائنات کے خالق نے دنیا بنائی اور انسان کو اشرف المخلوقات کے درجے پر فائز کیا۔جو چیز انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہے وہ زبان، قوت مشاہدہ، تجسس، تحقیق، تجربات، پڑھنا لکھنا وغیرہ شامل ہے۔جس کی بنا پر ارتقائی عمل بڑی سبک رفتاری سے طے ہوتا ہوا آج انفارمیشن ٹیکنالوجی کے دور میں داخل ہو چکا ہے۔نت نئی ایجادات نے انسان کے لیے بہت سی سہولتیں بھی ایجاد کی ہیں اور قدرت کے راز بھی تسخیر کر رہا ہے، یہ بھی انسان ہونے کے ناطے اُس کی ذمہ داری تھی۔ایسے میں جہاں انسانی زندگی کا معیار اعلیٰ ترین ہو گیا ہے۔ وہاں پر اشرف المخلوقات سے افضل المخلوقات بننے کے چکر میں کافی مشکلات بھی پیش آتی جا رہی ہیں۔

اچھی زندگی گزارنے کے لیے کیا اچھا انسان ہونا ضروری ہے؟ اچھے انسان کی تعریف ماحول، حالات، جغرافیہ، ثقافت، مذہب، علاقے، تہذیب اور معاشرتی قدروں سے بدلتی جاتی ہے۔مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ بہترین انسان بننے کے لیے ہمیں جہاں سے بھی اچھی چیز ملے اسے اپنانا چاہئے جیسا کہ نبیؐ نے فرمایا کہ عقل کی بات مومن کا گمشدہ خزانہ ہے وہ اسے جہاں دیکھتا ہے اپنا لیتا ہے۔اصلاح کے لیے اگر ہم کو اشرف المخلوقات کے نچلے درجے والی مخلوق یعنی حشرات الارض سے بھی کوئی اچھا سبق ملے تو ہم کو سیکھنے اور اس پر عمل کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرنی چاہئے۔

چیونٹی کو دیکھیں تو محنت، جفاکشی اور ہمت کا سرچشمہ لگتی ہے۔ جو اپنے وزن سے ہزار گنا زیادہ بوجھ اٹھا کر بھی نہیں تھکتی اور ہم پر تو اپنے گناہوں کے بوجھ کے علاوہ کوئی اضافی بوجھ نہیں ہوتا مگر ہم اکثر جلد ہمت ہار جاتے ہیں۔شہد کی مکھیوں کو دیکھیں جو

ملکہ مکھی کی اطاعت میں اس کے پیچھے لبیک کہہ کر شہد بنانے میں جت جاتی ہیں اور یہ شاید ان کی اطاعت کا ہی میٹھا ثمر ہے کہ شہد میں دنیا کی بے شمار بیماریوں کی شفاء ہے۔ ہماری قوم کو آج تک ایسی ملکہ مکھی کی طرح کوئی مخلص لیڈر ہی میسر نہیں آیا جس کی آواز پر لبیک کہا جا سکے۔ہمارا حال تو ان جاہل بھیڑوں کی طرح ہے جو کسی کے پیچھے بھی منہ اٹھا کر چل پڑتی ہیں چاہے انجام اندھا کنواں ہی کیوں نہ ہو۔

صبح سویرے چرند پرند اٹھ کر حمد باری تعالیٰ میں مصروف ہوتے ہیں۔سونے جاگنے کے مخصوص اوقات ان کے وقت کی پابندی کرنے کا پتہ بھی دیتے ہیں۔نظم وضبط کا یہ عالم کہ ہوا میں اڑتے پرندے کبھی آپس میں ٹکرا کر زمین پر نہیں گرتے۔اور ہم ہر لمحے حادثات کا شکار ہو رہے ہیں۔کوے کو دیکھا جائے تو کوئی کھانے والی چیز نظر آ جائے تو شور مچا کر اپنی ساری برادری کو اکٹھا کر لیتا ہے اور ہم بھی تو ہیں ......جو مل کر کھا سکتے ہیں مگر صرف اس ملک کو۔اپنے کمزور اور ناتواں چوزوں کو چیل اور بلی سے بچانے کے لیے مرغی کو کبھی انہیں اپنے پروں کے نیچے لینا پڑتا ہے اور کبھی دشمن پر دفاعی حملہ بھی کر دیتی ہے۔ہمارے ہاں لیڈر شپ خود سخت سیکیورٹی اور بلٹ پروف گاڑیوں میں ہوتے ہیں لیکن غریب اور کمزور عوام کو موت کے منہ میں دھکیل دیا جاتا ہے۔پیڑ کو دیکھیں تو خود سورج کی تپش برداشت کرتا ہے اور دوسروں کے لیے ٹھنڈی چھاؤں کا موجب ہوتا ہے۔

کتے کی وفاداری سے بھلا کون انکاری ہو سکتا ہے۔جو اپنے مالک کے آگے پیچھے دم بھی ہلاتا ہے اور اس کی طرف کوئی میلی آنکھ سے دیکھے تو وہ بھونکتا بھی ہے اور کبھی موقع آئے تو مالک کے دشمن کو کاٹتا بھی ہے۔بدقسمتی سے ہماری اشرافیہ دم بھی ہلاتی ہے اور پاؤں بھی چاٹتی ہے اور وہ بھی ان کے جو ہمارے خیر خواہ نہیں ......! جن کو پیٹ کاٹ کر اپنی حفاظت پر معمور کرتے ہیں موقع ملنے پر امریکہ کی زبان بولنا شروع کر دیتے ہیں۔ کتے کے کردار کی بھی اک صفت ہے کہ اگر کوئی مادہ کسی نر کا انتخاب کر لے تو باقی سب کتے اپنی قسمت پر شاکر ہو کر رفو چکر ہو جاتے ہیں لیکن اشرف المخلوقات میں ابھی

یہ صفت بھی پوری طرح پروان نہیں چڑھی۔تبھی تو بچہ اپنا اور بیوی دوسرے کی اچھی لگتی ہے۔قناعت میں بھی کتے کا اپنا مقام ہے مگر اس کی اچھی باتیں شاید اس لیے نہیں اپناتے کہ کہیں حیوانی صفات اپنانے سے ہماری انسانیت کی توہین نہ ہو جائے۔ہاں ......!!ان کی بری باتیں اپناتے ہم کو ذرا بھی ملال نہیں ہوتا۔کتا کتے کا بیری ہوتا ہے......ہم کیا کم ہیں؟بڑی مچھلی چھوٹی کو کھا جاتی ہے تو کیا ہم کوئی موقع ہاتھ سے جانے دیتے ہیں؟ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے میں ہمارے سیاسی اکابرین بھی ماہر ہیں۔مگرمچھ کے آنسو بہانے میں بھی ہم خودکفیل ہیں۔ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور کھانے کے اور ہوتے ہیں۔ہمارے یہ خفیہ دانت آج تک کسی کو نظر نہیں آئے جن سے نہ جانے کیا کچھ نگل کر ہم ڈکار چکے ہیں اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔چیونٹی ذخیرہ اندوزی کرتی ہے......اس معاملے میں کیا ہم اک چیونٹی سے مات کھا کر اپنی انسانیت کی ناک کٹوا لیں؟

قدر نہ جانے گرج کی جانے ......مردے کھاون والی

مگراب تو ہمارے ہاں مردے کھانے والے بھی ہیں،مچھروں اور جونکوں کی طرح خون چوسنے والوں کی بھی کوئی کمی نہیں......!

جہاں جانوروں کا ذکر ہو اگر حیوانوں کے شاہ کا ذکر نہ ہو تو ساری حیوانیت کے ساتھ زیادتی ہو گی۔اور سپر پاور۔ببر شیر کو ناراض تو نہیں کرنا۔چلو اس کی بھی چند صفات کا ذکر ہو جائے۔بادشاہ سلامت شکار پر اس وقت نکلتے ہیں جب وہ "بھوکے" ہوتے ہیں۔اور صرف اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے وہ تنہا اپنا شکار کرتا ہے۔اور جیسے اس کی بھوک مٹ جاتی ہے وہ کچھ ذخیرہ کیے بغیر اپنی کچھار میں واپس چلا جاتا ہے۔اس کے شکار کا تعلق چاہے کسی نسل کے جانور سے ہو اس کو دبوچنے کے لیے کبھی بیرونی طاقتوں کی ضرورت پیش نہیں آتی۔جنگل کے بادشاہ کو جمہوری قدروں کو پامال کر کے کسی کو غلام بنانے کا بھی کوئی شوق نہیں۔آج دنیا کا جائزہ لیں تو پوری دنیا کو تسخیر کرنے کا خواب دیکھ کر اپنے آپ کو "سپر پاور" کہلانے والا جب بھی کسی شکار پر نکلتا ہے تو اسے

42 ممالک کی نیٹو فورسز کی ضرورت پڑتی ہے۔شاید دنیا کے اس بادشاہ کو اکیلے شکار کرتے خوف محسوس ہوتا ہے۔اور 10 سال بعد جب وہ کبھی فرد واحد کا شکار کرنے میں کامیاب ہو بھی جائے تو پہلا شکار ہضم ہونے کا انتظار کیے بغیر اگلے شکار کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتا ہے۔معاملہ بھوک کا ہوتا تو شاید وقفہ پڑ جاتا ادھر تو "ہوس" ہے۔جس کی کوئی انتہا نہیں۔بس انجام "تباہی" پر ہوتا ہے۔اس وقت ہوس کے پجاریوں کا بنایا ہوا یہ شیر ہماری دھرتی پر غرا رہا ہے اور ہمارے لیڈروں کی سیاسی قلابازیاں دیکھ کر لگتا ہے وہ بھی کسی بندر یا بلی سے کم نہیں اور ہنگامی حالات میں خود تو جان بچانے کے لیے محفوظ درختوں پر چڑھ جائیں گے۔مگر اس عوام بیچاری کا کیا ہو گا......؟اس کا فیصلہ اب عوام کو خود کرنا ہو گا۔

روزنامہ "دن" لاہور...... 22 مئی 2011ء

دی نیشن لندن 20 جنوری 2012ء

❁......❁......❁

قابل غور

☆ ہمارے ملک کے تمام حقائق، مسائل، حالات و واقعات کے اعداد و شمار کمپیوٹر کو بتا کر اس کا حل تجویز کرنے کو کہا جائے تو اس کا شاید ایک ہی جواب دے بھئی! یہ ملک اب تک کیسے چل رہا ہے؟

☆ اپنی ناک چاہے وہ چپٹی ہو یا چھینی مگر ہمیں زندہ رکھنے کے

لیے سانس لینے میں وہی مدد دیتی ہے۔ اس لیے کسی کا اونچا ناک دیکھ کر اپنے ناک کو برا نہیں کہنا چاہیے۔

☆ جیسے کبھی ’’گورے‘‘ ٹیپو سلطان کے نام سے ڈرتے تھے ویسے ہی انڈین ایئر فورس کے لیے ایم ایم عالم کے نام کی دہشت تھی۔ جنہوں نے ایک منٹ سے کم وقت میں اپنے سے بہتر ٹیکنالوجی والے 5 انڈین لڑاکا طیاروں کو فضاء میں مار گرایا جو آج تک ایک ورلڈ ریکارڈ ہے۔

☆ جنوری 1983ء میں جب F16 طیاروں کی پہلی کھیپ نے سرگودھا میں لینڈ کیا تو F16 کے موجد بھی حیران تھے کہ اتنے کم عرصے کی تربیتی پرواز کے بعد اتنی مہارت سے پاکستانی ہوابازوں نے انہیں کیسے اڑا لیا؟

☆ امریکہ بم اور خوش کش بمبار بنوا سکتا ہے لیکن وہ اپنی قوم میں ایک بھی ایسا ہیرو پیدا نہیں کرسکتا اور ابھی تک کی معلوم تاریخ میں کوئی پیدا ہوا بھی نہیں جو اپنے جسم پر باندھ کر ملک کی خاطر جان کی قربانی دینے کی جرأت کر سکے۔

آئی ایس آئی۔۔۔ایمان، اتحاد، تنظیم کا لاثانی ادارہ

شاعرِ مشرق کے خواب کی تعبیر، قائد اعظم محمد علی جناح کی مثالی قیادت، جذبہ اخوت سے سرشار قیادت اور اللہ رب العزت کی خاص رحمت سے پاکستان کی صورت میں دنیا کے نقشے پر ابھرنے والی ریاست کو۔ایمان، اتحاد، تنظیم کے بنیادی اصولوں کے ستونوں پر کھڑا کیا گیا۔یہی وہ اولین درس تھا جو قائد اعظم محمد علی جناح نے اس ریاست کے مستحکم اور طاقتور ہونے کے لیے ایک ہجوم سے قوم میں تبدیل کرتے ہوئے دیا تھا لیکن بدقسمتی سے مخلص قیادت کے فقدان سے یہ لافانی قانون ہمارے معاشرے اور اداروں کا نصب العین اُس طرح نہ بن سکا جس طرح ایک نوزائیدہ ریاست کو اس کی ضرورت تھی۔جس کی وجہ سے آج ہم قدرت کے تمام عطیات، وسائل اور ٹیلنٹ کے باوجود تیسری دنیا کے پسماندہ ممالک کی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔جدید دور میں کمپیوٹر کی تحقیق کے شعبہ میں معاونت اور اجارہ دری سے کسی کو انکار نہیں مگر ہمارے ملک کے تمام حقائق، مسائل، حالات و واقعات کے اعداد و شمار کمپیوٹر کو بتا کر اس کا حل تجویز کرنے کو کہا جائے تو اس کا شاید ایک ہی جواب دے۔بھئی! یہ ملک اب تک کیسے چل رہا ہے؟ میں نے بدترین دہریوں کو کہتے سنا ہے کہ "یقیناً کوئی ایسی مخفی طاقت ہے جو اتنے خراب حالات اور ناقص حکمرانوں کے باوجود ملکی نظام چلائے جا رہی ہے"۔ واقعی اللہ تعالیٰ کی خاص کرم نوازی ہے کہ ہم بے شمار اندرونی اور بیرونی ملک دشمن عناصر کی تمام تر کامیاب کوششوں کے باوجود بہتری کی امید لگائے آج بھی قائم و دائم ہیں۔ ہم میں آج بھی کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جن کے جذبہ ایمانی کی طفیل ہم آزاد ملک میں سانس لے رہے ہیں۔یہ ایک کڑوی حقیقت ہے کہ ہمارے بیشتر ادارے عوامی امنگوں پر آج تک پورے نہیں اترے لیکن ہماری مسلح افواج اور حساس ادارے جن پر ہماری قوم فخر کر سکتی ہے ایمان، اتحاد، تنظیم اُن کا طرۂ امتیاز ہے۔ہماری مسلح افواج اور حساس

ادارے خاص طور پر آئی ایس آئی اپنی اعلیٰ پیشہ وارانہ صلاحیتوں اور کارناموں کی وجہ سے دنیا میں امتیازی مقام رکھتیں ہیں۔بعض اوقات تو انہوں نے ملکی سالمیت اور دفاع کی خاطر ایسے کارنامے انجام دیئے ہیں کہ جن کو انسانی عقل معجزے کا نام دیتی ہے۔ کچھ عرصہ سے افواج پاکستان اور حساس اداروں کے خلاف ایک منظم شیطانی سازش چل رہی ہے۔ایک خاص تسلسل کے ساتھ حساس اداروں کو دہشت گردی کا نشانہ بنایا جا رہا ہے تاکہ عوام الناس کا ان پر اعتماد اور یقین کم ہو جائے کیونکہ عوام کا اعتماد ہی ان کے جذبے اور طاقت کا سرچشمہ ہے۔امریکہ اور اس کے حواری پاکستان کے حساس اداروں کو منفی پراپیگنڈہ کے تیروں سے گھائل کرنے کی کوشش میں ہیں۔ان حالات میں ساری قوم کو اپنی افواج اور حساس اداروں پر بھرپور اعتماد اور حوصلے کا مرہم رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ کسی بھی بیرونی جارحیت کا موثر طریقے سے جواب دے سکیں۔اپنی ناک چاہے وہ چپٹی ہو یا پچکی مگر ہمیں زندہ رکھنے کے لیے سانس لینے میں وہی مدد دیتی ہے۔ اس لیے کسی کا اونچا ناک دیکھ کر اپنے ناک کو برا نہیں کہنا چاہیے۔یہ ناک تو ویسے ہی وقار اور عزت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔جس کو کٹوانا کوئی بھی غیرت مند گوارہ نہیں کرتا۔ ہماری مسلح افواج بھی ہمارے ملک کی "ناک" ہی ہیں جو ہمارے لیے وقار کی علامت ہیں۔ہمیں ان کو اپنی دعاؤں اور اعتماد کے جذبے سے اتنا سرشار کر دینا ہے کہ وہ تمام ملک دشمن عناصر کو "ناک آؤٹ" کر سکیں۔اس میں میڈیا سب سے کلیدی کردار ادا کر سکتا ہے مگر اس بات کا دھیان رہنا چاہیے کہ زبان "ناک" کو نہ لگائی جائے۔میڈیا زبان چلائے ضرور مگر مخالفین کی زبان بند کرنے، اپنی فوج اور حساس اداروں کے دفاع کے لیے!! مختلف ٹی وی چینلز اور اخبارات میں ہر قسم کے پروگرام اور خبریں جس میں سیاسی، مذہبی، کھیل و ثقافتی، فنون لطیفہ، حالات حاضرہ وغیرہ شامل کی جاتی ہیں مگر کبھی کسی نے یہ نہیں کیا کہ مسلح افواج کے ان ہیروز کے کارنامے بھی اس نئی نسل کو بتائیں تاکہ ان میں بھی ایسا کرنے کا جذبہ پیدا ہو سکے۔سال میں صرف ایک بار یوم دفاع منا کر ہم اپنا فرض ادا کر دیتے ہیں حالانکہ ہمارے پاس قومی ہیروز کی ایک طویل فہرست ہے جن سے شاید نئی نسل کی شناسائی بھی نہ ہو۔جیسے کبھی "کورے" ٹیپو سلطان کے نام سے

ڈرتے تھے ویسے ہی انڈین ایئر فورس کے لیے ایم ایم عالم کے نام کی دہشت تھی جنھوں نے ایک منٹ سے کم وقت میں اپنے سے بہتر ٹیکنالوجی والے 5 انڈین لڑاکا طیاروں کو فضاء میں مار گرایا جو آج تک ایک ورلڈ ریکارڈ ہے۔شاید کوئی مائی کا لعل اس کو توڑ بھی نہ سکے۔ اسی طرح اسکوارڈن لیڈر سرفراز رفیقی، اسکوارڈن لیڈر علاؤالدین، اسکوارڈن لیڈر منیر، اسکوارڈن لیڈر اقبال، اسکوارڈن لیڈر عبدالحمید قادری، اسکورڈن لیڈر اطہر بخاری، اسکورڈن لیڈر بدرا اسلام، پائلٹ آفیسر راشد منہاس، فلائٹ لیفٹیننٹ یونس، فلائٹ لیفٹیننٹ خالد محمود، ونگ کمانڈر عبدالرزاق، وغیرہ پاک فضائیہ کے وہ شاہین تھے جن کی شجاعت پر قوم فخر کر سکتی ہے۔بلا شبہ پاکستان کے پائلٹس دنیا کے بہترین ہوا باز ہیں۔جنوری 1983ء میں جب F16 طیاروں کی پہلی کھیپ نے سرگودھا میں لینڈ کیا تو F16 کے موجد بھی حیران تھے کہ اتنے کم عرصے کی تربیتی پرواز کے بعد اتنی مہارت سے پاکستانی ہوا بازوں نے انہیں کیسے اڑا لیا؟پاک بحریہ بھی اتنی طویل و عریض سمندری سرحدوں کا دفاع بڑی کامیابی سے کرتی ہے۔بری فوج کے کارنامے بھی تاریخ کا حصہ ہیں جس میں آج تک اضافہ ہو رہا ہے۔دنیا میں ٹینکوں کی دوسری بڑی لڑائی 1965ء میں چونڈہ کے محاذ پر ہوئی جہاں سینکڑوں جوانوں نے اپنے جسموں پر بم باندھ کر دشمن ٹینکوں کی اس یلغار کو روک کر دنیا کو حیران کر دیا۔امریکہ بم اور خود کش بمبار بنوا سکتا ہے لیکن وہ اپنی قوم میں ایک بھی ایسا ہیرو پیدا نہیں کر سکتا اور ابھی تک کی معلوم تاریخ میں کوئی پیدا ہوا بھی نہیں جو اپنے جسم پر باندھ کر ملک کی خاطر جان کی قربانی دینے کی جرأت کر سکے۔یہ سعادت پاک فوج اور پاک عوام کے حصے میں ہی آئی ہے۔پاک فوج کے شہداء کے کارناموں سے بھرپور ایک طویل فہرست ہے جن کے لیے ملکہ ترنم نے وہ مشہور ترانہ "اے پتر ہٹاں تے نئیں وکدے" گا کر پوری قوم اور پاک فوج کے جوانوں کا خون گرما یا تھا۔ملک کی سلامتی اور دفاع کی خاطر قربان ہونے والوں کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔سیاچن کے یخ بستہ پہاڑ ہوں یا تپتے صحراء ہمارے جوان ہمہ وقت ملک کے دفاع کے لیے جان ہتھیلیوں پر لیے تیار رہتے ہیں۔ملکی سلامتی میں جہاں مسلح افواج کا کردار ہے وہاں اس کے ادارے آئی ایس آئی نے بھی ملک کو

تحفظ فراہم کرنے اور ملک کو پیش آنے والے خطرات کو پہلے سے بھانپ کر ان کا مناسب سدباب کر کے اپنا کلیدی کردار ہمیشہ احسن طریقے سے نبھایا ہے۔بے شک اپنی کارکردگی سے اس کو بھی مسلح افواج کی طرح دنیا کا بہترین انٹیلیجنس ادارہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔اس کے کارنامے حساس نوعیت کے ہونے کی وجہ سے عوام کے سامنے نہیں لائے جاتے۔مگر یہ بھی سچ ہے کہ یہ ہر وقت ہی حالتِ جنگ میں رہتے ہیں۔ملک کو پیش ممکنہ خطرات سے آگاہی ان کی بنیادی ذمہ داری ہے جس میں یہ اپنی مثال آپ ہیں۔پاکستان آج دنیا کا وہ واحد اسلامی ملک ہے جو ایٹمی پاور ہے۔اس میں ذوالفقار علی بھٹو کے بعد آئی ایس آئی اور مسلح افواج کی سب سے زیادہ کوششیں ہیں۔انہوں نے اپنی مہارت سے بہت سی ملکی اور بیرونی سازشوں کو بے نقاب کیا۔ افغانستان اور روس کی جنگ میں اہم کردار ادا کیا۔ہمارے پاس اتنا جدید اور اتنی مقدار میں اسلحہ بارود تو نہیں جیسا امریکہ کے پاس ہے مگر آج تک میدان جنگ میں ہماری فوج کو کسی بیرونی فوج کی مدد کی ضرورت نہیں پڑی۔امریکہ آج تک کبھی صرف اپنی فوج کے بل بوتے پر جنگ جیت نہیں پایا کیونکہ امریکہ اور اس کے حواریوں کے پاس ایمان، اتحاد اور تنظیم کا وہ جذبہ نہیں جو ہماری افواج کے پاس ہے۔اپنے آپ کو سپر پاور سمجھنے والے کو افغانستان میں شکست صاف دکھائی دے رہی ہے۔اس بے عزتی کو چھپانے کے لیے اب اس نے ہماری فوج اور اس کے اداروں پر الزامات لگانا شروع کر دیئے ہیں۔جس سے امریکیوں اور اُس کے حواریوں کا ذہنی فتور سامنے آ رہا ہے۔ امریکہ اور اُس کے حواریوں کے موجودہ رویوں سے دکھائی دے رہا ہے کہ وہ ہماری فوج اور آئی ایس آئی کو دہشت گردوں کے ساتھ تعلقات کا الزام لگا کر ہمارے ملک کو دہشت گرد ریاست قرار دے کر اقتصادی پابندیاں لگانے اور ایٹمی تنصیبات تک رسائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔یہ پہلی بار نہیں ہوا کہ امریکن فوج اور اس کے حساس ادارے ناکامی کا منہ دیکھ رہے ہیں اس سے پہلے بھی کئی بار ایسا ہو چکا ہے۔جیسے 1980ء میں ایران میں ایگل کلاء آپریشن میں ناکامی جمی کارٹر کی الیکشن میں شکست کی وجہ بھی بنی۔ ایک دہائی تک 40 ممالک کی فوج لے کر اسامہ بن لادن کی تلاش میں خوار ہونے والا

امریکہ اپنی سپر پاور کا بھرم رکھنے کے لیے اب الزام تراشیوں پر اتر آیا ہے۔کل تک پاکستان کے ٹکڑوں پر پلنے اور اسلام آباد کی سڑکوں پر پیدل چلنے والا حامد کرزئی بھی امریکی اور بھارتی زبان بول رہا ہے۔افغانستان میں امریکہ کا اعتراف شکست اب براک اوبامہ کے ساتھ ساتھ امریکہ کے زوال کا باعث بھی بنے گا۔خطے میں امن وامان قائم رکھنے کے لیے پاکستان میں امن ہونا لازمی ہے۔جو مسلح افواج اور حساس اداروں کے بغیر ممکن نہیں اس کا احساس امریکہ کو بھی ہونا چاہیے کیونکہ صرف پاکستانی عوام یا پاکستانی تجزیہ نگار ہی نہیں دنیا کی ہر عوام نے امریکہ کی بدنام زمانہ انٹیلی جنس ایجنسی سی آئی کے بارے بہت کچھ لکھا لیکن امریکہ نے امریکی مفادات اور امریکی عوام کے تحفظ کے نام پر اُسے ہر وہ کام کرنے کی اجازت دی جو ریاستی دہشتگردی کے زمرے میں آتی ہے۔امریکہ میں چھپنے والی ایک کتاب (invisble Government) میں تو کھلے عام لکھا گیا کہ امریکہ میں دو حکومتیں کام کر رہی ہیں ایک وہ جو ہم اپنی سوکس کی کتابوں میں پڑھتے ہیں اور دوسرا امریکہ کا وہ صدارتی نظام جسے جمہوری کفن پہنا کر دنیا کے سامنے دفن کیا جاتا ہے۔آئی ایس آئی اگر پاکستان کے مفادات کا دفاع نہیں کرے گی؟ تو کیا کرے گی۔امریکیوں کو اب احمقانہ انداز سے سوچنا ترک کر دینا چاہیے کہ یہی اُن کے مفاد میں ہے۔ورنہ ہم تیسری عالمی جنگ کے دہانے پر کھڑے ہیں اور امریکہ اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ اس بار وہ دوسری جنگ عظیم کی طرح محفوظ رہے گا۔

روزنامہ ”دن“ لاہور-----12 اکتوبر 2011ء

دی نیشن لندن 28 اکتوبر 2011ء

قابل غور

☆ جرائم کی شرح سب سے زیادہ ہونے والے پہلے دس ممالک میں ایک بھی مسلمان ملک شامل نہیں۔

☆ جہاں پر جرم رپوٹ ہونے کی شرح سب سے کم ہے ان میں اکثریت اسلامی ملکوں کی ہے۔

☆ انسان اپنی غلطی دوہرانا چھوڑ دے تو دنیا کے کسی خطے میں تاریخ اپنے آپکو نہیں دوہرائے گی۔

☆ اور اس سے بڑی غلطی اور کیا ہوگی کہ ہم اب بھی امریکہ کو اپنا دوست سمجھیں!

☆ ممکن ہے دینا کی کسی دوسری قوم کے پاس ابھی بہت سی غلطیاں کرنے کی گنجائش ہو لیکن ہمارے پاس اب غلطی کی کوئی گنجائش نہیں۔

☆ آمرانہ ادوار میں ملنے والی امداد ہے جو جمہوری حکومتوں کے دور سے زیادہ ہے۔

اشاعت خاص

پی آئی اے کو ایشیاء کی پہلی ایئر لائن ہونے کا اعزاز حاصل تھا

انسان میں سوچ، مشاہدے اور تحقیق کا عمل اس کو کائنات کی دیگر مخلوقات سے افضل کرتا ہے۔ انسان کو چلنے، پھرنے، دوڑنے اور تیرنے کی صلاحیت تو اللہ تعالی نے عطا کر دیں مگر اس کو اڑنے کی نعمت بارے اللہ نے حکم دیا تھا کہ اسے خود تسخیر کرے اور اشرف المخلوقات نے اللہ رب ذوالجلال کے حکم کی تعمیل میں تسخیر کائنات کو ممکن بنانے کیلئے اڑنے کے اس طریقہ کار کو ہزاریوں کی جدوجہد کے بعد آخر کار دریافت کر ہی لیا۔ انسان آج ترقی کی منازل طے کرتا ہوا انفارمیشن اینڈ ٹیکنالوجی کے دور میں داخل ہو چکا ہے۔ ارتقاء کے اس عمل میں انسان نے ہوا میں اڑنے کے چیلنج کا خواب پورا کر کے اپنے آپ کو "جنوں" اور پرندوں پر برتر ثابت کر دیا ہے۔ اللہ نے انسان بارے اپنے اس دعوی کو سچ ثابت کر دکھایا ہے کہ جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ 400 قبل مسیح چین نے پتنگ کو ایجاد کر کے انسان کو پرواز کے بارے میں سوچنے پر مجبور کیا اور پھر چین نے پتنگ اپنے مذہبی تہواروں، تقریبات اور رسومات میں اڑانے کے لیے استعمال کی۔ انہوں نے اس کو رنگوں سے مزین کر کے تفریح کے لیے بھی استعمال کیا۔ پھر پتنگ کو مزید بہتر انداز دے کر موسم کا حال جاننے کے لیے بھی استعمال کیا گیا۔ اس ایجاد کے بعد انسانوں نے پرندوں کی طرح پرواز کرنے کی کوشش بھی کی اور جس کے لیے پرندوں کی پرواز کی باقاعدہ تعلیم بھی حاصل کی گئی۔ پرندوں کی ساخت کے لکڑی کے پنکھ بنا کر بازو سے منسلک کر کے اڑنے کی ناکام کوششیں بھی ہوتی رہیں۔ پرواز کی خواہش انسان کو تحقیق کی بھٹی میں کندن بناتی رہی۔ 1783ء میں جوزف مائیکل اور جیکولیس

(Etiene Jacques)دو بھائیوں نے پہلا گرم ہوا سے اڑنے والا غبارہ (Hot Air Baloon)دنیا میں متعارف کروایا۔رنگین غبارے میں بکری،مرغ اور بطخ کو بیٹھا کر پرواز کے لیے روانہ کیا گیا۔جو چھ ہزار فٹ کی بلندی میں ایک میل کا فاصلہ طے کرنے میں کامیاب ہوا۔ 21نومبر 1783ء دنیا کی تاریخ میں بڑا اہم مقام رکھتا ہے جب پہلی بار انسان نے فضاء میں گرم ہوا کے غبارے کے ذریعے پرواز کی۔انڈیانا میں پیدا ہونے والا بنجمن فرینکلن (Benjamin Franklin)جو فرانس میں امریکہ کا سفیر تھا اپنے اس کارنامے کی وجہ سے پورے یورپ میں بہت مقبول ہوا۔بنجمن فرینکلین 13.54بجے پیرس میں گرم ہوا کے غبارے میں سوار ہو کر فضا میں بلند ہوا تو وہاں پر موجود تماشائیوں کی ایک کثیر تعداد اس ناقابل یقین لمحات کو دیکھ کر تالیاں بجانے پر مجبور ہو گئی۔جس کا جواب بنجمن فرینکلین نے اپنا ہیٹ اتار کر سیلوٹ کر کے دیا۔یوں انسان کی مصنوعی پرواز کا سلسلہ شروع ہو گیا۔گرم ہوا سے اڑنے والے غبارے کو بعد میں عسکری مقاصد کے لیے بھی استعمال کیا گیا۔اس کے بعد اس عمل کو جدید اور بہتر بنانے کے لیے کوششوں کا سلسلہ جاری رہا۔سر جارج کیلے (Sir George Caley)جسے ایروڈائنامکس کا باپ تصور کیا جاتا ہے۔انہوں نے پچاس سال کے تجربات اور محنت سے دنیا کو گلیڈر (Glidder)کا تصور پیش کیا۔دراصل جہاز کی موجودہ ساخت میں استعمال ہونے والے اہم ترین حصے جو پرواز کو کنٹرول کرنے میں معاونت کرتے ہیں سر جارج کیلے کی کاوشوں کی مرہون منت ہیں۔اسی دوران 1834ء میں Roxbury میں پیدا ہونے والے سیموئل لینگلے (Samuel Langely)جو پیشے کے اعتبار سے سول انجینئر تھے انہوں نے تجربات اور مشاہدات سے فضائی سفر میں مزید جدت پیدا کرنے کی کوشش کی۔فضاء میں پرواز کرتے ہوئے پرندے جو کافی دیر تک پروں کو ہلائے بغیر ہوا میں تیرتے رہتے ہیں کو دیکھ کر سیموئل کے دل میں یہ تحریک پیدا ہوئی کہ اگر کوئی ایسی چیز ایجاد کی جائے جس کو مصنوعی پنکھ لگا دیے جائیں تو مصنوعی پرواز ممکن ہو سکتی ہے۔اپنی سوچ کو تجربات کے مراحل سے گزار کر وہ گلائیڈر بنانے میں

کامیاب ہو گیا۔اسے ابتداء میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ان میں گلائیڈر کا وزن کم ہونے کے ساتھ اس کا مضبوط ہونا تھا۔اس کے علاوہ اس کی بناوٹ اہم ترین مرحلہ تھا۔جس میں پنکھوں کے دباؤ کا مرکز کشش ثقل سے ایڈجسٹمنٹ،پنکھوں کے بلیڈ کا سائز،تعداد اور ان کا رجحان وغیرہ شامل تھا۔1891ء میں سیموئل لینگلے Glidder اڑانے میں تو کامیاب ہو گیا مگر دوران پرواز توازن لانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔پرواز میں توازن لانے اور افقی پرواز میں کامیابی کے لیے اس نے مزید تجربات کرنے شروع کیے۔بالآخر اس نے 6 مئی 1896ء کو بغیر پائلٹ کے بھاپ کی طاقت سے چلنے والی مشین سے اڑنے والا گلائیڈر متعارف کروایا۔جس کی پہلی پرواز کا دورانیہ ڈیڑھ منٹ تھا۔جس سے نصف میل کا فاصلہ طے کیا گیا۔سموئیل نے رفتار اور دورانیہ میں مزید بہتری لا کر مصنوعی پرواز کے اس عمل کو مزید آگے بڑھایا۔سپین امریکہ جنگ کے دوران صدر میکنگلے (Mckingley)نے اس بات میں دلچسپی ظاہر کی کہ گلائیڈر ٹیکنالوجی کو مزید بہتر بنا کر عسکری مشاہدات (Military Observations)کے لیے استعمال کیا جائے۔اس وقت گرم ہوا سے اڑنے والے غباروں کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا۔لہٰذا انہوں نے سیموئل لینگلے کو سرکاری فنڈز فراہم کیے تاکہ وہ ایسا گلائیڈر بنائے جس میں پائلٹ بیٹھ کر اسے اڑائے۔1900ء تک سیموئل ایسا انجن نہ بنا سکا پھر اس کام میں اس کا نائب چارلس مینلے (Charles Manly)بھی شامل ہو گیا۔1903ء تک ان کی دو آزمائشی پروازوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔جس پر عوامی رد عمل ہوا حکومت کو ان کے فنڈز روکنا پڑا۔اسی غم میں سیموئل لینگلے کا ہارٹ اٹیک ہونے سے اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔اسی دوران جرمن انجینئر اوٹو لیلین تھال (Otto Lilienthal)نے لمبی مسافت والا گلائیڈر متعارف کروایا۔جسے پائلٹ کنٹرول بھی کر سکتا تھا۔بدقسمتی سے 2500سے زائد پروازوں کے بعد خراب موسم کی وجہ سے وہ اپنے ہی بنائے ہوئے گلائیڈر میں فضائی حادثے کا شکار ہو کر اس دنیا سے رخصت ہوا۔اوٹو لیلین تھال اور سیموئل لینگلے کے کاموں سے متاثر ہو کر آکٹیو چانٹ (Octave

Channtte) نے جہازوں کے ماڈل بنانے شروع کر دیے۔ جس میں وہ کامیاب ہوگیا۔ اس نے ہوائی جہاز کے موجد رائٹ برادرز (Wright Brothres) سے رابطہ کیا۔ ولبر رائٹ (Wilbur Wright) اور اورول رائٹ (Orville Wright) نے کئی سال مسلسل جدوجہد کر کے دنیا کا پہلا ہوائی جہاز متعارف کروایا۔ اس کے لیے انہوں نے پتنگ، گرم ہوا سے اڑنے والے غبارے اور بھاپ کی طاقت سے اڑنے والے گلائیڈر کے علاوہ پرندوں کی پرواز پر گہری نظر ڈالی۔ اس میں پیش آنے والے تکنیکی اور تحقیقی پہلوؤں کا بغور جائزہ لیا۔

17 دسمبر 1903ء کو 10:35 بجے دنیا کا پہلا ہوائی جہاز فضاء میں بلند ہوا تو دنیا سمٹ کر چھوٹی ہونا شروع ہوگئی اور مہینوں کے فاصلے گھنٹوں میں طے ہونے کا دور شروع ہوگیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ہوائی جہازوں میں جدت آتی گئی۔ یہ مسافروں، مال اور جنگی مقاصد کے لیے استعمال کیے جانے لگے۔ 1913ء میں امریکہ نے دنیا کی پہلی فضائی کمپنی متعارف کروائی۔ اس کے بعد جرمنی کی Lufthansa، ہالینڈ کی KLM اور آسٹریلیا کی Qantas ایئر لائنز کا آغاز کیا گیا۔ یہ تمام ایئر لائنز آج بھی دنیا میں کامیابی سے محو پرواز ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد 1951ء میں ملکی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے قومی ایئر لائن چلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ جسے پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز PIA کا نام دیا گیا۔ 7 جون 1954ء میں پی آئی اے (PIA) کی پہلی پرواز کراچی سے ڈھاکہ روانہ ہوئی۔ یکم فروری 1955ء کو پہلی انٹرنیشنل پرواز لندن براستہ قاہرہ کے لیے روانہ ہوئی۔ اس کے بعد پی آئی اے (PIA) کے نیٹ ورک کو پاکستان کے مختلف شہروں سمیت دنیا کے دیگر ممالک میں بڑی تیزی اور کامیابی سے پھیلایا گیا۔ پی آئی اے (PIA) کو ایشیاء کی پہلی ایئر لائن ہونے کا اعزاز حاصل تھا

جس نے سب سے پہلے جیٹ طیارے بوئنگ 707-321 اپنے بیڑے میں شامل کیے۔ 7 مارچ 1960ء کو پان امریکن ورلڈ ایئر ویز سے یہ طیارے لیز پر لیے

گئے۔ جس سے پی آئی اے (PIA) کی پروازوں کی وسعت لندن سے بڑھ کر نیو یارک تک پہنچ گئی۔ 21 دسمبر 1961ء کو پی آئی اے (PIA) نے اپنے ذاتی جیٹ طیارے بوئنگ 720-040B حاصل کیے۔ جن کی شمولیت سے پی آئی اے کے بین الاقوامی نیٹ ورک میں مزید وسعت آئی۔ 1963ء میں پی آئی اے (PIA) نے نیو یارک کی پروازیں بند کر دیں۔ 29 اپریل 1964ء میں چین کے شہر شنگھائی پرواز چلا کر دنیا کی پہلی غیر کمیونسٹ ایئر لائنز بننے کا اعزاز حاصل کیا۔ 1971ء میں سقوط ڈھاکہ کے بعد مشرقی پاکستان کی پروازیں بند کر دی گئیں۔ 1972ء میں پی آئی اے (PIA) نے نیویارک کا روٹ دوبارہ بحال کر دیا۔ یکم مارچ 1974ء میں پی آئی اے نے پہلی بار بڑے سائز کے جیٹ طیارے DC-10-30 شامل کیے گئے۔ اپریل 1976ء میں پی آئی اے کے بیڑے میں بوئنگ 747-282B شامل کیے گئے۔ مارچ 1980ء میں پی آئی اے میں پہلی بار ایئر بس A300-B4-203 شامل کیے گئے۔ 1985ء میں پی آئی اے ایشیاء کی پہلی ایر لائن بنی جس نے بوئنگ 737-300 اپنے بیڑے استعمال کرنے شروع کیے۔ 25 جون 1991ء میں پی آئی اے نے یورپ اور شمالی امریکہ کے مزید مقامات تک رسائی حاصل کی۔ اس کے لیے بوئنگ 747-367 لیز پر لینے پڑے۔ 2002ء میں پی آئی اے نے بوئنگ کمپنی سے معاہدہ کر کے سب سے بڑے طیارے لینے کا منصوبہ بنایا۔ جس کے نتیجے میں 29 جنوری 2004ء کو بوئنگ 777-240ER حاصل کیے گئے۔ 2 نومبر 2005ء پی آئی اے فرانس کی کمپنی (Avions de Transport Regional) ATR سے معاہدہ کیا۔ اس معاہدے کے بعد 31 مئی 2006ء میں پی آئی اے نے فرانس سے پہلا طیارہ ATR-42-500 حاصل کیا۔ اس وقت پی آئی اے کے پاس درمیانے اور طویل فاصلے کے لیے ایئر بس A310، بوئنگ 747 اور بوئنگ 777 کی خدمات حاصل ہیں۔ اس کے علاوہ کم فاصلے کے لیے بوئنگ 737-300 اور ATR42-500 پر انحصار کیا جا رہا ہے۔

کسی ایسے شخص سے جو کسی خاص کام کو کرنے کی اہلیت رکھتا ہو مگر “نہ”

کرے۔وہ شخص جواس کام کوکرنے اہلیت نہ رکھتا ہومگر اسے کرنے کے لیے دیانتداری سے کوشش کرے بہتر تصور کیا جاتا ہے۔یعنی وہ "بد دیانت" نہیں۔اگر کسی ادارے کا سربراہ اہل اور قابل ہومگر دیانت دار نہیں تو وہ اس ادارے کی بہتری کیلئے کبھی کچھ نہیں کرسکتا۔یہ بات درست ہے کہ اہلیت کواولیت حاصل ہے لیکن اگر تمام تر اہلیت کے باوجود بدیانتی کا عنصر شامل ہوجائے تو پھر کشتیاں کبھی کناروں پر نہیں پہنچتیں۔ہمارے ہاں تو معاملہ اس سے بھی آگے ہے یعنی قومی اداروں میں ایسے سربراہان کا انتخاب کیا جا رہا ہے جو "نا اہل اور بد دیانت" ہیں۔پی آئی اے جس کی پروازوں کا سلسلہ 1954ء سے شروع ہوا آج تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے اس کا شمار کبھی دنیا کی بہترین ایئر لائنز میں کیا جاتا تھا۔اس ادارے کوسنہری دور میں داخل کرنے کا سہرا ایئر مارشل (ر) نور خان کے سر جاتا ہے۔جنہوں نے اس ادارے کی سربراہی کا منصب 1959ء میں سنبھالا انہوں نے 1965ء تک اس ادارے کی کمان سنبھالی۔اپنے دور میں انہوں نے اپنی پیشہ وارانہ مہارت اور دیانتداری سے پی آئی اے کو دنیا میں متعارف ہی نہیں کروایا بلکہ اپنی اعلیٰ قیادت، نیک نیتی اور تجربے کی بناپر بہت جلد اس کا نام معروف ترین اور قابل احترام ایر لائنز میں شامل کر دیا۔ان کی اعلیٰ قیادت کی وجہ سے پی آئی اے نے جس سبک رفتاری سے ترقی کے منازل طے کیں اس کو دیکھ کر حکومت پاکستان نے ان کو دوبارہ 1973ء سے 1978ء تک پی آئی اے کا چیئر مین بنا کر مزید خدمات دینے کا موقع فراہم کیا۔اس مدت کے دوران انہوں نے DC10 اور بوئنگ 747 جیسے بڑے طیاروں کو پی آئی اے میں شامل کیا۔وہ ایک متحرک رہنما اور نئے خیالات کے حامل شخص تھے جنہوں نے پی آئی اے ایسا مثالی ادارہ بنایا جس نے ہر شعبے میں ترقی کی۔سب سے اہم بات کہ انہوں نے پی آئی اے (PIA) کو سیاست اور سیاسی ماحول سے آلودہ ہونے سے بچائے رکھا۔ایئر مارشل (ر) نور خان کی طرح ایئر مارشل (ر) اصغر خان نے بھی پی آئی اے کو مثالی ادارہ بنانے میں اپنا تجربہ دیانتداری سے صرف کیا۔چند ایماندار اور اہل سربراہان کی بدولت پی آئی اے کو بہت جلد دنیا کی ٹاپ ایئر لائنز

میں جگہ ملی۔پی آئی اے کو لندن سے کراچی تک کم ترین وقت 6 گھنٹے 43 منٹ میں ریکارڈ فلائٹ کا اعزاز ملا۔پی آئی اے دنیا کی پہلی ایئر لائنز تھی جس نے بین الاقوامی پروازوں کے دوران موو ی دکھانے کا سلسلہ شروع کیا۔پی آئی اے ساؤتھ ایشیاء کی پہلی ایئر لائن تھی جس نے آٹو ٹکٹیں(Auto Tickets) کی سہولت مہیا کی۔پی آئی اے دنیا کی پہلی ایئر لائن تھی جس نے تاشقند میں اپنی پرواز شروع کی۔پی آئی اے پہلی ایشین ایئر لائن تھی جس نے ناروے کے دارلحکومت اوسلو میں اپنی سروس شروع کی۔دنیا کی پہلی ایئر لائن پی آئی اے تھی جس نے تجارتی جہاز بوئنگ 777-200LR استعمال کیے۔ساؤتھ ایشیاء کی پہلی ایئر لائن پی آئی اے تھی جس نے موبائل فون پر نشستوں کی بکنگ کی سہولت فراہم کی۔ایشاء کی پہلی ایئر لائن جس بوئنگ 737-300 طیارے اپنے بیڑے میں شامل کیے۔اس کے علاوہ پی آئی اے دنیا کی محفوظ ترین ایئر لائنز میں شمار کی جاتی تھی۔جس کا صرف ایک بار جہاز ہائی جیک ہوا اور بہت کم فضائی حادثات پیش آئے۔سفری سہولیات کے معاملے میں اس کا اپنا ایک مقام تھا۔مگر اب حالات یہ ہیں کہ آخری 5 سال میں پی آئی اے کا خسارہ 67.31 بلین روپے ہو گیا ہے۔جس میں سے آخری 2 سال کا خسارہ 41 بلین روپے ہے۔ایک وقت تھا جب بیرون ملک مقیم پاکستانی قومی ایئر لاین کو دوسری ایئر لائنز پر ترجیح دیتے تھے۔مگر اب حالات مختلف ہو چکے ہیں لوگ انتہائی مجبوری کی حالت میں قومی ایئر لائن پر سفر کرتے ہیں کیونکہ قومی ایئر لائن کے کرائے باقی تمام ائر لائنز سے زیادہ اور سفری سہولتیں کم......! ریلوے کی طرح قومی ائر لائن بھی وقت کی پابندی نہیں کر پا رہی، دوران سفر صفائی کا ناقص انتظام، عملے کا مسافروں سے تعاون نہ کرنا وغیرہ شامل ہے۔قومی ایئر لاین کو یورپ اور برطانیہ میں آنے کے لیے جہازوں کی حالت بہتر کرنے کو بھی کہا گیا۔کچھ جہازوں کو تو بین ہی کر دیا گیا۔پی آئی اے کا موجودہ حالت کا ذمہ دار اس کا نا اہل اور بد دیانت سربراہ ہی ہو سکتا ہے۔جنہوں نے اس ادارے کو پانچ برس میں تباہ کر دیا جسے بنانے اور دنیا میں منوانے میں اہل اور دیانت دار سربراہان نے کئی دہائیاں صرف کی تھیں۔عجیب بات

ہے کہ اس ادارے میں بھی سربراہ کا تعین کرتے ہوے اس کا سیاسی پس منظر دیکھا جاتا ہے اس کی اہلیت اور دیانتداری نہیں۔اس وقت بھی ملک میں وہ لوگ خدا کے فضل سے زندہ سلامت ہیں جنھوں نے اس ادارے کو مثالی بنانے میں اپنا کردار ادا کیا۔پی آئی اے کی ڈوبتی ہوئی ناؤ کو بچانے کے لیے آج بھی ان لوگوں سے مدد لی جا سکتی ہے۔اس وقت دنیا میں ایئر بس A380 جیسے دیو ہیکل جہاز محو پرواز ہیں جن کے اندر ایک نئی دنیا آباد ہوتی ہے مگر ہماری قومی ایئر لائن جس میں کبھی دنیا کے تمام بہترین جہاز شامل ہو تے تھے آج آخری ہچکیاں لیتی نظر آ رہی ہے۔جس کے بیشتر جہاز انتظامی امور میں مناسب پلاننگ نہ ہونے کی وجہ سے گراؤنڈ کر دیے گئے ہیں۔چند بد عنوان لوگوں نے اس با وقار ادارے کو جس کا سلوگن باکمال لوگ لاجواب سروس تھا اب بے کمال لوگ بے حال سروس کر کے رکھ دیا ہے۔حکومت بدلنے کے ساتھ ہی ادارے کے سربراہ کی تبدیلی لازمی جزو سمجھا جاتا ہے۔قومی ایئر لائن کو بچانے کے لیے اب ہنگامی طور پر کچھ اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔یہ بھی حقیقت ہے جس چیز کو بنانے اور عروج پر پہنچانے میں 20 سال کا عرصہ لگے اسے تباہ کرنے میں 5 سال ہی کافی ہیں۔مگر اس کو دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لیے 1 سے 2 سال تو لگ ہی جائیں گے۔مگر یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ادارے کا سربراہ پیشہ وارانہ مہارت کے ساتھ دیانت دار نہ ہو۔نجی کاری کی اس دنیا میں کرپشن میں دنیا کے پہلے دس ممالک میں شامل پاکستان میں پی آئی اے کی بربادی کے حوالے سے یہ بات بھی منظر عام پر ہے کہ صدر محترم جناب آصف علی زرداری کی ہمشیرہ محترمہ فریال تالپور انڈس ائر لائن کے نام سے اپنی کمپنی کا آغاز کر چکی ہیں اور یہ سارا کھیل انڈس ائر لائن کو کامیاب کروانے کیلئے کھیلا جا رہا ہے اور کچھ بعید نہیں کہ کسی دن پاکستان کا یہ قومی ادارہ بھی دوسرے بہت سے اداروں کی طرح اقربا پروری کرتے ہوئے کسی پسندیدہ ریاستی عہدہ دار کی ذاتی ملکیت ہو۔ابھی تک تو یہ گمان ہے لیکن وطن عزیز میں گمان کو یقین میں بدلتے دیر ہی کتنی لگتی ہے جبکہ اس سے پہلے بھی بہت سے قومی اداروں کو اونے پونے داموں بیچنے کی کامیاب

اور نا کام کوشش ہو چکی ہیں۔اس وقت قومی ائر لاین کے پاس 39 جہاز ہیں جن میں سے درجن سے زائد پرواز کے قابل نہیں۔ جبکہ اس کو 25 ڈومیسٹک اور 39 انٹرنیشنل Destinations پر اپنی سروس دینا پڑ رہی ہیں۔جن میں پاکستان کے اندر بہاولپور، چترال، دلبدین، ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ اسمعیل خان، فیصل آباد، گلگت، گوادر، حیدر آباد، اسلام آباد، کراچی، لاہور، موہنجو دارو، ملتان، پشاور، پنجگر، کوئٹہ، رحیم یار خان، سیالکوٹ، سکھر، تربت، ژوب وغیرہ شامل ہیں۔اس کے علاوہ بین الاقوامی فلائٹس کی منزل مقصود بنکاک، بیجنگ، کولمبو، دہلی، ڈھاکہ، ہانگ کانگ، کابل، کھٹمنڈو، کوالالمپور، ممبئی، ٹوکیو، ایمسٹرڈیم، بارسلونا، برمنگھم، کوپن ہاگن، فرینکفورٹ، لیڈز، بریڈفورڈ، لندن، مانچسٹر، اوسلو، پیرس، ابو دبئی، الاین، بحرین، دمان، دوحہ، دبئی، جدہ، کویت، مدینہ، مسقط، ریاض، شارجہ، زاہدان، نیو یارک، شکاگو، ٹورنٹو شامل ہیں۔پی آئی اے کے پاس آج بھی سب کچھ ہے لیکن ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ پاکستان کے لوگ اسے اپنا قیمتی اثاثہ سمجھتے ہوئے اس کی حفاظت کی ذمہ داری لے لیں اور وہ لوگ جو اس کو تباہ کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں اُن کی نظر بد سے اسے محفوظ کر لیں کہ یہ اور اس جیسے بہت سے ادارے ہمارے پاس نسل نو کی امانت ہیں اور اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو آنے والی نسل ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔

قومی ایئر لائن میں شامل جہازوں پر ایک نظر

نمبر شمار	جہاز کی قسم	تعداد
1-	ATR 42- 500	7
2-	Boeing 737-300	6
3-	Airbus A310-300	12
4-	Boeing 747-300	5
5-	Boeing 777-200ER	4

-6	Boeing 777-200LR	2
-7	Boeing 777-300ER	3
کل تعداد	-----------	39

قومی ایئر لائن کے سربراہان کی لسٹ

نمبر شمار مینیجنگ ڈائریکٹر مدت عہدہ

-1 ظفر الحسن (1955-1959ء)

-2 ایئر مارشل نور خان (1959-1965ء)

-3 ایئر مارشل اصغر خان (1965-1968ء)

-4 ایس۔یو۔درانی (1968-1971ء)

-5 ایئر مارشل ظفر چوہدری (1971-1972ء)

-6 رفیق سہگل (1972-1974ء)

-7 انور جمال (1974-1980ء)

-8 ایم۔ایم۔سلیم (1980-1981ء)

-9 ایئر وائس مارشل وقار اعظم (1981-1986ء)

-10 ایئر مارشل اعظم داؤد پوتہ (1986-1990ء)

-11 نواز ٹوانہ (1991-1993ء)

-12 ایئر وائس مارشل فاروق عمر (1993-1996ء)

-13 نواز ٹوانہ (1996-1997ء)

-14 عارف علی خان عباسی (1999-2000ء)

-15 شاہد اسلام (Mar 1999- Oct 1999)

-16 عارف علی خان عباسی (1999-2000ء)

-17 شیر افگن ملک (2000-2001ء)

-18 احمد سعید (2001-2005ء)

-19 طارق کرمانی (2005-2007ء)

-20 ظفر احمد خان (2007-2008ء)

-21 اسلم۔آر۔خان (2008-2008)

-22 محمد اعجاز ہارون (2008 - Present)

روزنامہ "ڈان" لاہور 2 فروری 2012ء

قابل غور

☆ نقل کرنے میں برائی نہیں مگر بزرگوں کا قول ہے کہ نقل کیلئے بھی عقل کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ عقل کبھی اپنے مفاد کے خلاف فیصلہ نہیں کرتی ۔مگر افسوس ہم نقل بھی کر رہے ہیں اور عقل سے بھی ہاتھ دھوتے جا رہے ہیں۔

☆ اس وقت برطانیہ سمیت یورپ کے دیگر ممالک معاشی بحران کے عذاب سے گزر رہے ہیں ایسی صورت حال میں ترجیحات تبدیل کرنا مشکل ہو چکا ہے ۔اب لوگوں میں اس تہوار کو منانے میں وہ جوش و جذبہ نظر نہیں آتا جو پہلے کبھی ہوا کرتا تھا۔

☆ کچھ برسوں سے وطن عزیز میں اس" ولائتی تہوار" کو منانے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے ۔اس ولائتی بیماری کو پھیلانے میں ہمارے میڈیا کا کردار بھی ایسا ہی جیسے ڈینگی وائرس کو پھیلانے میں حکومت پنجاب کی غفلت کا!

☆ کسی شہری کو اپنے علاقے کے منسٹر یا میئر کو ملنا اتنا ہی آسان ہوتا ہے جتنا ہمارے ہاں امام مسجد کو ملنا......!! فرق صرف اتنا ہے کہ ادھر کا وزیر عوام کی خدمت کے لیے ہوتا ہے جبکہ ہمارے امام مسجد کی خدمت کے لیے عوام ہوتی ہے۔

اچھے کام کی نقل میں کوئی برائی نہیں......!

فروری کے وسط میں برطانیہ اور یورپ میں شدید سردی اور برف باری باغات سمیت ہر شے کو سفید اوڑھنی میں ڈھانپ لیتی ہے۔ایسے میں ''سرخ گلاب'' بڑا نایاب ہو جاتا ہے۔خاص طور پر ''ویلنٹائن ڈے'' پر اس کی مانگ اور قیمت دونوں میں ایسے اضافہ ہو جاتا ہے جیسے وطن عزیز میں گرمیوں میں بجلی اور سردیوں میں گیس کی فراہمی آب حیات کی طرح افسانوی سی بات لگتی۔وقت گزرنے کے ساتھ مغربی ممالک کے اس تہوار کو منانے کے لیے سرخ گلاب کے ساتھ ساتھ کئی دوسری اشیاء بھی بازاروں میں بکنا شروع ہو جاتی ہیں جن کا رنگ سرخ ہوتا ہے۔ کیونکہ مغربی معاشرے میں سرخ رنگ کو محبت اور پیار کی علامت تصور کیا جاتا ہے۔اس وقت برطانیہ سمیت یورپ کے دیگر ممالک معاشی بحران کے عذاب سے گزر رہے ہیں ایسی صورت حال میں ترجیحات تبدیل کرنا مشکل ہو چکا ہے۔اب لوگوں میں اس تہوار کو منانے میں وہ جوش وجذبہ نظر نہیں آتا جو پہلے کبھی ہوا کرتا تھا۔گزشتہ کچھ برسوں سے اس تہوار کی مخالفت کرنے والوں میں بھی اضافہ ہوتا جارہا ہے جن کے نزدیک یہ فضول اور محض پیسے کا ضیاع ہے۔مگر حیرانگی اس بات کی ہے کچھ برسوں سے وطن عزیز میں اس ''ولائتی تہوار'' کو منانے کا رجحان بڑھتا جارہا ہے۔اس ولائتی بیماری کو پھیلانے میں ہمارے میڈیا کا کردار بھی ایسا ہی جیسے ڈینگی وائرس کو پھیلانے میں حکومت پنجاب کی غفلت کا۔شاید ''جمہوریت'' اسی چیز کا نام ہے کہ عوام کوئی بھی رسم یا تہوار کسی بھی ''رنگ'' میں منائیں اُن کے آزادی اظہار پر کوئی بھی قدغن نہیں لگائی جا سکتی۔مغرب کی حد تک تو جمہوریت ایسی ہی ہے اور جب برطانوی پارلیمنٹ کو دوسری پارلیمنٹوں کی ماں کہا جاتا ہے تو کچھ بعید نہیں کہ سب بچوں کو اس ماں سے ہی سب کچھ سیکھنا پڑے۔یہ بات اب نیو ائیر یا

ویلنٹائن ڈے تک ہی محدود نہیں رہے گی کیونکہ دوسری طرف بھارتی ذرائع ابلاغ اپنی مذہبی رسومات،تہوار،اور کلچر کا پرچار جس رنگین انداز میں کر رہے ہیں اس کے رنگ میں بھی ہمارا معاشرہ بڑی تیزی سے رنگتا جا رہا ہے۔جیسے آج ویلنٹائن ڈے اور نیو ایر منائے جا رہے ہیں وہ وقت دور نہیں جب ''راکھی'' اور ''ہولی'' کے تہوار بھی ادھر عام ہو جائیں گے۔دکھ اور حیرانگی اس بات کی ہے کہ ہم نقل بھی کرتے ہیں تو ان رسموں اور تہواروں کی جو ہماری تہذیب، مذہب اور ثقافت کا حصہ نہیں۔جس کے اپنانے سے ہمارے معاشرے میں کوئی صحت مند تبدیلی نہیں آ سکتی۔جن کی تقلید سے ہمارے نظام میں کوئی تبدیلی نہیں آ سکتی۔اس کے برعکس مغربی معاشرے میں لاتعداد ایسی اچھائیاں موجود ہیں جن کی نقل کرنے سے ہمارے مسائل کم ہونا شروع ہو جائیں گے۔ترقی یافتہ ریاستیں شہریوں کے حقوق کی ذمہ دار ہوتی ہے، ہر شہری کے جان و مال کا تحفظ یقینی بنانے کے لیے ریاست اپنی پوری کوشش دیانتداری سے کرتی ہے،شہریوں کو بنیادی ضروریات کے لیے ترسنا نہیں پڑتا کیونکہ اسکی ذمہ داری بھی ریاست کی ہوتی ہے۔ہر شہری کے لیے بنیادی تعلیم لازمی قرار دی گئی ہے جس کے حصول کو ہر صورت میں ممکن بنائے جانے کے لیے عملی اقدام کیے جاتے ہیں، بنیادی تعلیم کے اخراجات کا ماں باپ کو فکر نہیں ہوتا ،اچھے سکول میں داخلے کے لیے میرٹ کو بنیاد بنایا جاتا ہے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ بچے کے ماں باپ کی معاشی اور سیاسی حالت کیا ہے، غریب آدمی کو قانونی معاملات حل کروانے کے لیے حکومت کی طرف سے قانونی مدد (Legal Aid) پر وکیل کا انتظام بھی کیا جاتا ہے، حکمران وقت بھی کسی معاملے میں عدالت میں پیش ہونے پر ہتک محسوس نہیں کرتا اور نہ ہی عدالت کی توہین کے مرتکب ہوتے ہیں،فوجی جرنیل ، جج،یا اشرافیہ کوئی بھی قانون سے بالاتر نہیں ہوتا۔ہمارے ہاں اگر وزیر اعظم خود کار چلا کر عدالت میں پیش ہو ہی جائے تو اس کو بھی ایک خبر کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے جبکہ یہاں (برطانیہ میں) بڑے بڑے وزیر عام شہریوں کے ساتھ لوکل بسوں اور ٹرینوں میں سفر کرتے عام نظر آتے ہیں۔وہ خود کو عوام کا خدمت گار تصور کرتے ہیں۔کسی شہری کو

اپنے علاقے کے منسٹر یا میئر کو ملنا اتنا ہی آسان ہوتا ہے جتنا ہمارے ہاں امام مسجد کو ملنا! فرق صرف اتنا ہے کہ ادھر کا وزیر عوام کی خدمت کے لیے ہوتا ہے جبکہ ہمارے امام مسجد کی خدمت کے لیے عوام ہوتی ہے۔ قانون و انصاف کی بالا دستی کا یہ عالم ہے کہ کوئی حکمران استثناء کی ڈھال میں اپنے آپکو نہیں چھپاتا اور نہ ہی اپنے قرضوں اور کالی کرتوتوں کو پاک کرنے کے لیے "این آر او کی گنگا میں آشنان" کرتا ہے۔ جہاں عوام کے حقوق کی پاسداری ہوتی ہے وہاں عوام بھی اپنے فرائض انجام دیتی نظر آتی ہے۔ سرکاری، نیم سرکاری، غیر سرکاری ملازمین سمیت بزنس کمیونٹی کے لوگ حکومت کو ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں ٹیکس کی چھری صرف مخصوص طبقے پر ہی چلتی ہے۔ صفائی نصف ایمان ہے مگر ہمارے ملک کو صاف رکھنے کا معیار ہمارے ایمان کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اس کے برعکس برطانیہ اور یورپ کے دیگر ممالک میں لوگ پاک ہوں نہ ہوں مگر اپنے گھر بار کے ساتھ گرد و نواح کو بھی صاف رکھتے ہیں۔ مذہبی آزادی کے ساتھ دوسروں کے مذاہب کا احترام بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ماہ رمضان، عید، ہولی، دیوالی، بیساکھی، کرسمس، ایسٹر جیسے بھی تہواروں پر عوام کی سہولت کے لئے خصوصی رعایتی سیل لگائی جاتی ہے۔ ہمارے ملک میں ایسا موقع آنے پر سب ایک دوسرے کی کھال اتارنے میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ جب تعلیمی سال کا آغاز ہوتا ہے تو کتابوں کاپیوں پر بھی عوامی سہولیت کے پیش نظر خصوصی آفر کی جاتی ہیں، جب چھٹیوں کا سیزن آتا ہے تو سستی سفری سہولتوں کے خصوصی پیکیج کا اعلان کیا جاتا ہے۔ ہمارے ٹرانسپورٹرز اور بک اسٹورز پر ایسے موقعوں کے لیے ناجائز منافع خوری کے لیے انتظار کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی قوم کے نظم وضبط کے معیار کا پتہ لگانا ہے تو اس کے ٹریفک کے بہاؤ کو دیکھ لو۔ لندن کی سڑکیں لاہور سے کم کشادہ ہیں اور ٹریفک کا لوڈ بھی بہت ہے مگر یہاں لوگ ٹریفک کے قوانین کی پابندی کرتے ہیں جس سے گاڑی کا پہیہ چلتا رہتا ہے۔ جہاں پیدل چلنے والے کے پاس زیادہ حقوق ہیں مگر ہمارے ہاں الٹی گنگا بہتی ہے۔ پیدل چلنے والوں کی کون پروا کرتا ہے اسی لیے تو فٹ پاتھوں پر ٹھیلے لگے ہوتے ہیں اور

سڑکوں پر کہیں بھی پارکنگ کرنا عام سی بات ہے۔ چلو یہ ترقی یافتہ ملک ہے اس کے علاوہ ہمارے ہمسایہ ملک بھارت کو دیکھا جائے تو اس کی عمر بھی ہمارے ملک جتنی ہی ہے مگر آج بھارت کا شمار دنیا کے بڑے جمہوریت پسند ممالک میں ہوتا ہے۔ جہاں جرنیلوں کو شب خون مارنے کی عادت نہیں اور نہ ہی انہوں نے کبھی مدت ملازمت میں توسیع لینے کی خواہش ظاہر کی۔ بھارت نے اپنا نصاب اور تعلیمی نظام بدل کر گزشتہ دو دہائیوں میں اپنی معیشت کو بتدریج بہتر بنایا ہے۔ خارجہ پالیسی ایسی بنائی کہ دنیا میں اس کی اہمیت بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اپنے سائنسدانوں کو عبرت کا نشان بنانے کی بجائے بلا تعصب عزت بخشی۔ ہمارا دوسرا ہمسایہ ملک چین جو دنیا میں بہترین نقال کے نام سے بھی مشہور ہے مگر اس نے بھی نقل کی تو کسی اچھی چیز کی اور اچھے مقصد کے لیے۔ اس وقت ہمارے ملک کی جو حالت ہے اگر چین "ٹیکنالوجی کا ماہر نقال" نہ ہوتا تو ہمارا کیا حال ہوتا۔ دنیا میں آج وہی قومیں ترقی یافتہ یا بہتر زندگی گزار رہی ہیں جنہوں نے اپنا نظام اچھے اصولوں پر استوار کیا۔ حضرت عمرؓ کا دور خلافت اس لحاظ سے بڑا سنہری دور تھا کہ ان کے عہد خلافت میں بہت سی اصلاحات متعارف کروائیں گئیں جس کی تقلید مغربی ممالک نے کی اور آج وہ دنیا کی ترقی یافتہ قومیں ہیں۔ حضرت عمرؓ خلیفہ وقت ہونے کے باوجود قاضی کے سامنے پیش ہوئے مگر انہوں نے استثناء کا تصور نہیں دیا۔ ہم کہنے کو تو مسلمان ہیں مگر ہمارا دوغلا معیار ہماری تنزلی کا باعث بنا ہوا ہے۔ آج کے ترقی یافتہ ممالک دراصل اسلام کے سنہری اصول کو بنیاد بنا کر ہی اس مقام تک پہنچے ہیں۔ ان کی بُری اور غیر اخلاقی رسموں کو اپنا کر اپنے آپ کو ترقی یافتہ ظاہر کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ اسی نقل میں ہم اپنی ثقافت، تہذیب اور تاریخ کو ختم کرتے جا رہے ہیں جو ہماری پہچان ہے۔ ہمارے فیملی سسٹم کی مثال دی جاتی تھی اب یہاں بھی مغرب زدہ لوگوں نے اولڈ ہاؤس بنانے اور آباد کرنے شروع کر دیے ہیں۔ نقل کرنے میں برائی نہیں مگر بزرگوں کا قول ہے کہ نقل کے لیے بھی عقل کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ عقل کبھی اپنے مفاد کے خلاف فیصلہ نہیں کرتی۔ مگر افسوس ہم نقل بھی کر رہے ہیں اور عقل سے بھی ہاتھ دھوتے جا

رہے ہیں۔ ویلنٹائن ڈے منانے سے کہیں بہتر ہوتا کہ ہم زرعی معاشرے کے لوگ اس موقع پر دنیا بھر میں یہ تہوار منانے والوں کو پاکستان سے سرخ گلاب بھیجتے تو دنیا بھر کے انسان اس تہوار پر نا صرف پاکستانی گلاب مانگ کر پاکستان کا نام سربلند کر رہے ہوتے بلکہ اپنے اس تہوار میں ہمیں شامل سمجھتے ہوئے اور اربوں ڈالر سرخ گلاب کی خریداری کی صورت میں پاکستانی عوام کی جیب میں ہوتے۔

روزنامہ نیشن لندن 24 فروری 2012ء

روزنامہ ''دن'' لاہور 26 فروری 2012ء

قابل غور

☆ ایسی صورت میں ملک کا نظام و نسق حقیقی معنوں میں حاکم گروہ کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ اہل دولت اور خواص مملکت سازش کر کے کسی کمزور اور بے وقوف شخص کو گدی پر بٹھا دیتے ہیں اور کوئی طاقتور قوم اس پر حملہ کر کے قوم سمیت ان کے تمام وسائل پر بھی قبضہ کر لیتی ہے

☆ غذا حاصل کرنا جانور اور قدیم انسان کا مسئلہ بھی تھا اور جدید انسان اور قدیم جانور کا آج بھی ہے لیکن تاریخ کے ہزاروں سال میں اس مسئلے کی نوعیت بہت بدل گئی ہے۔ جانور اور قدیم انسان کے لیے غذا حاصل کرنے کا مسئلہ سیدھا سادہ تھا یعنی طاقت کے ذریعے یا شکار کر کے غذا حاصل کرنا تھا۔

☆ مناسب طریقہ یہ ہے کہ ذرائع پیداوار چند ہاتھوں میں نہ رہیں بلکہ پوری قوم کے اختیار میں آ جائیں تا کہ منافع صرف ایک طبقے کو نہ ملے بلکہ جہاں تک ممکن ہو سکے قوم کے سب افراد میں تقسیم ہو اور اس طرح معاشی مساوات قائم ہو۔

☆ امریکہ نے ایران پر حملہ کیا تو جنگ کا دائرہ کار ایران تک ہی محدود نہیں رہے گا بلکہ اس کا اثر یورپ اور برطانیہ تک بھی آ سکتا ہے جس سے یہاں مقیم باشندوں کو بھی غذائی قلت کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ اس کے بعد کئی لوگ نے گھروں میں کھانے پینے کا سامان جمع کرنا بھی شروع کر دیا ہے۔

بقائے نسلِ انسانی اور ضروریات زندگی

دنیا میں معاشی بنیادوں پر انقلاب کی بنیاد رکھنے والے عظیم فلاسفر کارل مارکس بڑے سادے انداز میں یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ انسان کی بنیادی ضروریات کیا ہیں؟ ایک ضرورت یہ ہے کہ وہ خود زندہ رہے، دوسری ضرورت یہ ہے کہ اس کی نسل زندہ رہے۔ پھر اس کے علاوہ دوسری روحانی، جذباتی اور تہذیبی ضروریات بھی ہیں اور سب ہی بہت اہمیت کی حامل ہیں، لیکن سب سے زیادہ بنیادی ضرورت تو یہی ہے کہ وہ خود زندہ رہے اگر وہ خود زندہ نہیں رہے گا تو نسل کے زندہ رہنے، روحانی عرفان اور تہذیبی ترقی وغیرہ کی نوبت کیسے آئے گی؟ زندہ رہنے کے لیے ظاہر ہے غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔ غذا حاصل کرنا جانور اور قدیم انسان کا مسئلہ بھی تھا اور جدید انسان اور قدیم جانور کا آج بھی ہے لیکن تاریخ کے ہزاروں سال میں اس مسئلے کی نوعیت بہت بدل گئی ہے۔ جانور اور قدیم انسان کے لیے غذا حاصل کرنے کا مسئلہ سیدھا سادہ تھا یعنی طاقت کے ذریعے یا شکار کر کے غذا حاصل کرنا تھا۔ آج بھی بہت حد تک کچھ ایسا ہی ہے لیکن طاقت کے استعمال اور "شکار" کے طریقے بدل گئے ہیں بلکہ بہت پیچیدہ ہو گئے ہیں۔ غذا کی تلاش، اس کا حصول اور اس کا استعمال اب ایک وسیع نظام بن گیا ہے جسے "معاشی نظام" کہتے ہیں۔ ہزاروں سال پہلے بھی انسان کی زندگی زیادہ تر غذا کے حصول ہی سے متاثر ہوتی تھی۔ آج بھی صورت حال بنیادی طور پر یہی ہے۔ آج بھی انسان زندگی کے بیشتر عوامل پر معاشی نظام ہی اثر انداز ہوتا ہے۔ لیکن اس دور میں انسان کا معاشی نظام بہت پیچیدہ ہے۔ غذا اب صرف کھانے پینے والی اشیاء تک ہی محدود نہیں رہی۔ بلکہ انسان کی بیشتر مادی ضروریات بہت حد تک اس کی "غذا" کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ سارا مسئلہ مادی ضروریات کو پیدا کرنے کا ہے۔ پیداوار کیونکر

بڑھائی جائے؟ پیداوار کون لوگ بڑھاتے ہیں؟ جو لوگ غذا پیدا کرتے ہیں انہیں اپنی غذا میں سے کتنا حصہ ملتا ہے؟ منافع میں کتنا حصہ ملتا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ دکھ سہیں بی فاختہ اور کوے انڈے کھائیں......! مناسب طریقہ یہ ہے کہ ذرائع پیداوار چند ہاتھوں میں نہ رہیں بلکہ پوری قوم کے اختیار میں آجائیں تاکہ منافع صرف ایک طبقے کو نہ ملے بلکہ جہاں تک ممکن ہو سکے قوم کے سب افراد میں تقسیم ہو اور اس طرح معاشی مساوات قائم ہو۔ مارکس کے نزدیک انسانی معاشرہ اوپر تلے دو منزلوں پر قائم ہے۔ پہلی منزل، جو مارکس کے نزدیک معاشرے کی بنیاد ہے، معاشی منزل ہے یعنی انسان کی معاشی ضروریات کی منزل۔ اس منزل میں روٹی، کپڑا اور مکان وغیرہ شامل ہیں۔ دوسری منزل جو پہلی منزل پر تعمیر ہوتی ہے اسے قانونی یا سیاسی منزل کہا جا سکتا ہے۔ سیاسی اور سماجی قوانین ایک معاشرہ تعمیر کرتے ہیں اور ایک حکومت یا ریاست وجود میں آتی ہے۔ اس طرح دیگر سیاسی، سماجی، تہذیبی، مذہبی ادارے وجود میں آتے ہیں۔ مادی زندگی میں ذرائع پیداوار ہی عمومی طور پر ہمارے سماجی، سیاسی اور ذہنی صورت گری نہیں کرتے بلکہ زندگی انسانی شعور اور تصورات کا تعین کرتی ہے۔ مارکس کے اس نظریے کے لحاظ سے انسان کی بیشتر ذہنی اور جذباتی زندگی کی اصل محرک اس کی معاشی زندگی قرار دی جاتی ہے۔ دنیا میں ہر انسان اپنی معاشی حالت کو بہتر سے بہتر کرنے کی سعی میں لگا ہوا ہے۔ معاش کی اس جنگ میں فرد طبقوں اور گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ طاقتور کمزور کا استحصال کرنے کے لیے اپنے ساتھ مزید طاقتور شامل کرتا ہے۔ یوں معاشرہ طبقات میں تقسیم ہوتا جاتا ہے۔ یہ ایک محلے سے نکل کر شہر، ملک اور دنیا میں پھیل جاتا ہے۔ پھر طاقتور ملک کمزور ملکوں کے وسائل پر ناجائز قبضہ کر کے اپنی معاشی حالت مزید بہتر کرتے جاتے ہیں اس کام میں وہ اکیلے نہیں ہوتے بلکہ اپنے جیسے کئی ممالک کو بھی حصہ دار بنا لیتے ہیں۔ بین الاقوامی قوانین اور اصول بھی ایسے بنائے جاتے ہیں جس سے کمزور کا ہی استحصال ممکن ہو۔ حال ہی میں UN کی ایک رپورٹ شائع ہوئی جس کے مطابق دنیا میں موجودہ معاشی بحران آئندہ بیس برس میں اتنا بڑھ جائے

گا کہ اس سے غذائی قلت خطرناک حد سے تجاوز کر جائے گی۔ رپورٹ کے مطابق 2030ء تک غذا کی قیمت میں 50فیصد اضافہ ہو جائے گا اور اس کی پیداوار میں 50فیصد کمی واقع ہو جائے گی۔ آبادی کے بڑھتے ہوئے تناسب کو دیکھ کر 2030ء تک غذائی قلت اتنی شدید ہو جائے گی جس سے دنیا فاقوں کی زد میں آنے کا امکان ہے۔ ایسی ہی ایک پیشگوئی مغربی ممالک میں مقیم ایک مذہبی پیشوا نے بھی کی ہے کہ اگر امریکہ نے ایران پر حملہ کیا تو جنگ کا دائرہ کار ایران تک ہی محدود نہیں رہے گا بلکہ اس کا اثر یورپ اور برطانیہ تک بھی آ سکتا ہے جس سے یہاں مقیم باشندوں کو بھی غذائی قلت کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ اس کے بعد کئی لوگ نے گھروں میں کھانے پینے کا سامان جمع کرنا بھی شروع کر دیا ہے۔ دنیا کا جائزہ لیا جائے تو ہمارا خطہ بہت زرخیز ہے اور قدرتی وسائل سے مالا مال بھی ہے۔ امریکہ اور اس کے حواری "آج" تک ہی محدود نہیں رہتے بلکہ وہ آئندہ پچاس سال کا پلان بھی سوچ کر رکھتے ہیں۔ تو بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ آئندہ بیس برس میں پیدا ہونے والا غذائی قلت کے بحران سے نمٹنے کے لیے وہ کوئی لائحہ عمل تیار کر کے نہ بیٹھیں ہوں۔ اگر گزشتہ چند برس سے آج تک ان کے اعمال دیکھ لیں تو ان کے عزائم کا پتہ چل سکتا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لیے کسی حد تک بھی جا سکتے ہیں۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے یہ خود تو "جمع" یعنی متحد والے فارمولے پر عمل پیرا ہوتے ہیں جبکہ ہمیں "تقسیم" یعنی نفاق میں ڈال دو۔ پہلے تقسیم ہند...... پھر پاکستان تقسیم ہو گیا، اب باقی ماندہ ملک کو بھی "تقسیم در تقسیم" کے فارمولے سے حل کیا جا رہا ہے۔ اس جمع اور تقسیم کے حساب میں غریب عوام ہمیشہ ہی کاری "ضرب" کا شکار ہوتے ہیں۔ امریکہ میں بلوچستان کے متعلق پیش ہونے والی حالیہ قرارداد بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ حیرانگی کی بات ہے کہ ہمارے ملک کے چند صحافی حضرات کے نزدیک اس قرارداد کو زیادہ سیریس لینے کی ضرورت نہیں کیونکہ ان کے نزدیک ایسی کئی قراردادیں وہاں پیش ہوتی رہتی ہیں بقول ان کے اگر قراردادوں سے کچھ ہونا ہوتا تو آج تک کشمیر آزاد ہو چکا ہوتا۔ جبکہ تاریخ یہ کہتی ہے کہ

ہر وہ قرارداد جس میں ان کا فائدہ ہو اس پر عمل درآمد کرتے یا کرواتے ان کو کسی سے اجازت لینے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ سب ٹھیک ہے فکر کی کوئی بات نہیں...... ایسا ہی سقوطِ ڈھاکہ سے ایک دن قبل تک بھی کہا جاتا رہا تھا۔ بلوچستان کی قرارداد امریکن پارلیمنٹ میں پیش آنے کی نوبت کیوں آئی ؟ بلوچستان کے ساتھ ایسا ناروسلوک کیوں برتا گیا؟ بلوچستان میں جلتی پر تیل ڈالنے سے امریکہ اور اس کے حواریوں کو کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟ ایران پر ہاتھ ڈالنے کے لیے بلوچستان کی زمین کیا کردار ادا کر سکتی ہے؟ کیا یہ قرارداد صرف بلوچستان تک ہی محدود رہے گی؟ کیا امریکہ اور اس کے حواری صرف ایران کو سبق پڑھا کر واپس چلے جائیں گے؟ کیا امریکہ اور اس کے حواریوں کو پاکستان کے ایٹمی اثاثے اور ایران کے جوہری پروگرام ہی آنکھ کا کھٹکا ہیں یا تیزی سے توانا ہوتا ہوا چین بھی اس کا چین حرام کر رہا ہے؟ کیا غذا کی ممکنہ قلت کو پورا کرنے کے لیے ہمارے خطے سے بہتر کوئی اور خطہ بھی ہے؟؟

مشہور فلسفی ابن خلدون کی رائے میں قوموں کا زوال اس وقت شروع ہوتا ہے جب برسرِ اقتدار گروہ ملک کی پیداوار کے تمام وسائل پر قبضہ کر لیتا ہے اور دیگر تمام طاقتوں مثلاً فوج کو بھی اپنا ہم خیال بنا لیتا ہے۔ جب حاکم گروہ کو پیداوار اور دولت کے حقیقی وسائل سے استفادہ کرنے کا موقع نہیں ملتا تو وہ دولت اور سرمایہ حاصل کرنے کے لیے مختلف طریقے استعمال کرتا ہے۔ مثلاً حاکم گروہ بیرونِ ملک طاقتوں سے امداد حاصل کرتا ہے چونکہ حاکم گروہ کو اپنے سامانِ تعیش کے لیے زیادہ رقم کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے وہ یہ رقم زیادہ سے زیادہ ٹیکس لگا کر عوام سے وصول کرتا ہے۔ آخر کار نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملک میں معیشت کمزور ہوتی چلی جاتی ہے۔ ایسی صورت میں ملک کا نظام و نسق حقیقی معنوں میں حاکم گروہ کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ اہلِ دولت اور خواص مملکت سازش کر کے کسی کمزور اور بے وقوف شخص کو گدی پر بٹھا دیتے ہیں اور کوئی طاقتور قوم اس پر حملہ کر کے قوم سمیت ان کے تمام وسائل پر بھی قبضہ کر لیتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان اور جانور زمانہ جاہلیت میں جیسے شکار کر کے اپنی غذا کا حصول ممکن بناتا تھا آج کے ترقی یافتہ

دور میں بھی انسان کا فعل وہی ہے بس ذرا انداز اور شکار بدل گئے ہیں۔ جانور کی بھوک تو کچھ کھا کر ختم ہو جاتی ہے مگر انسان کی ہوس کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے شاید کائنات کا سارا پانی بھی کم پڑ جائے۔ ہماری عوام کو اب بیدار ہو جانا چاہیے ورنہ ......کبوتر آنکھیں بند بھی رکھے تو بلی نے کب معاف کرنا ہوتا ہے۔

روزنامہ "دن" 29 فروری 2012ء

روزنامہ نیشن لندن 2 مارچ 2012ء

قابل غور

☆ ان سے جیسا مرضی سلوک کرتے جاؤ مگر مجال ہے کہ ان کے صبر کا پیمانہ چھلک جائے۔ یہ اندھے، بہرے، گونگے اور سائیں ملنگ جیسی خصوصیت شاید دنیا کی کسی قوم میں نہ ہوں۔ اس سے بہتر تھا کہ ساری قوم ہی پٹھان ہوتی۔

☆ جذباتی قومیں ان فنون کی طرف زیادہ مائل ہوتی ہیں جن کا تعلق جذبات سے ہوتا ہے۔ یعنی موسیقی، شاعری، مصوری، فن تعمیر وغیرہ اور ان علوم سے اجتناب کرتی ہیں جن کا تعلق عقل سے ہو یعنی فلسفہ، ریاضی، سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، ریسرچ وغیرہ۔

☆ جو حقیقتیں ان کو پسند نہیں ہوتیں ان کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ متبادل امکانات کا تجزیہ صحیح طور پر نہیں کیا جاتا۔ فیصلے کی موافقت اور مخالفت میں دلائل کا معروضی طور پر جائزہ نہیں کیا جاتا۔ نہ اپنی طاقت کا صحیح اندازہ لگایا جاتا ہے اور نہ ہی دشمن کی۔

☆ فکر کا مقابلہ صرف فکر سے ہی کیا جا سکتا ہے اگر فکر ناقص ہے تو خود اپنی نفی کر لے گی۔ اگر انداز فکر غلط ہے تو وہ اپنی طاقت کھو دے گا اور ایک دوسرا انداز فکر پیدا ہو جائے گا۔ قوم کا مزاج چند دنوں میں نہیں بدلا جا سکتا اس میں کئی نسلیں یا بعض اوقات کئی صدیاں صرف ہو جاتی ہیں لیکن کسی قوم کے مزاج کو انقلاب کے بغیر یکسر تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔

قوم کا مزاج

ویسے تو میں اس بات پر بالکل کلیئر ہوں کے پٹھانوں اور سکھوں کے خلاف لطیفے بنانے کا باقاعدہ سیل انگریزوں نے بنایا جس کا بنیادی مقصد دو جنگجو قوموں کو مسخرہ یا کم عقل بنا کر دوسرے لوگوں کے سامنے پیش کرنا تھا لیکن غلط العام اور غلط العوام نے اس کو روایت سمجھ لیا ہے اور انگریزوں کے جانے کے بعد بھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ فورٹ ولیم کالج میں تشکیل دیا جانے والا بھانڈوں پر مشتمل سیل آج بھی کہیں نہ کہیں کام کر رہا ہے۔لطیفہ سننا اور سنانا عام سی بات ہے ۔وزیر آباد کے ایک نیم سید کالم نویس کی توجہ شہرت اور ناموری ہی لطائف ہیں جن سے وہ قارئین کو مسرور اور اپنے سیاسی قائدین کو مسحور رکھتا ہے ۔میں اپنے اس کالم میں مجبوراً یہ لطیفہ شامل کر رہا ہوں اور اس کا مقصد صرف اپنی بات کی تفہیم کروانا ہے نا کہ کسی قوم یا گروہ کی تذلیل کرنا ۔دوستوں کی محفل میں بیٹھے کسی ایک دوست نے لطیفہ سنایا کہ تقسیم ہند کے بعد گاندھی جی کی قائداعظم سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا"جناح ہم سے کبھی پنگا نہیں لینا کیونکہ ہمارے پاس ایسی قوم ہے جو سب کچھ کرنے کے بعد سوچتی ہے کہ اس نے کیا کیا ہے"۔قائداعظم نے مسکرا کر جواب دیا کہ"مجھے فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں میرے پاس بھی ایسی قوم ہے جو سب کچھ کرنے کے بعد بھی نہیں سوچتی کہ اس نے کیا کیا ہے"۔گاندھی جی کا اشارہ سکھوں کی طرف تھا اور قائد کا غالباً پٹھانوں کی جانب۔اگر وطن عزیز کی موجودہ حالت دیکھی جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری عوام میں ایسی خوبی بھی ہے جو"سکھ یا پٹھان" دونوں قوموں میں نہیں پائی جاتی ۔ہم میں یہ خاص بات ہے جو شاید کسی قوم میں نہیں کہ ہمارے ساتھ جتنا مرضی غیر انسانی رویہ رکھا جائے، جتنی مرضی زیادتیاں کیں جائیں، بنیادی حقوق کے حصول کیلئے ذلیل وخوار کیا جائے، انصاف کے نام سے کھلواڑ

202

کیا جائے، مذہب کے نام پر نفاق ڈالا جائے، آمر جمہوریت کا ڈھول بجائے، جمہوری حکومتیں آمرانہ ڈھال ڈالتی رہے، غریب اور بے قصور لوگوں کو دہشت گردی کی بھینٹ چڑھایا جائے، اشرافیہ، سرمایہ دار اور جرنیل خود بلٹ پروف گاڑیوں اور ہائی الرٹ سکیورٹی میں زندگی بسر کریں، غریب اور امیر کے بچوں میں نصاب اور نظام تعلیم کا واضح فرق رکھا جائے، مہنگائی بے روزگاری، لوڈشیڈنگ، طبی سہولتوں کا فقدان ملک میں سیلابی ریلے کی طرح غریب کا ستیاناس کرتا رہے، دہشتگی کے خاتمے کی صرف ڈینگیں ماری جائیں، ریلوے، پی آئی اے، اسٹیل ملز، او جی ڈی سی سمیت تمام بڑے ادارے تباہ کر دیے جائیں، زرعی ملک ہونے کے باوجود آٹا، چینی، چاول کی قلت ہو جائے، آدھا ملک گنوا اور باقی ماندہ کے ٹکڑے کرنے کی بین الاقوامی سازشیں ہوتی رہیں، جس میں ہمارے اپنے نالائق اور بددیانت آقا بھی اپنی وفاداری کا ثبوت دیتے نظر آئیں ------ مگر پھر بھی ہماری قوم ٹس سے مس نہیں ہوتی ------ یہ نہیں بولتی، یہ دیکھ کر بھی نہیں دیکھتی، یہ سن کر بھی نہیں سنتی، یہ سب کچھ جان کر بھی نہیں سمجھتی، ان سے جیسا مرضی سلوک کرتے جاؤ مگر مجال ہے کہ ان کے صبر کا پیالہ چھلک جائے۔یہ اندھے، بہرے، گونگے اور سائیں ملنگ جیسی خصوصیت شاید دنیا کی کسی قوم میں نہ ہوں۔اس سے بہتر تھا کہ ساری قوم ہی پٹھان ہوتی ------ جو کچھ بھی ہونے پر یا کچھ بھی کر کے بے شک نہ سوچتی کہ اس نے کیا کیا ہے۔بیکار سے بیگار بھلی ------ یعنی کچھ نہ کرنے سے کچھ کرنا بہتر ہوتا ہے۔حالیہ ضمنی انتخابات میں اگر وحیدہ شاہ نے پریزائڈنگ آفیسر پر کیمرے کی آنکھ کے سامنے تشدد کیا ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔اس سے زیادہ ظلم سہنے کی شکتی ہے اس قوم میں ------ یہ تو جوتے کھا کر بھی یہی کہیں گے قدم بڑھاؤ ---- ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ہر قوم کا ایک مزاج ہوتا ہے ہماری قوم کا کیا مزاج ہے ؟؟؟ ہم اگر روزمرہ کی زندگی میں دیکھیں تو بعض افراد ایک خاص مزاج کے مالک ہوتے ہیں۔بعض لوگ نہایت سخت گیر ہوتے ہیں، بعض خود پرست، بعض مغرور اور کچھ حلیم الطبع، کوئی پرسکون اور کوئی ملنسار، اور کوئی منکسر مزاج ہوتا ہے۔اسی طرح قوموں کا بھی ایک مزاج ہوتا

ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ قوموں کا ایک مزاج بن جاتا ہے۔قوم کے مزاج کے متعدد پہلو ہو سکتے ہیں۔جن میں دو قابل ذکر ہوتے ہیں۔بعض قومیں مزاج کے اعتبار سے جذباتی اور بعض کا رویہ عقلی ہوتا ہے۔جذباتی قومیں وہ ہوتی ہیں جن کے بیشتر افراد اہم فیصلوں میں عقل سے زیادہ جذبات کو استعمال کرتے ہیں۔عقلی قومیں وہ ہوتی ہیں جن کے افراد جذبات سے زیادہ عقل کو استعمال کرتے ہیں۔قوموں کا مزاج چند دنوں میں نہیں بنتا بلکہ اس میں صدیاں تک لگ جاتی ہیں۔جذباتی قوم کی پہچان زیادہ مشکل نہیں ہے اس کی کچھ علامات ہیں۔مثلاً جذباتی قومیں ان فنون کی طرف زیادہ مائل ہوتی ہیں جن کا تعلق جذبات سے ہوتا ہے۔یعنی موسیقی، شاعری، مصوری، فن تعمیر وغیرہ اور ان علوم سے اجتناب کرتی ہیں جن کا تعلق عقل سے ہو یعنی فلسفہ، ریاضی، سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، ریسرچ وغیرہ۔یہ قومیں حال کی تلخ حقیقتوں کو بھولنا چاہتی ہیں اور اس کوشش میں یا تو ماضی کی طرف مائل ہو جاتی ہیں یا مستقبل کی طرف یا تو اپنے درخشندہ ماضی کی حکایات و روایات کا ذکر کرنے پر اکتفا کرتی ہیں اور خوش رہتی ہیں یا پھر کسی آنے والے دور کی امید لگائے بیٹھی رہتی ہیں کہ سب خود بخود ٹھیک ہو جائے گا اور گزرا ہوا سنہری زمانہ پھر لوٹ کر آئے گا قوم کا ہر فرد ایک قسم کی رومانیت کا شکار ہو جاتا ہے۔آہستہ آہستہ یہی رومانیت اور جذباتیت قوم کا مزاج بن جاتی ہے۔ذہنی اور فکری حالت پست ہو جاتی ہے اور قوم معاشی مسائل کا شکار ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ایک عام بے چینی، الجھن اور عدم تحفظ کا شدید احساس ہوتا ہے لیکن اس کا مداوا سمجھ میں نہیں آتا۔اگر سمجھ میں آجاتا ہے تو ایسے علاج سوچے جاتے ہیں جو موجودہ حالات کے لیے ناقابل عمل ہوتے ہیں۔قوم کبھی ایک سراب کی طرف بھاگتی ہے کبھی دوسرے کی طرف اور جب کبھی پیاس نہیں بجھتی تو جھنجلا جاتی ہے۔قوم کا مزاج جب جذباتی ہو جاتا ہے تو اس کے نتائج خطرناک اور دور رس ہوتے ہیں۔سب سے خطرناک یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قوم کی فیصلے کی صلاحیت متاثر ہو جاتی ہے۔فیصلوں میں عقل کم اور جذبات سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔اکثر صورتوں میں یہ ہوتا ہے کہ فیصلہ پہلے کر لیا جاتا ہے، معلومات اور ان کا تجزیہ

بعد میں کیا جاتا ہے۔یعنی فیصلہ تو کسی جذبے کے تحت کر لیا جاتا ہے اور پھر شعوری اور غیر شعوری طور پر وہی معلومات جمع کی جاتی ہیں جو اس فیصلے کی تائید میں ہوں۔جو حقیقتیں ان کو پسند نہیں ہوتیں ان کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔متبادل امکانات کا تجزیہ صحیح طور پر نہیں کیا جاتا۔فیصلے کی موافقت اور مخالفت میں دلائل کا معروضی طور پر جائزہ نہیں لیا جاتا۔نہ اپنی طاقت کا صحیح اندازہ لگایا جاتا ہے اور نہ ہی دشمن کی۔یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ان کے فوری نتائج کا ردعمل کیا ہوگا اسکے بعد عمل اور ردعمل کا سلسلہ دور تک جاتا ہے۔فیصلہ کرنے والے تو زندہ یا برسر اقتدار نہیں رہتے مگر اس کا خمیازہ آنے والوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔صحیح فیصلے کرنے کی صلاحیت بھی مناسب تعلیم و تربیت کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتی۔کیونکہ تعلیم و تربیت کے ذریعے صحیح معلومات فراہم کیے جا سکتے ہیں اور ان کا تجزیہ کر کے نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔اس لیے تعلیمی نظام اور نصاب موجودہ دور کے ساتھ ہم آہنگ ہونا بہت ضروری ہے۔پیغمبر اسلام نے بھی علم حاصل کرنے کے لیے تمام ذرائع استعمال کرنے کی ہدایت فرمائی ہے، چاہے اس کے لیے چین کا سفر کیوں نہ کرنا پڑے۔تعلیم کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں لیکن یہ ضروری ہے کہ تعلیم ماضی کے ساتھ حال کا بھی احاطہ کرے۔زمانہ حال کے مختلف ملکوں اور قوموں کے نظریات سے متفق ہونا ضروری نہیں مگر ان سے آگاہی ہونا ضروری ہے ورنہ تعلیم ناقص رہ جائے گی۔اسلام نے تو تعلیم کے معاملے میں نہایت وسیع نظر رکھنے کی ہدایت فرمائی ہے۔بہتر تعلیمی نظام انسان میں فکری آزادی پیدا کرتا ہے جو قوموں کو بڑے فیصلے کرنے میں مدد دیتی ہے۔اس کا مزاج عقلی کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔فکر کا مقابلہ صرف فکر سے ہی کیا جا سکتا ہے اگر فکر ناقص ہے تو خود اپنی نفی کر لے گی۔اگر انداز فکر غلط ہے تو وہ اپنی طاقت کھو دے گا اور ایک دوسرا انداز فکر پیدا ہو جائے گا۔قوم کا مزاج چند دنوں میں نہیں بدلا جا سکتا اس میں کئی نسلیں یا بعض اوقات کئی صدیاں صرف ہو جاتی ہیں لیکن کسی قوم کے مزاج کو انقلاب کے بغیر یکسر تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔انقلاب کے لیے کم از کم ایک عدد رہنما کی ضرورت ہوتی ہے جو عوام کو قوم بنا کر ان کے شعور کو بیدار کرے ان کو جذباتیت

سے نکال کر عقلیت کی طرف لے جائے۔ ہماری عوام اس وقت انہیں مسائل کا شکار ہے۔ ہماری جذباتی قوم کا ٹیلنٹ ایس ایم ایس کرنے میں صرف ہورہا ہے۔ قیام پاکستان سے لے کر آج تک ہم کو ایسے رہنما ملے جنھوں نے ایسا ماحول دیا کہ لوگوں کا شعور بیدار نہ ہو۔اس وقت بے حسی کا یہ عالم ہے کہ ہمارے سامنے کوئی خودسوزی کررہا ہو تو ہم اس کی ویڈیو بنا کر بریکنگ نیوز بنانے کی دوڑ میں اول آنے کے چکر میں یہ بھول جاتے ہیں کہ انسانی جان کی کیا اہمیت ہے؟ بھرے ہجوم کے سامنے نہتے اور معصوم بچوں کو چوڑا ہے پر تشدد اور بربریت کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور اس کے بعد ان کی لاشوں کی ایسی حرمتی کی جاتی کہ مسلمانیت کیا اس پر تو انسانیت بھی شرمندہ ہو جاتی ہے۔اس مکروہ عمل کے پیچھے بھی ہماری ''جذباتیت'' کارفرما ہے جو تحقیق کے بغیر ہی اپنا فیصلہ کردیتی ہے۔ ہماری اسی جذباتیت کا فائدہ ہمارے لیڈر، ملاں، جرنیل، جاگیردار اور سرمایہ دار طبقہ اٹھا رہے ہیں۔ جب تک ہم جذباتیت کے کنویں سے نکل کر عقل کے سمندر میں غوطہ زنی کے لیے چھلانگ نہیں لگائیں گے ہم غلامی کی زنجیروں میں ایسے ہی جکڑے رہیں گے اور نتیجہ یہی برآمد ہوگا کہ نہ کرنے سے پہلے سوچیں گے اور نہ کرکے سوچنے کی ''حماقت''۔

روزنامہ ''دن'' لاہور 3مارچ 2012ء

نیشن لنڈن 9 مارچ 2012ء